بسم الله الرحمن الرحيم

عنوانات صفحہ

درس نمبر (۳)

درس نمبر (۵) ۹۶

درس نمبر (۶) ۱۱۸

تقریظ

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم

سابق رئیس فلاحِ دارین، ترکیسر، سورت، گجرات

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کیلئے بہت سے پیغمبر اور رسولوں کو مبعوث فرمایا اور ان پر کتابیں اور صحیفے نازل فرمائیں، مگر نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو جب خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا تو ان پر خاتم الکتب یعنی قرآنِ مجید نازل فرمایا اور قیامت تک اس کی حفاظت وصیانت کا بھی اعلان فرمایا، چنانچہ ارشاد فرمایا ’’انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون‘‘

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے علماء پیدا فرمائیں جنہوں نے اس کے الفاظ کو یاد کیا، اس کے معنی اور مطالب کو سمجھا، اس کے طریقۂ ادا کو محفوظ کیا، حفاظ، قراء اور مفسرین نے ہر ہر پہلو سے اس کتابِ مبین کی حفاظت کا حق ادا کر دیا، اور قرنِ اول سے لیکر ہمارے زمانہ تک برابر یہ سلسلہ جاری ہے۔

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جس کے علوم ومعارف پر سینکڑوں تفسیریں لکھی گئیں، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے علمی جواہر پاروں کو پھیلایا گیا، مگر اب بھی ہر دور میں علماء اس کے پوشیدہ خزانوں کو نکالنے میں مصروف ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے حضرت مولانا سید ابرار صاحب دھلیوی رحمہ اللہ کی سورۂ یوسف کی تفسیر موجود ہے، مولانا رحمہ اللہ نے ۱۹۸۹ء کلپٹن۔لندن میں رمضان المبارک گذارا تھا اور ان مبارک ایام میں سورۂ یوسف کی تفسیر اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمائی تھی جس کو سی،ڈی، سے حضرت مولانا عبد السلام صاحب نے نقل کر کے مرتب فرمایا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کو بلند پایہ علمی ذوق عطا فرمایا تھا، علمِ تفسیر اور علمِ حدیث سے خصوصی لگاؤ تھا، جامعہ ڈابھیل اور دار العلوم فلاحِ دارین ترکیسر میں ہمیشہ تفسیر وحدیث کی کتابیں زیرِ درس رہی تھیں، اور مولانا کا طرزِ بیان اور طریقۂ تفہیم بھی ممتاز تھا، علمی نکات، دلچسپ واقعات، اور سہل وسلیس اردو زبان میں مولانا جب بیان فرماتے تھے تو طلبہ اور عوام دونوں بہت متاثر اور محظوظ ہوتے تھے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ان علمی آثار کو محفوظ کرنے کی ضرورت تھی، مولانا کی تقاریر اور مواعظ تو الحمد للہ "فیضِ ابرار" کے نام سے چھپ کر مقبولِ عام وخاص ہوگئے ہیں، اور مولانا کے بعض تلامذہ مولانا کے جلالین شریف کے درس کو بھی مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے عزائم کی جلد تکمیل فرمائیں، آمین۔

بہر حال، یہ سورۂ یوسف کی تفسیر بھی بہت قیمتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اہلِ علم اس سے استفادہ کریں گے۔

اللہ رب العزت مولانا رحمہ اللہ اور مرتب وناشر کو بہترین بدلہ عطا فرماویں اور آخرت میں ان کے درجات کی بلندی کا سبب بنائیں، آمین۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

والسلام

احقر، (حضرت مولانا) عبد اللہ کاپودروی، (دامت برکاتہم)

نزیل لندن ۱۹/مئی ۲۰۰۹ء

تقریظ

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب لاجپوری دامت برکاتہم

خلیفہ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب نوراللہ مرقدہ

اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو اپنے دین کی خدمت کیلئے منتخب فرماتے ہیں اور وہ بندے دین کی ایسی خدمت کرتے ہیں کہ عقل حیران ہوجاتی ہے، انہیں بندوں میں ہمارے استاذِ مکرم، عارف باللہ، حضرت اقدس مولانا سید ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ ہیں۔

حضرت والا کی درس وتدریس، وعظ وارشاد، تصوف وسلوک، اور دعوت وتبلیغ غرض ہر میدان میں خدمات موجود ہیں، درس وتدریس کا یہ حال تھا کہ کتاب کے مشکل مقامات کو ایسے آسان انداز میں پیش فرماتے کہ طلبۂ عزیز کو اطمینان ہوجاتا تھا، اور طلبہ میں سے کوئی درس کے متعلق سوال کرتا تھا تو ایسا جامع جواب عطا فرماتے کہ طالبِ علم کو اطمینان ہوجاتا تھا، ایک مرتبہ ''مشکوٰۃ شریف،، کے درس میں تقدیر کے متعلق یہ حدیث شریف آئی کہ'' مَنْ تَکَلَّمَ بِشَیْئٍ مِّنَ الْقَدْرِ سُئِلَ عَنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَمَنْ لَّمْ یَتَکَلَّمْ لَمْ یُسْئَلْ عَنْهُ او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام،، سبق کے بعد احقر نے اپنے رفیقِ درس مولانا عبدالاول صاحب (جو اس وقت مسجد الفاروق، والسال، کے امام وخطیب ہیں اور ہماری جماعت میں پہلے نمبر پر کامیاب ہونے والے بہت ذہین تھے) سے عرض کیا کہ قیامت میں تو ہر چیز کے بارے میں سوال ہوگا، پھر تقدیر کی کیا خصوصیت ہے؟ تو مولانا نے کہا کہ یہ سوال حضرت استاذ مکرم ہی سے پوچھ لیں گے، پھر ہم دونوں حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذکورہ بالا سوال عرض کیا، حضرت واالا نے برجستہ جواب

مرحمت فرمایا کہ یہاں ”سُئِل“ سے مراد ”اُخِذ“ ہے یعنی تقدیر کے بارے میں کوئی بحث ومباحثہ کرے گا تو اس سے اللہ تعالیٰ قیامت میں مواخذہ (پکڑ) فرمائیں گے (اللھم احفظنامنه. آمین)

حضرت استاذ مکرم کو فنِّ تفسیر سے خصوصی مناسبت تھی متقدمین کی تفاسیر پر گہری نظر تھی امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کی تفسیرِ کبیر کے تو گویا آپ حافظ تھے، حضرت استاذ مکرم نے برطانیہ کے سفر میں ”کلیپٹن“ کی مدینہ مسجد میں جو لندن شہر میں واقع ہے سورۂ یوسف کی تفسیر بیان فرمائی تھی، ضرورت تھی کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے، یہ سعادت حضرت مولانا عبدالسلام صاحب لاجپوری امام ”مسجدِ قبا“ لندن کے حصہ میں آئی مولانا نے بڑی محنت سے سی، ڈی، سے کاغذ پر منتقل فرمائی اور اب اس تفسیرِ سورۂ یوسف پر حضرت استاذ مکرم مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی مدظلہ کی جامع تقریظ موجود ہے، پھر دوسری تقریظ کی ضرورت نہیں تھی لیکن حضرت مولانا عبدالسلام صاحب لاجپوری کے فرمانے پر کچھ مختصر لکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ حضرت استاذ مکرم مولانا سید ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ کے جلالین شریف کے درس کو جس کا حضرت مولانا عبداللہ صاحب مدظلہ نے تقریظ میں تذکرہ فرمایا ہے جلد ترتیب اور اشاعت کا انتظام فرمائیں، آمین۔ حضرت والا کے درجات کو بلند فرمائیں، آمین۔ بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

والسلام

احقر (حضرت مولانا) عبدالرؤف لاجپوری

(حال مقیم، باٹلی، یو، کے)

۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

پیش لفظ

الحمد للہ رب العلمین ، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سیدنا محمد،خاتم النبیین وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین.

امابعد! وقال النبی ﷺ خیرکم من تعلم القرآن و علمه (بخاری شریف) **او کمال علیه الصلوٰۃ والسلام**

محترم قارئین! قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، اورعلم وحکمت کا بے پایاں خزانہ ہے، علماء نے لکھا ہے کہ نوعِ انسانی جس حد تک اس کے قریب ہوگی اسی قدراس کے لئے سعادت وفلاح کے دروازے کھلیں گے، اورقرآنِ کریم یہ واحد کتاب ہے جس کا پڑھنا، پڑھانا، سننا، سنانا، دیکھنا، سمجھنا، سمجھانا عبادت ہے، اور چونکہ قرآنِ کریم کو سمجھنا اور سمجھانا اوراس کی تعلیمات کے مطابق فکروعمل کی اصلاح کرنا ایک مسلمان کیلئے از حد ضروری ہے، اسی لئے علماءِ کرام، سلفِ صالحین کے طریقہ پرعمل کرتے ہوئے قرآنِ کریم کی تشریح وتفسیر عوام الناس کے سامنے کرتے رہے ہیں، اوراس سلسلہ کی بعض تفسیری تقریریں چھپ بھی چکی ہیں، یہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

الغرض! یہ جو تفسیری دروس پیش کئے جارہے ہیں، یہ حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث فلاحِ دارین، ترکیسر، وخلیفۂ اجل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ وداماد فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کے ہیں، حضرت مولانا نے رمضان المبارک

۱۹۸۹ء میں مدینہ مسجد، کلپٹن، لندن، میں قیام فرمایا تھا، اور ''سورۂ یوسف کی تفسیر'' بیان فرمائی تھی، چونکہ حضرت مولانا رحمہ اللہ کو دیگر دینی علوم کی بہ نسبت علمِ حدیث اور علمِ تفسیر کے ساتھ خصوصی شغف تھا، لہٰذا تفسیر'' سورۂ یوسف،، کے ذیل میں بہت سی گرانقدر اور قیمتی علمی معلومات ذکر فرمائیں۔

جب میں نے اس کو ایم، پی، تھری (سی، ڈی) کے ذریعہ سنا تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان قیمتی علمی معلومات کو (سی، ڈی) سے قلمبند کر کے اسے منظرِ عام پر لانا چاہئے تا کہ اس کا فائدہ عام ہو جائے، چنانچہ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار میرے دو ہم وطن بزرگ حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب و حضرت مولانا مرغوب احمد صاحب مدظلھما العالی سے کیا، تو ان دونوں حضرات نے میری اس حقیر سی رائے کو بے حد پسند فرماتے ہوئے حوصلہ افزائی فرمائی، اور اس سلسلہ میں ہر طرح کے تعاون کا اظہار اور اس پر کام کرنے کا حکم فرمایا، لہٰذا اس طرح میں نے رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ میں کام شروع کیا، الحمد للہ! آج مؤرخہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ کو یہ کام پورا ہوا، یہ کل چھبیس (۲۶) دروس ہیں، دراصل یہ کل انتیس (۲۹) دروس تھے لیکن مجھے ۲۶ دروس ہی دستیاب ہوئے لہٰذا وہ پیشِ خدمت ہیں، تین دروس باوجود کوشش کے دستیاب نہ ہو سکے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب کچھ باتیں حضرت مولانا رحمہ اللہ کے اندازِ بیان کے متعلق بھی عرض کر دی جائیں جو یقیناً اس کتاب کے مطالعہ کرتے وقت قارئین کیلئے معین و مفید ثابت ہوگی، حضرت مولانا رحمہ اللہ کا اندازِ بیان کیسا تھا؟ اس کے متعلق مولانا یونس صاحب سورتی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے (آخر میں) اپنے شیخِ ثانی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کا اندازِ بیان اختیار فرمایا تھا۔ (حیاتِ ابرار: ص ۴۷)

اب یہ کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا اندازِ بیان کیسا تھا؟ اس کے متعلق حضرت مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی رحمہ اللہ سابق مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”عام مقررین کی طرح گلا پھاڑنا اور ہاتھ پاؤں مارنا تو کجا معمولی حرکت بھی نہیں ہونے پاتی تھی، تقریر میں بے ساختہ روانی اور بے تکلیف تسلسل، اور انتہائی درجہ کی آمد گویا آبِ رواں کا سیلاب ہے جو اوپر سے نشیبی جگہ میں چلا آرہا ہے گویا سامنے کھلی کتاب ہے جس کو آپ پڑھ رہے ہیں، اور موقع بہ موقع سبق آموز حکایات و لطائف، حقائق و معارف، متکلمانہ استدلات اور عارفانہ نکات سے بھرا ہوا خزانہ ہوتا تھا، اور بات میں سے بات نکال لینے کا وہ خداداد سلیقہ آپ کو حاصل تھا کہ سامعین محوِ حیرت رہ جاتے تھے۔ (بیس علمائے حق: ص ۴۰۸، ۴۰۹)

حضرات! جو باتیں حضرت مولانا عبد الشکور ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے وعظ و خطابت کے انداز کے متعلق تحریر فرمائی ہیں تقریباً وہی سب چیزیں خطیب الامت حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ کے وعظ و خطابت میں پائی جاتی تھیں، جو حضرات خطیب الامت رحمہ اللہ کے وعظ و خطابت سے مستفید ہوئے ہیں وہ اس کی شہادت دیں گے۔

حضرت مولانا عبد الشکور ترمذی رحمہ اللہ نے حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے وعظ و خطابت کی منجملہ اور خوبیوں کے ایک خوبی یہ تحریر فرمائی کہ ”بات میں سے بات نکال لینے کا وہ خداداد سلیقہ آپ کو حاصل تھا کہ سامعین محوِ حیرت رہ جاتے تھے۔

خاص طور سے یہ ملکہ اور یہ خوبی خطیب الامت حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی رحمہ اللہ کو یوں کہنا چاہئے کہ اپنے شیخ سے گویا وراثت میں ملی تھی، اور اسکی شہادت ہر وہ آدمی دے گا جو حضرت مولانا کے وعظ کو پڑھے گا، یا یہی سورۂ یوسف کی جو تفسیر

''لطائفِ سورۂ یوسف'' کے نام سے موسوم ہے اس کا قاری بھی شہادت دے گا، اور علماء کرام نے لکھا ہے کہ یہی طریقہ اہلِ عرب کے ادب وانشاء میں بھی عام تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی رحمہ اللہ تفسیرِ ماجدی میں سورۂ بنی اسرائیل پارہ نمبر ۱۵ آیت نمبر ۱۰۶ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ''اہلِ عرب کے ادب وانشاء میں یہ طریقہ عام تھا کہ ایک ذکر میں دوسرا اور پھر تیسرا اور پھر چوتھا ذکر نکالتے چلے آتے اور پھر اسی پہلے ذکر کی طرف رجوع کرتے۔ (تفسیر ماجدی: جلد ۳ ص ۸۴)

اور یہی بات ماضی قریب کے ایک بزرگ حضرت مولانا مُناظر احسن صاحب گیلانی رحمہ اللہ کی تحریر میں بھی تھی، اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح بہت سا مواد ایک جگہ جمع ہوجاتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمہ اللہ کی تحریری صلاحیت کے متعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ ''میری علمی اور مطالعاتی زندگی'' نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''مولانا سید مُناظر احسن صاحب گیلانی رحمہ اللہ کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرزِ تحریر اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا، اور اپنے علم میں اضافہ ہوا۔ (ہزار سال پہلے ص ۴۹)

تو حضرت مولانا ابرار احمد صاحب رحمہ اللہ بھی ایک ذکر میں سے دوسرا اور پھر تیسرا اور پھر چوتھا ذکر نکالتے چلے جاتے اور اس طرح بہت سا مواد جمع ہوجاتا، حضرت رحمہ اللہ کا یہ طرزِ بیان آپ کو سورۂ یوسف کے دروس میں کئی جگہ نظر آئے گا۔

بہر حال! یہ سورۂ یوسف کے ۲۶/ دروس ہیں جس کو میں نے ''لطائفِ سورۂ یوسف'' کے نام سے موسوم کیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ربِّ کریم اس کو مسلمانوں کیلئے مفید بنائیں، اور حضرت ؒ نیز احقر کے لئے توشۂ آخرت بنائیں، اور ایک ضروری بات یہ ہے

کہ ایک کام اس میں میں نے یہ کیا ہے کہ جہاں جہاں حضرتؒ کی بیان کردہ بات کا حوالہ مل سکا اس کو ذکر کر دیا ہے۔

اخیر میں میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب کتھرادا (لاجپوری) کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس جلد کے چند دروس پر نظر ثانی فرمائی، اسی طرح میں حضرت مولانا محمد اسماعیل برہانپوری کا بے حد ممنون ہوں کہ جنہوں نے اس کے کمپوزنگ کا کام کیا، اسی طرح جناب سلیمان بھائی بنگلہ دیش والے، اور حاجی عثمان (چچا) میمن کا بھی بے حد ممنون ومشکور ہوں کہ جنہوں نے اس کی اشاعت کیلئے میری مالی مدد فرمائیں، اللہ تعالیٰ سب کی محنت اور تعاون کو قبول فرمائیں، اور دارین میں انہیں اس کا بہترین بدلہ نصیب فرمائیں، آمین۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ان دروس میں کوئی نقص نظر آئے تو اسے احقر کی جانب منسوب کرے کہ قلمبند کرنے میں مجھ سے کوتاہی ہوگئی ہو، میں ہر قسم کی امکانی غلطی پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں، اور قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر انہیں دورانِ مطالعہ کوئی بات قابلِ اصلاح نظر آئے تو احقر کو اس سے مطلع فرمائیں، اور بندے کو اپنی غائبانہ دعاؤں میں یاد رکھیں کہ یہ دعائیں قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محتاجِ دعا

عبد السلام ابراھیم مارویا لاجپوری غفرلہ (لندن)

خادم مسجدِ قبا، اسٹامفورڈ ہل، لندن

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ

درس نمبر (۱)

الحمد لله و کفی و سلام علی عباده الذین اصطفی، امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطان الرجیم، بسم الله الرحمن الرحیم .

الٓرٰ، تلک آیٰت الکتاب المبین،انا انزلنٰه قرانا عربیا لعلکم تعقلون (یوسف،آیت: ۱/۲) ☆ **صدق الله مولانا العظیم**

قرآنِ کریم تمام آسمانی کتابوں کا نچوڑ ہے

بزرگانِ محترم! یہ قرآنِ کریم کی سورۂ یوسف کی ابتدائی دو آیتیں تھیں جو آپ کے سامنے پڑھی گئی، بعض احباب کی یہ رغبت ہوئی اور خود مجھے بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ تفسیری عنوان پر ایک سلسلہ قائم ہو تو انشاء اللہ امید ہے کہ وہ طرفین کے لئے یعنی خود میرے حق میں بھی اور آپ کے لئے بھی امید ہے کہ نافع اور مفید ہوگا ،قرآنِ کریم حق تعالیٰ شانہ کی آخری کتاب ہے اور تمام آسمانی کتابوں میں جتنے علوم پھیلے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان تمام علوم کو اور ان تمام حکمتوں کو قرآنِ کریم میں بڑی حکمت کے ساتھ جمع فرما دیا ہے۔

قرآنِ کریم کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک آدمی نے کچھ کتابیں لکھی ہو اور اس کی کتابیں کائنات میں یا مخلوق میں پھیلی پڑی ہو، مگر لوگوں نے اس کی لکھی ہوئی تصنیفات میں، تالیفات میں، اور کتابوں میں اپنی جانب سے اس میں کچھ ملاوٹ کردی ہو، اپنی جانب سے کچھ آمیزش کردی ہو، اس کی مراد کو بگاڑنے کی کوشش کی ہو اسکے الفاظ کو تبدیل کرنے کی سعی کی ہو، ایسی صورت میں اگر وہ مصنف اور مؤلف اور کتاب کا لکھنے

والا صاحبِ کتاب ایک کتاب پریس کے سپرد کرے اور اس کے بعد یہ اعلان کردے کہ میری تمام کتابوں میں یہ کتاب آخری ہے، میری تمام تالیفات میں یہ آخری تالیف ہے، میری تمام تصنیفات میں یہ آخری تصنیف ہے، پچھلی تمام تالیفات تصنیفات اور رسائل و کتابوں میں جو مضامین ہیں، ان کے تمام مضامین وہی معتبر ہیں جو اس کتاب سے ملتے جلتے ہیں، یہ کتاب پچھلے مضمونوں کے موافق ہے اور پچھلے مضمون اس کے مطابق ہے تب تو وہ صحیح ہے، اور اگر پچھلی کتاب کا کوئی مضمون اسکے خلاف ہے تو وہ غیر معتبر ہے، ظاہر بات ہے کہ ایسی صورت میں اس مصنف کی کتابوں میں اور اس کے مضامین میں جن جن لوگوں نے جو ملاوٹیں کی ہوگی اور گڑبڑیاں کی ہوگی اس آخری تصنیف اور تالیف اور کتاب کے اس طریقے سے سامنے آجانے کے بعد اب کسی کو یہ گنجائش نہیں رہے گی کہ وہ حق کے باب میں اور صحیح مراد کے باب میں اور صحیح منشاء کے باب میں اور مصنف کے صحیح کلام کے سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ کرے (تدوین قرآن)۔

بالکل اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے پچھلے نبیوں کے ہاتھوں کچھ رسائل، کچھ صحائف وہ قوموں کو دیئے، قوموں کا مزاج علمی اعتبار سے کچھ بڑھتا رہا ترقی کرتا رہا تو انہیں زبور دی گئی حضرت داؤد علیہ السلام کے بابرکت ہاتھوں، انہیں تورات دی گئی حضرت موسی علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں، انہیں انجیل دی گئی حضرت عیسی علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں، اور جب اس سے بہت زیادہ ترقی کر کے آخری رتبہ حاصل کرلیا تو آخر میں سب سے جامع ترین، اکمل ترین، اور بہترین کتاب جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں امت کو اور قوم کو دی گئی، تو قرآنِ کریم تمام کتابوں کا خلاصہ ہیں، تمام کتابوں کا نچوڑ ہیں، ساری کتابوں کی جامع ترین یہی کتاب ہے۔

کلام متکلم کے شعور کا پتہ دیتا ہے

دوسری ایک بات اور بھی ہے کہ اگر آپ دنیا میں متکلمین کے کلام پر نظر ڈالے تو یہ خوب اچھے طریقہ سے سمجھ میں آتا ہیں کہ کلام متکلم کے شعور کا اور اس کی سمجھ کا پتہ دیتا ہے، ایک بچہ آپ سے کسی باب میں گفتگو کرے تو آپ سمجھتے ہیں کہ بچہ کی سمجھ ہی کیا ہے، اس کا نالیج اور اس کی معلومات ہی کیا ہے، اس اعتبار سے آپ اس کے کلام کی اہمیت کو سمجھیں گے کہ چھوٹی چھوٹی اور موٹی موٹی اس کی معلومات ہے لہٰذا کلام بھی ویسا ہی ہوگا اس کا۔ اگر ایک آدمی ایسا ہے کہ جس کا علم بچہ کے علم سے کچھ بڑھ کر ہے اور وہ اس سے زیادہ ترقی یافتہ ہے تو اس کے کلام میں اتنی ہی جان پیدا ہوگی، ایک ایسا شخص ہے جس نے تمام ڈگریاں حاصل کرلی ہو تمام کتابیں پڑھ لی ہوں ہزاروں سینکڑوں کتابیں دیکھی ہو اب وہ شخص گفتگو کرے گا اور کلام کرے گا تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اس کے کلام کی پشت پر یعنی اسکی بات کے پیچھے پروف ہیں، دلائل ہیں، اور قوّتیں ہیں، بصیرتیں ہیں، تو جتنی نظر ہوگی وسیع اور جتنی روشنی اسکے دل و دماغ میں ہوگی اور جتنی اس کی معلومات ہوگی جتنا اس کا علم ہوگا اسی اعتبار سے اس کے کلام میں جان ہوگی، اسی اعتبار سے اس کے کلام میں گہرائی ہوگی، اسی اعتبار سے اسکے کلام کی وسعت ہوگی، جب آپ اس حقیقت کو سمجھ گئے تو یہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ رب العلمین کے علم کی کوئی انتہاء نہیں ہے، حق تعالی کا علم کسی کنارہ پہ جاکر، کسی سرحد پہ پہنچ کر رک جاتا ہو ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے اور تمام صفاتِ کمال میں علم کا ایک خاص امتیاز ہے اور انسانوں کے جتنے کمالات ہیں وہ سب محدود ہیں۔

موصوف محدود ہے تو اس کی صفت بھی محدود ہوگی

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: جو موصوف ہے وہ خود محدود تو اس کی صفات بھی محدود ہوگی۔ جیسے مثال کے طور پر یہ قلم ہے آپ اس کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے وجود کا مطلب کیا ہے، یہ نیچے سے چل کر اوپر آ کر ختم ہوگیا اب آگے عدمِ قلم ہے، اوپر سے چلکر یہاں ختم ہوگیا گویا کہ یہاں تک قلم ہے پھر عدمِ قلم ہے یعنی قلم نہیں ہے، ادھر سے شروع ہوکر ادھر ختم، یہاں سے یہاں تک قلم ہے اور پھر آگے نہیں ہے، تو خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھ طرف سے نہیں ہے اور بیچ میں ہے، کہ یہاں پہنچکر نہیں، یہاں پہنچکر نہیں، یہاں پہنچکر نہیں، یہاں پہنچکر نہیں، یہاں پہنچکر نہیں، یہاں پہنچکر نہیں، یہ قلم کے وجود کا مطلب یہ ہے کہ یہ چھ طرف سے نہیں ہے اور بیچ میں ہے، اور اگر نہ سمجھ میں آتا ہو تو آپ میں سے کوئی کھڑا ہو جائے تو ہم بتائیں گے کہ وہ چھ طرف سے نہیں ہے اور بیچ میں ہے، اس لئے کہ وہ اپنے پیر کے تلوے سے شروع ہوکر سر کے تالو پہ ختم اور آگے جا کر اس کا وجود نہیں ہے، اور اگر سر کے تالو سے آپ دیکھیں تو پیر کے تلوے پر ختم، یہاں سے اس کی باڈی شروع ہوتی ہے یہاں آ کر ختم، یہاں سے شروع ہوکر یہاں آ کر ختم، ادھر سے شروع ہوکر پیچھے ختم، تو چھ طرف سے اس کا وجود نہیں ہے اور بیچ میں ہے، اور اگر کسی کو یہ بات تسلیم نہ ہو تو وہ ثابت کرے کہ میرا وجود آگے تک گیا ہوا ہے، (مجالسِ خطیب الامت، ص۱۷۳) ظاہر بات ہے کہ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے اور ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے کہ اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

جب یہ ایک حقیقت ہے تو آپ اندازہ لگایئے کہ ایک انسان جو علم سے موصوف ہے علم کی صفت سے متصف ہے، علم اس کے ساتھ لگا ہوا ہے تو موصوف کی

ذات جب محدود ہے تو اس کا علم بھی محدود ہوگا، کسی بڑے سے بڑے سائنسدان کو آپ لے ایک حدتک اس کا علم چلے گا آگے جا کر لاعلمی، بڑے سے بڑے عالم کو لے لیجئے ایک حدتک اس کا علم چلے گا آگے جا کر اس کا علم رک جائے گا، تو ہر شئ اس عالم کی محدودیت لئے ہوئے ہیں ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے اس سے آگے وہ متجاوز نہیں ہوسکتی، تو معلوم ہوا کہ انسان کا علم وہ بھی محدود ہے اس کا بھی ایک دائرہ ہے، اس کا بھی ایک میدان اور گراؤنڈ ہے، اس سے آگے وہ بڑھ نہیں سکتا اور اَوَر نہیں ہوسکتا اور متجاوز نہیں ہوسکتا کہیں جا کر وہ رکے گا، مگر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کا علم محدود ہوا ایسا نہیں ہے، اس کا علم لامحدود ہے اور کسی نکتہ پر، کسی دائرے پر، کسی باؤنڈری پر، اور کسی حد پر اور کسی سرحد پر جا کے رکنے والا نہیں ہے وہ لامحدود شان کا علم ہے، ہر اعتبار سے اسکے لئے کوئی نہایت نہیں، کوئی اسکی غایت نہیں، کہیں وہ منتہی اور ختم ہونے والا نہیں ہے۔ جب آپ یہ حقیقت سمجھ گئے کہ خالق کے علم میں اور مخلوق کے علم میں، مالک کے علم میں اور مملوک کے علم میں اتنا بڑا ڈیفرینس اور اتنا بڑا تفاوت اور اتنا بڑا فرق ہیں، تو اب کلام کے باب میں بھی یہ اندازہ لگانا چاہئے کہ مخلوق کے کلام میں اور خالق کے کلام میں بہت فرق ہے۔

کلام الملوک ملوک الکلام

عربی میں مثل مشہور ہے ''کلام الملوک ملوک الکلامؒ' بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے، جو آدمی بادشاہ ہوتا ہے تو اس کا کلام سلاطین کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے اور جو ذات ایسی ہو کہ جو بادشاہوں کی بادشاہ ہو، صحیح معنی میں شہنشاہ تمام شہنشاہوں کا شاہ یعنی بادشاہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے، تو اس کا کلام ہی درحقیقت اس کی بات ہی درحقیقت تمام کلاموں اور تمام گفتگوؤں اور تمام باتوں کا

سلطان اور سردار اور بادشاہ ہے۔ اسلئے یہ قرآنِ کریم ایک ایسی علم ومعرفت کی زمین ہے کہ جس کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ لے کہ یہ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں اور بستے ہیں زندگی گذار رہے ہیں اس زمین سے ہمیشہ اُگنے والی سبزیاں، اُس سے اُگنے والے پتے اور پتّیاں، اس سے اُگنے والے پھل اور پھول، یہ جتنی بھی نبات اور گھاس وغیرہ اس سے اُگتی ہیں کیا آپ اسے گِن سکتے ہیں کہ کتنی اُگیں آج تک؟ اور کتنی اُگ رہی ہیں اور آج کے بعد کتنی اُگیں گی؟ کروڑوں، عربوں، کھربوں، ان گنت بیشمار تعداد میں گویا وہ ہیں، اللہ جل جلالہ کے علمِ محیط میں ہیں کہ اس زمین سے اُگنے والے پھول، پتیاں، پنکھڑیاں، سبزہ، اور غلے، اور دانے اور پھل اور پھول یہ چیزیں کتنی اُگتی ہیں ۔ زمین ہمارے سامنے ہے جس زمین پہ ہم آپ بیٹھے ہوئے ہیں اس سے کروڑوں، اربوں، کھربوں، چیزیں نکلتی جا رہی ہیں، نکلتی رہی ہیں، اور آگے بھی نکلتی رہیں گی، جب یہ بات آپ دیکھتے ہیں تو قرآنِ کریم کے باب میں آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ علم ومعرفت کی ایک زمین ہے، حقائق کی ایک زمین ہے، یہ علم ومعرفت کی ایک زمین ہے، اور ایسی زمین ہے علم ومعرفت کی کہ اس سے نکلنے والے علوم، اس سے نکلنے والے حقائق، اس سے نکلنے والے معارف، اس سے نکلنے والے مسائل، اس سے نکلنے والے دقائق، اس سے نکلنے والی باریک باتیں، حکمت کی باتیں، راز کی باتیں، گہری باتیں، وہ ایسی ان گنت و بیشمار ہیں کہ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس مقام پر آکر کے قرآنِ کریم کا علم رک گیا اور ختم ہو چکا ہے، بلکہ قرآن کریم کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے یہ آپ ﷺ کا ارشاد ہیں، (فضائل قرآن) مگر یہ الگ بات ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کیلئے جو روشنی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی ہیں، اور آپ ﷺ کے عطا فرمودہ اصول اور روشنی کے تحت صحابۂ کرام نے اور ان کے بعد کے حضراتِ

اکابرین نے جوقرآنِ کریم کوسمجھا ہیں اس معیار کو ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہوگا، ورنہ ایک بات آپ سن لے کہ مثلاً اصول کا ایک قاعدہ ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ مجمل کی مراد مجمل ہی سمجھ سکتا ہے، ایک شاعر ہے اس نے ایک شعر کہا شعر کی مراد شاعر ہی زیادہ سمجھے گا، ایک بات میں کہوں تو بات کو کہنے والا متکلم ہی زیادہ سمجھ سکتا ہے، جو مجمل چیز ہے اس کی وضاحت مجمل زیادہ کرے گا، یہ اصول کا مسئلہ ہے''نورالانوار، ایک کتاب ہے عربی میں اصول کی اس میں گویا سب قواعد بیان کئے گئے ہیں، اس میں ہے کہ مجمل کی مراد کو مجمل زیادہ سمجھتا ہے وہی اس کو کھول سکتا ہے اور واضح کرسکتا ہے (نورالانوارص۹۲) جب یہ حقیقت ہے، تو میں آپ کے سامنے ایک جملہ رکھوں اب اس کے بعد اس جملہ کا مطلب آپ بیان کریں، آپ بیان کریں، آپ بیان کریں، آپ وضاحت کریں، آپ وضاحت کریں، آپ وضاحت کریں، حاضرین میں سے ہر ایک اسکی وضاحت کریں، مگر معیار، دستور، اصول، ضابطہ، اور قاعدے کی بات یہ ہے کہ جس کا کلام ہے وہ اپنے کلام کی مراد کو واضح کرے وہ زیادہ معتبر ہے، اور اس کو دنیا کا کوئی سمجھدار آدمی رد نہیں کرسکتا، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے بشرطیکہ متکلم اپنے کلام کی مراد کو اس طریقہ سے واضح کرنا چاہتا ہو کہ اس کا سر پیر ہو، ایران تران کی کہے، اوٹ پٹانگ کہے تو وہ جو ہے کوئی بات نہیں ہے۔

قسمت کے دیکھنے والے سڑک کے کنارے پر

وہ جیسے ایک جوتیشی تھا اس کے پاس ایک شخص پہنچا اور اپنا ہاتھ دِکھایا اور کہا کہ میرا نصیب آپ دیکھے، اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ قسمت کے دیکھنے والے سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں، علم ان کا اتنا کہ وہ گویا لوحِ محفوظ تک پہنچا ہوا، قسمتوں پہ ان کی

نظریں، نصیبوں پہ ان کی نظریں، اور تشریف فرما ہیں سڑک کے کنارے اور وصول کررہے ہیں اس کی قیمت دو آنہ اور چار آنہ، یہ خود تعجب خیز بات ہے، تو اس نے ہاتھ دیکھا اور ہاتھ دیکھنے کے بعد کہا کہ تم بہت بڑے کروڑ پتی بنو گے، کہا کیسے؟ کہا ہم سمجھتے ہیں ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے آگے پیچھے گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔

خیر، ہوا یہ کہ مستقبل آیا تو وہ شخص چوراہے کی کمان کرنے والی پولس بنا، یہ جو چوراہے پر پولس ہوتا ہے کمان کرتا ہے گاڑیوں کو تو اس کے آگے پیچھے گاڑیاں دوڑ رہی ہوتی ہیں اور جیب اس بیچارے کا خالی ہوتا ہے، گاڑیاں تو اس کے آگے پیچھے بلاشبہ دوڑ رہی تھیں مگر یہ کہ وہ کروڑ پتی نہ بن سکا، اسکے چاروں طرف موٹر کاریں تھیں مگر وہ بیچ میں فلوس کے اعتبار سے بے کار تھا اس کا کوئی وقار ایسا نہیں تھا جو اس نے بتایا تھا۔ تو میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ یہاں جو بات اس نے کہی تھی وہ کسی حد تک تو صحیح تھی، اب اس میں گفتگو ہے کہ کیا ان کی باتیں صحیح ہو سکتی ہے؟

سو جھوٹ ایک سچ

جنابِ نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ سو جھوٹ اور ایک سچ (مشکوۃ، ص ۳۹۳) کبھی واقعہ سے تعلق اس کا ہو سکتا ہے، اور اس کی وجہ بھی صحیح بخاری کی حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ ملائکہ آپس میں انتظامی امور میں گفتگو کرتے ہیں جو ان سے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ شیاطین اوپر پہنچکر اس میں سے کچھ اچک لیتے ہیں چنانچہ اس کو دوڑایا جاتا ہے ان پر بمباری ہوتی ہے اور باقاعدہ بمباٹ کیا جاتا ہے انہیں، تو اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک شیطان اپنا منہ دوسرے کے کان میں اور دوسرا جو ہے اپنا کان وہ تیسرے کے منہ میں تو ایک کا کان دوسرے کا منہ دوسرے کا منہ ایک کا کان اس طرح زمین سے لیکر

آسمان تک ایک تسلسل قائم ہوتا ہے اور اسکے بعد جب وہاں سے اسے دوڑایا جاتا ہے تو وہ اسے مار دیتے ہے (شیاطین سے حفاظت ص ۴۳،۴۴،۴۴) لیکن اس میں یہ شکل ہوتی ہے کہ کبھی اس نے بات پہنچادی تو وہ فٹافٹ بالکل تیزی کے ساتھ نیچے تک پہنچ جاتی ہے، وہ ایک بات صحیح ہوتی ہے جو کسی کاہن تک جوتشی تک پہنچی ہے اور پھر وہ اس میں سو جھوٹ ملاتے ہیں، اور منشاء یہ تاکہ لوگوں کے عقائد خراب ہوں۔

گھر میں سوراخ کیسا؟

چوروں کی ایک جماعت تھیں وہ ایک جگہ چوری کرنے گئے، تو پہلے زمانہ میں دیواریں بہت موٹی موٹی ہوتی تھی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ پہلے زمانہ کی کھڑکیاں ایسی ہوتی ہے کہ آدمی سو جائیں اس میں، دیواریں بھی ماشاء اللہ بالکل بہت چوڑی چوڑی میں نرولی گیا تو وہاں بعض بوڑھے کہنے لگے کہ ہمارے بچپن میں تو کھڑکی بنانے کے لوگ قائل ہی نہیں تھے، وہ کہتے تھے کہ گھر میں سوراخ کیسا یعنی کھڑکی بنانے کے بارے میں کہتے تھے کہ گھر میں یہ سوراخ کیسا، دروازے بھی آپ نے دیکھے ہوں گے ماشاءاللہ موٹے موٹے وہ ایک اعتبار سے اچھے تھے، اب تو ایسے ہوتے ہیں کہ ایک لات مارے تو دو ٹکڑے ہو جائیں اسکے، لیکن پہلے جو ہے مضبوط قسم کے ہوتے تھے، خیر، تو وہ دیواریں بڑی بڑی اور موٹی ہوتی تھی تو وہ اس میں نقب لگاتے تھے سوراخ اور سوراخ کرتے کرتے جب اندر تک پہنچتے تو کئی چور ہوتے تھے چوروں کی پوری پوری گینگ ہوتی تھیں، تو یہ شکل ہوتی کہ یہ دیکھنے کیلئے کہ گھر میں کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے وہ نقب لگانے والا اپنا پیر اندر ڈالتا، اور دیکھا کہ پیر اندر گیا اس کے بعد بھی کسی نے کوئی حرکت نہیں کی پیر کو پکڑا نہیں کچھ نہیں تو وہ سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سو رہے ہیں، پھر اندر

داخل ہوتے تھے اور داخل ہونے کے بعد پھر چوری کرتے تھے، اور اب تو چور باقاعدہ اس طرح گھر میں آتے ہیں کہ مہمان ہی آئے ہوں، ایسی چوریاں گجرات میں ہوئی کہ چوری بھی کی اور باورچی خانہ میں جا کر کھانا کھایا چائے پکائی اس طرح گویا گھر میں مہمان آئے ہو، تو کھانا کھایا چائے پکائی اور چائے پی کر پھر تشریف لے گئے، اطمینان کی بھی حد ہوتی ہے، تو چوروں کہ اطمینان کا زمانہ ہے یہ، خیر، تو شکل یہ ہوئی کہ کئی چور کھڑے تھے ایک چور نے اپنا پیر اندر داخل کیا اب پیر جو اندر پہنچا تو گھر میں ایک آدمی نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی آدمی دیوار میں سوراخ کر رہا ہے تو وہ قریب تیار رہا جب سوراخ ہو گیا اور چور نے اپنا پیر دیوار میں داخل کیا تو اس نے ایک دم سے چور کا پیر پکڑ لیا، پیر تو پکڑا گیا، ان ساتھیوں نے دیکھا کہ یہ ظالم تو پکڑا گیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ پٹائی کے بعد ہمارا بھی نام آئیں وہ ہمارا نام بتا دیں اور اسکے نتیجہ میں ہم بھی پکڑے جائیں، تو گھر کے اندر سے اُس نے پیر پکڑا اور اِدھر چوروں نے اُس کی گردن کاٹ دی، عجیب۔ تو منشاء ان کا یہ تھا کہ ماخوذ ہونے اور پکڑے جانے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی پکڑے جائیں اور ہلاکت ہو تو کبھی ایسا کرتے تھے، ابلیس کا سلسلہ بھی یہی ہے کہ وہ بات ایک دوسرے کو پہنچا دیتے ہیں تا کہ ہم چاہے مریں، مریں لیکن بات محفوظ رہے اور بنی آدم کی گمراہی کا سلسلہ ہمارے مرنے کے بعد بھی قائم رہیں ابلیس کی ذریت یہ سوچتی ہیں، وہ بڑا جو ہے گرو گھنٹال ابلیس وہ تو رہے گا ہی سہی، تو خیر، میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ میں نے ایک بات کہی اس کا منشاء صحیح طور پر وہی معتبر ہے جو میرا منشاء ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی مراد نبیوں کے ذریعہ واضح فرماتے ہیں

تو اللہ تعالیٰ کے کلام میں کئی پہلو نکلتے ہیں، مگر مراد اپنے نبیوں کے ذریعہ سے

اور پیغمبروں کے ذریعہ سے اللہ تعالی نے اپنے کلام کی جو واضح فرمائی ہیں اسکی جو تشریح فرمائی ہیں اعتبار اسی کا ہوگا، یہ نہیں ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت لے کر میں جو مطلب بیان کردوں وہ اگر مطلب بن جاتا ہو، اور آپ جو مطلب بیان کردیں وہ مطلب بن جاتا ہو، اور یہ جو مطلب بیان کریں وہ مطلب بن جاتا ہو، تو قرآنِ کریم کی تفسیر چوں چوں کا مربّہ ہوجائے گی، جو آئے گا وہ اپنی کہے گا، جو آئے گا وہ اپنی سنائے گا جو آئے گا وہ اپنی مراد ظاہر کرے گا، اور ظاہر بات ہے کہ عقلیں مختلف ہیں۔ تیس تیس سال تک لوگوں نے ایک بات عقل کی روشنی میں کہی ہے بڑی بڑی کوششوں کے بعد مگر جب تیس سال گذر گئے پینتیس سال گذر گئے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے آج تک جو بات سوچی تھی عقل کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ وہ غلط ہیں۔

ایسا بہت ہوا ہے کہ برسوں ایک بڑے سے بڑا فلسفی، یا بڑے سے بڑا ریفامر کسی بات کی صحت اور کسی بات کی درستگی اور اسکی صداقت کا قائل رہا ہے مگر دن بیتنے کے بعد اور وقت گذرنے کے بعد پھر اسے احساس ہوا کہ غلطی تھی، تو یہ عقل جو ہے اپنے فیصلہ میں محتاج ہے، ہمارے حضرت تھانوی رحمہ اللہ اسکی ایک مثال دیتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ: ایک بستی میں کچھ نابینا لوگ رہتے تھے اندھے ان اندھوں کو ہاتھی کے دیکھنے کا بڑا شوق تھا اور بیچاروں کی آنکھیں ندارد آنکھیں نہیں تھی، بستی میں ایک ہاتھی آیا تو وہ دوڑ پڑے، جانے کے بعد کسی نے اس کی سونڈ کو ہاتھ لگایا اور کہا کہ اوہو ہاتھی یہی ہے، کسی نے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ ہاتھی یہی ہے، کسی نے اس کے سُپڑے جیسے کان پر ہاتھ لگایا اور کہا کہ ہاتھی یہی ہے، کسی نے ستونوں کی طرح پیر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ ہاتھی یہی ہے، کسی نے دُم پکڑ کر کہا کہ ہاتھی یہی ہے (رہنمائے سعادت، ص ۵۰) حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: دیکھو! وہ جتنے اندھے تھے ان کی عقلیں سالم تھیں، ان کی فہم صحیح

تھیں یہ بات اپنی جگہ بالکل مسلم، مگر فیصلہ ان لوگوں کا غلط کیوں ہوا صرف اس بنیاد پر کہ حواس میں سے، دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی جو پانچ طاقتیں اللہ تعالی نے انسان کو دی ہیں ان میں سے صرف دیکھنے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے ان سے سلب فرمالی کہ آنکھ دیکھنے کا کام نہیں کرتی تھی، تو عقل باوجود موجود ہونے کے آنکھ چونکہ نہیں دیکھ رہی اپنا فیصلہ غلط کررہی ہے، تو معلوم ہوا کہ عقل اپنے فیصلہ میں آنکھ کی احتیاج رکھتی ہے جب بینائی ان کی رخصت ہوگئی تو انہوں نے فیصلہ غلط کیا، تو حضرت فرماتے تھے کہ: یہ عقل بیچاری ایسی مسکین ہے کہ حواس میں سے کوئی حاسّہ اور اعضاء میں سے کوئی عضو رخصت ہوجائے تو اس کا جج مینٹ اور فیصلہ غلط ہوجاتا ہے، یہ ایسی محتاج ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جب عقل ایسی محتاج ہے تو قرآنِ کریم کی تفسیر کی بنیاد عقل پہ نہیں رکھی جاسکتی، ہاں! عقل کے استعمال سے روکا نہیں ہے مگر لمیڈ کے ساتھ، دائرے میں رہ کر، حدود میں رہ کر، اصولوں کے ساتھ، نہ جمود کی تعلیم دی ہے نہ آزادی اور بے فکری کی تعلیم دی ہے کہ ہر شخص صاحبِ رائے بن جائے، قرآنِ کریم نے ایک ایسا اعتدال سکھلایا ہے کہ اگر اس کو اپنالیا جائے تو عقل کی استعدادیں بھی کھلے گی، مگر ایک خاص دائرے میں رہ کر اور ایک خاص اصول کے تحت، اگر اس طرح یہ دونوں چیزیں سامنے آگئی تو قرآنِ کریم کو سمجھنے میں مدد ہوگی، کہ عقل کا اعتبار ہے بھی، اور نہیں بھی ہے۔ ہے اسکی اپنی حد تک، اور نہیں ہے اسکی اپنی حد تک۔

سورۂ یوسف کو اپنی پچھلی سورت سے بڑی مناسبت ہے

تو میں یہ ذکر کررہا تھا کہ قرآنِ کریم علم کا ایک بہت بڑا سمندر ہے، اور یہ اسکی ایک سورت ہے جس کی میں نے تلاوت کی، یہ سورۂ یوسف کہلاتی ہے، اسکو اپنی پچھلی

سورت سے بڑی مناسبتیں ہیں (گلدستۂ تفاسیر ج ۳) اس سے پہلے والی سورت جو ہے اسکی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''**وکلا نقص علیک من انباء الرسل مانثبت به فؤادک**'' (ھود، آیت: ۱۲۰)

ہم جو آپ سے نبیوں کی خبریں سناتے ہیں، نبیوں کے واقعات ہم آپ سے بیان کرتے ہیں، تو اس سے ہم آپ کے دل کی آپ کے قلب کی تثبیت اور اسکے اطمینان کی گویا کیفیت چاہتے ہیں، یعنی ان انبیاء کے واقعات سے آپ کے دل کو قوّت اور ایک قسم کی طمانینت اور اطمینان نصیب ہوگا، وجہ اس کی یہ ہے کہ دعوت کے باب میں اور دین کے باب میں انبیاءِ کرام علیہم الصلوۃ والسلام پر جو حالات گذرے ہیں وہ حضور ﷺ کے سامنے جب لائے جائیں گے تو نفسیاتی طور پر آپ پر بھی اثر ہوگا۔ اسی لئے اس سے پہلے کی جو سورت سورۂ ہود ہے اس سورت میں حضرت نوح علیہ السلام کی مشکلات اوران کے جو حالات قوم کے ساتھ رہے ہیں ان کا تذکرہ ہے، اس میں حضرت صالح علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا گیا، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا، حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا، ان نبیوں کے قصوں کو بیان فرمانے کے بعد اب حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ کیا جارہا ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک تسلسل قائم ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ پچھلے جو واقعات بیان کئے اُس کی ترتیب اور اِس کی ترتیب میں اختلاف ہے۔

قرآنِ کریم کی ترتیب دو قسم کی ہیں

دیکھو! دو قسم کی ترتیب ہیں قرآنِ کریم کی، ایک بات یہ ذہن نشیں رہے کہ جب آدمی قصہ سنتا ہے تو قصہ ایک واقعہ کی ترجمانی ہوتی ہے، ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی ہے

کہ تقریر میں جب تک علمی بات چلتی ہے لوگ دھیان سے نہیں سنتے، اور جہاں کوئی واقعہ شروع کردو تو لوگ فوراً ایک دم سے متوجہ ہوجاتے ہیں، تو واقعات جو ہے وہ انسانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اثر ڈالتے ہیں، یہ فطری بات ہے، نفسیاتی بات ہے، مگر اس میں قرآنِ کریم کا آپ ایک پہلو یہ دیکھیں گے کہ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے جو فرعون سے متعلق ہے، یا انہیں پیغمبروں کا واقعہ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام وغیرہ ان کے واقعات کو آپ دیکھیں گے وہ قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر بیان کئے گئے ہیں، کہیں واقعہ کا کوئی پہلو، کہیں واقعہ کا کوئی حصہ، کہیں واقعہ کا کوئی جز، اور کہیں واقعہ کی کوئی حیثیت کھولی گئی ہے، ایسا کیوں؟ اس کی ایک حکمت یہ ہے کہ واقعہ اگر مسلسل بیان کیا جائے تسلسل کے ساتھ ایک دھاری جسے کہتے ہیں الف سے لیکر یاء تک مربوط ربط کے ساتھ پورا مکمل واقعہ ہی بیان کیا جائے، اس میں ہوتا یہ ہے کہ انسان واقعہ کی اور قصہ کی دلچسپی میں گم ہوکر رہ جاتا ہے، اور اللہ جل شانہ کا منشاء انسانوں کو واقعہ اور قصہ کی دلچسپی میں گم کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ منشاء ہے واقعہ کے کسی پہلو سے کوئی عبرت حاصل کرانا، یہ درحقیقت مقصود ہے۔ اسی لئے بعضوں نے یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم میں ربط نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ربط موجود ہے۔

دیکھو! میں اس کی ایک مثال دوں کہ ایک باپ ہے اور اس کا ایک چھوٹا سا بیٹا ہے اور وہ باپ کے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا ہے باپ بھی کھا رہا ہے، کھانا کھاتے کھاتے باپ نے اپنے چھوٹے ننھے منھے بیٹے کے سامنے ایک قصہ شروع کیا کہ دیکھ بیٹا سن! اور پھر اس نے سنانا شروع کیا کہ ایک بزرگ تھے اور یوں تھا اور یہ کرتے تھے وغیرہ وغیرہ اس درمیان میں باپ کی نظر بیٹے کے ہاتھ پر پڑی تو باپ نے دیکھا کہ بیٹے

نے بہت بڑا لقمہ اٹھایا ہے، تو باپ نے فوراً کہا کہ دیکھو بیٹا کھانا اس طرح نہیں کھایا کرتے، کھاتے وقت لقمہ ایسا نہ لو جس سے یہ معلوم ہو کہ تم حریص ہو، لالچی ہو، چھوٹا لقمہ لو کہ اعتدال کے ساتھ جس کو چبا سکو، بڑا لقمہ نہ لو، یہ بات باپ نے درمیان میں کہی اور پھر اپنا اصل قصہ شروع کر دیا، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ایک آدمی ہے جس کو اس بیان کی صورت پہ اطلاع نہیں ہے کہ یہ بیان کب ہو رہا ہے، وہ سوچے گا کہ باپ بیٹے سے واقعہ بیان کر رہا ہے پھر بولتا ہے کہ کھانا جو ہے ایسے نہیں کھاتے لقمہ چھوٹا ہونا چاہئے اور فلاں ہونا چاہئے اس سے قصہ کا جوڑ کیا ہے؟ وہ بے چارہ تعجب کرے گا، وہ کہے گا کہ کلام میں کوئی ربط نہیں ہے، کلام میں کوئی جوڑ نہیں ہے، کلام میں کوئی ارتباط اور وابستگی آپس میں نہیں ہے، مگر جو حقیقتِ حال پر واقف ہوگا وہ کہے گا کہ کلام اپنی ترتیب میں نہایت حسین وجمیل ہے، وہ تو درمیانِ کلام میں ایک وقتی ضرورت پیش آئی تھی اس پر متنبہ کیا اور پھر اصل بات شروع ہوگئی۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت، حصہ نہم)

جب آپ اس حقیقت کو سمجھ گئے تو اب آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم میں دوسرے پارہ میں نکاح کا تذکرہ چل رہا ہے، طلاق کا تذکرہ چل رہا ہے، دودھ پلانے کا تذکرہ چل رہا ہے یہ خانگی زندگی کے حالات ہیں، نکاح ایک خوشی کی بات ہے، اور طلاق ایک غم کی بات ہے، غمی اور خوشی کے تذکرے چل رہے ہیں اور آدمی جب زیادہ خوش ہوتا ہے تب بھی بعض دفعہ خدا تعالی سے غافل ہو جاتا ہے، اور بہت غم پیش آ جائیں اس میں بھی غفلت ہو جاتی ہیں، یہ مسائل چل رہے ہیں اور درمیان میں فرمایا " **حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطی**" (بقرہ، آیت: ۲۳۸) کہ نمازوں کی حفاظت کرو اور خاص طور سے صلوٰۃِ وسطیٰ کی جس میں کئی قول ہیں جس میں راجح یہ ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ (گلدستۂ تفاسیر ج ا ص ۴۸۷)

اب آدمی دیکھتا ہے کہ یہ نکاح کا بیان ہے، طلاق کا بیان ہے۔ بچوں کے دودھ پلانے کے احکام ہے اور فلاں فلاں احکام قرآنِ کریم بیان کررہا ہے اور اسکے بیچ میں نماز کا تذکرہ، دونوں کا آپس میں کیا جوڑ ہے؟ اس کا ربط صرف یہی ہے کہ انسان کی نفسیات کو خالق سے زیادہ کوئی نہیں جانتا، اور انسان خوشی اور غمی کی حالت میں ظاہر بات ہے کہ خدا تعالیٰ کو فراموش کر بیٹھے گا، بھول جائے گا اس کا قوی امکان ہے، تو فرمایا کہ: نکاح کی خوشیاں اور طلاق کا غم یعنی حالات جو غم اور خوشی کے تم کو پیش آئیں وہ تم پر ایسے اثر انداز نہ ہو کہ تم ہماری یاد سے غافل ہو جاؤ، اس لئے بیچ میں اپنی یاد کی طرف متوجہ کرنے کیلئے تنبیہ فرمادی، پھر اصل واقعہ شروع کر دیا۔ تو جو کلام کی نزاکتوں کو سمجھے گا اور گہرائی کو پاسکے گا وہ سمجھے گا کہ پورا قرآنِ کریم ایک حسین لڑی کی طرح سے ہیں اور اس کی ہر آیت دوسری آیت سے مرتبط ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں قرآنِ کریم کے جو روابط کھولے ہیں ظاہر ہے اس کا یہاں موقع نہیں ہے اور وقت بھی نہیں ہے اور وہ چیز ایسی بھی نہیں ہے کہ تھوڑی دیر میں آ بھی جائے، تو میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ اگر اس حقیقت کو آپ دیکھے اور اسکے علاوہ جو علمائے سلف نے لکھا ہے تو آپ کو حیرت ہوگی اور آپ جو ہے تعجب کریں گے کہ واقعی کیسے کیسے جواہر پارے ہیں جو انہوں نے کھولے ہیں، اور کیسے کیسے ہیرے ہیں جو اندر سے نکالے ہیں، اور کیسے کیسے موتی ہیں جو سامنے لاکر رکھدیئے ہیں شرط یہ ہے کہ ہم اسے دیکھے تو سہی، اسے جانے تو سہی، یہاں تو ترجمہ کے ہی لالے پڑے ہوئے ہیں بعد کی چیزیں تو بہت دور کی ہے۔

سورۂ یوسف کی شان دوسری ہے

تو میں ذکر کررہا تھا کہ یہ سورۂ یوسف ہے اور یہ سورۂ یوسف جو بیان کی گئی ہے

اس میں آپ دیکھیں گے کہ اس کی شان دوسری ہے، اصحابِ کہف کا قصہ قرآنِ کریم میں صرف ایک جگہ بیان ہوا بس، اس کے سوا کہیں نہیں ملے گا آپ کو، ذوالقرنین کا واقعہ قرآنِ کریم میں ایک ہی جگہ بیان ہوا ہے سولہویں پارے میں بس۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ سرگذشت اور ان کی پوری داستان وہ ترتیب کے ساتھ آپ کو یہاں مل جائے گی، ویسے اس کے علاوہ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ قرآنِ کریم میں آپ کو اور جگہ پر بھی ملے گا، اور چوبیسویں پارے میں بھی یوسف نامی ایک شخص کا ذکر ہے مگر اس میں گفتگو ہے کہ وہ یوسف یہی ہے یا کوئی اور ہے۔ باقی یہ کہ یہ قصہ پوری ترتیب کے ساتھ یہاں بیان کیا گیا ہے، گویا قرآنِ کریم نے اس پہلو کا بھی لحاظ کیا ہے کیوں کہ کلام کے حسن میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مرتبط بیان کیا جائے، (گلدستۂ تفاسیر ج ۳) مربوط بیان کیا جائے، اور وہ مصلحت تھی اس لئے کچھ واقعات اس شان کے ساتھ بھی بیان کئے گئے۔

ٹی وی یہ روحانیت کا روگ ہے

اور خود اس کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ صحابۂ کرام نے خود درخواست کی (گلدستۂ تفاسیر، ج ۳ ص ۴۱۹) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اُس زمانہ میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ لوگ راتوں میں قصہ کہانیاں کرتے تھے، اب بھی تھوڑے زمانہ پہلے یہی تھا کہ لوگ راتوں میں بزرگوں کے قصے کہانیاں اور واقعات سناتے تھے، یہ تو اب جو دور چل پڑا ہے ٹی، وی کا کیا پوچھنا یہ روحانیت کا روگ جو لگا ہوا ہے اور یہ جو خرافات شروع ہوئی ہے اس کے بعد سے سب چیزیں ختم ہوتی جا رہی ہیں، اب تو نہ قصے ہیں نہ کہانیاں سب چیزیں ہوا ہوگئی، اب تو خون ہی خشک ہوگیا ہے، اب تو نہ ماں سے تعلق ہے، نہ باپ سے تعلق

ہے تو قصے کہانیوں سے کیا تعلق رہے گا، بھائی جب ماں باپ سے ہی جوڑ نہیں ہے کہ جو تشریف آوری کا سبب بنے ہیں تو پھر دوسری چیزوں سے کیا جوڑ رہے گا، جو پھیکا پن زندگیوں میں آ رہا ہے بس نہ پوچھئے بات، مشاہدہ کر رہی ہے دنیا، تو میں ذکر کر رہا تھا کہ یہ چیز تھی، تو صحابۂ کرام نے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! کوئی مسلسل مربوط واقعہ ہمارے سامنے آ جائے، اور بعض روایتوں میں آیا ہے جس کو حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے تفسیرِ طبری میں نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے مشرکین کو یہ بات کہی کہ آپ ﷺ سے یہ دریافت کیا جائے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام ان دونوں کا وطن تھا شام جس کو آج سِر یہ کہتے ہیں پھر یہ لوگ مصر میں کیسے آئے؟ اس کی وجہ کیا ہوئی؟ (فوائد عثمانی ص ۳۱۲) اس سوال کے ضمن میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسا سمندر ہے کہ...........

چنانچہ اس واقعہ میں پچھلی کتابوں میں جو کچھ کچھ باتیں بیان کی گئی تھیں تقریباً وہ سب باتیں اس میں آ گئی، لیکن یہ بات ذہن نشیں رہے کہ بائبل میں اور دوسری کتابوں میں جہاں کہیں اس قسم کے واقعات کی طرف اشارہ ہے بہت بے سرو پا قصے اور جو ہے آسمان و زمین کو ملانے والے قلابے اور داستانیں بیان کی گئی ہیں تحریف کر کے، حقیقت سے اس کا تعلق نہیں ہے، اور اگر آپ ان تفصیلات کو دیکھنا چاہے تو تفسیرِ حقانی شیخ ابو محمد عبد الحق حقانی کی یہ جو حقانی ہے موجودہ زمانے کا جو تقریر کرتا ہے یہ نہیں بلکہ شیخ ابو محمد عبد الحق حقانی کی تفسیر ہے اس میں انہوں نے اہلِ کتاب کے متعلق کافی معلومات

فراہم کی ہیں جس کو تفسیر کا شوق ہو وہ دیکھے، اورارض القرآن علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی، اور تفسیرِ کبیر، اور اظہارِ حق کیرانوی صاحب کی تو اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اہلِ کتاب نے کتنی گڑ بڑیاں کی ہیں، بہر حال، یہ واقعہ جب بیان کیا گیا تو بعض کتبِ تفاسیر میں لکھا ہے کہ سورۂ یوسف کے نازل ہونے کے بعد بہت سے یہودی مسلمان ہو گئے انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

بہر حال، یہ سورۂ یوسف ہے اس کا تذکرہ اور اس کی تفصیل انشاءاللہ کسی حد تک کی جائے گی، میں چاہوں گا کوشش کروں گا اس بات کی کہ رمضان المبارک کے ختم ہونے تک ایک دورکوع ہو جائیں، ورنہ یہ ایک ایسا سمندر ہے ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ایک دو آیتیں پورے مہینے کے لئے کافی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں، صحیح احساس نصیب فرمائیں، اور قرآنِ کریم کے تقاضوں کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے اور اپنی زندگیوں میں اسے لانے اور دوسروں تک اسے پہنچانے کی توفیق نصیب فرمائیں، آمین۔

درس نمبر (۲)

بعد از خطبہ

کلام متکلم کے علم کی ترجمانی کرتا ہے

بزرگانِ محترم ! گذشتہ کل یہ بات کہی گئی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام اپنے اندر بہت علوم وحِکم لئے ہوئے ہیں، جیسا علم متکلم کا ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کا کلام بھی ہوتا ہے، گویا کلام متکلم کے علم کی ترجمانی کرتا ہے، اس کی وضاحت کرتا ہے، اس کا پتہ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ متکلم ہے اس کلام کے اور اللہ تعالی کا علم ایسا ہے کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، تو ظاہر بات ہے کہ اس کا علم اسکے کلام سے جھلکے گا، روشن ہوگا، نمایاں ہوگا، اسلئے قرآنِ کریم کی تفسیر ایک بہت بڑا سمندر ہے، بہت بڑا علم ہے، اربابِ تفسیر لکھتے ہیں کہ سلفِ صالحین جب کسی آیت کی تفسیر کرنے کیلئے بیٹھتے تو ڈر جاتے تھے، بعضوں سے کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا جاتا تو کانپ جاتے، اور وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ یہ رب العالمین کے کلام کی وضاحت ہے اور آسان کام نہیں ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ان بزرگوں نے محنتیں کر کر کے جنابِ نبیٔ کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کی تفاسیر کو کتابوں میں درج نہ کیا ہوتا تو آج ہم قرآنِ کریم کو صحیح طور پر صرف الفاظ کی روشنی میں سمجھ نہیں پاتے، یہ ان حضرات کا بڑا احسان تھا اور ان کا کرم تھا کہ ان کے طفیل اور ان کی برکت سے ہم کتاب اللہ کو سمجھ رہے ہیں، یہ سورۂ یوسف ہے اور بڑے بڑے اس میں علوم ہیں، اور بڑے بڑے فوائد ہیں۔

سیرتِ یوسف اور حیات محمدی ﷺ میں بڑی مناسبتیں ہیں

نبیٔ کریم ﷺ کی زندگی سے بھی اس میں بڑی مناسبتیں ہیں، (گلدستۂ تفاسیر، ج ۳ ص ۴۱۹) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طریقہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو کمالات سے نوازا نبی کریم ﷺ کو بھی بے پناہ کمالات سے نوازا تھا، ان کمالات کا اثر حضرت یوسف علیہ السلام کے باب میں یہ ہوا کہ بھائیوں کو حسد ہوا اور ان کو یہ نا گواری ہوئی کہ ہمارے ابا جان حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کی جانب اتنے زیادہ متوجہ کیوں ہے، ہم تو وقت پر کام دے سکیں، وقت پر کام آسکیں ایک ایسا جتھا اور ایک ایسی مضبوط جماعت ہیں، (فوائد عثمانی ص ۳۱۳) اور یوسف ننھے منھے ہیں چھوٹے ہیں مگر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے والد بزرگوار کی ساری توجہ کا مرکز اور تمام شفقتوں کا رُخ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب ہیں، انہیں کیا پتہ تھا کہ باپ صرف ظاہری جمال کی وجہ سے نہیں بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے باطنی کمال کی وجہ سے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو زیادہ چاہتے تھے، گویا کمالاتِ ظاہری اور کمالاتِ باطنی دونوں کی جامع ترین شخصیت تھیں حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات، اور بچپن سے آثار اس کے ظاہر تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نبی تھے اور نبوت کی نگاہیں ان کمالات کو اور مستقبل کی روشن تابناکیوں کو دیکھ رہی تھی، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کی توجہ کا مرکز حضرت یوسف علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھیں، مگر بھائیوں کو حسد ہوا، ٹھیک اسی طریقے سے آپ ﷺ کے کمالات اور آپ ﷺ کی خوبیاں ظاہری بھی، باطنی بھی، علمی بھی، عملی بھی، وہ تمام ایسی تھیں تو اس کا اثر یہ ہوا کہ خود قومِ قریش کو اور بنی ہاشم کے افراد کو آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر حسد ہوا، چاہئے تو یہ تھا خوشیاں مناتے، ہوتا یہ کہ نبیٔ کریم ﷺ کا اتباع

کرتے اور اپنے لئے دنیا اور آخرت کی سعادتوں کو مہیا کرتے، مگر بجائے اس کے کہ یہ کام تو بہت کم لوگوں نے انجام دیا اکثروں کا حال یہ تھا کہ انہیں نبیٔ کریم ﷺ کی محبوبیت آپ کی مقبولیت آپ کے کمالات اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو رتبہ دیا تھا وہ ان تمام چیزوں پر قوم کے افراد کو حسد ہوا اور حضور ﷺ کے ساتھ وہ جس طریق پر پیش آئے وہ تاریخ کے اوراق میں بالکل ظاہر ہے، اور اسی طریقہ سے لوگوں کی زبانوں پر آج تک موجود ہیں، تو بھائیوں کی کوشش یہ ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ کی نگاہوں سے اوجھل کیا جائے، الگ کیا جائے، اس کے لئے انہوں نے ایک پروگرام کیا، پلان بنایا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے اس کا تذکرہ کیا ہے، ٹھیک اسی طریقہ سے آپ ﷺ کے کمالات کی وجہ سے قوم کے حاسدین نے اور دشمنوں نے یہ چاہا کہ خاکِ پاکِ مکہ میں رہنے والا یہ مقدس ترین انسان اور یہ برگزیدہ شخصیت کیا اچھا ہوتا کہ یہ مکہ اور حرم شریف سے ہٹ کر، سب سے کٹ کر، اور سب سے چھٹکر کسی اور مقام پر بھیجدی جائے، اور ان کا پورا پورا بائیکاٹ ہو اور انہیں یہاں سے دور کیا جائے، چنانچہ نبیٔ کریم ﷺ کو تین سال تک شعبِ ابی طالب میں رکنا پڑا (سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۱۴۸) آپ کا قوم نے بائیکاٹ کیا اور اسی پر اکتفاء نہیں ہوا بلکہ اتنا ستایا، اتنا پریشان کیا، اتنی ایذائیں پہنچائیں، اور ایسی ایسی تکلیفیں دیں کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ بعد میں حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حکم آیا کہ اے محمد ﷺ! اب مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے جائیں، تو گویا اپنے لوگ بھی چھوٹے اور اپنا وطن بھی چھوٹا، وہاں بھی یہی شکل تھی کہ بھائیوں نے یہ چاہا کہ یوسف باپ کی شفقت بھری نگاہوں سے اور باپ کی گود سے ہٹ جائے، اور یہی نہیں بلکہ وہ کنعان شہر کی جتنی حدود ہے اس سے نکل کر اور ہٹکر کسی اور مقام پر چلے جائیں تا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو، اور باپ کی توجہ کا مرکز اور مرکوز ہماری شخصیات بن

جائیں، باپ کی شفقتیں اور محبتیں ہمارے ساتھ رہیں اور یوسف دور ہو جائیں تو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو بات پیش آئیں فخرِ کائنات جناب محمد رسول ﷺ کے ساتھ بھی وہ بات پیش آئیں۔

حضرتِ یوسف علیہ السلام اور خاتم النبیین ﷺ میں ایک اور مناسبت

پھر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو غیروں نے پہچانا، غیروں نے ان کی توقیر کی، غیروں نے ان کے وزن کو جانا ان کے مقام کو پہچانا شاہی محل میں انہیں رکھا ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا کہ ''اکرمی مثواہ'' (یوسف آیت: ۲۱) اور یوسف علیہ السلام پھر بڑھتے رہے ترقی کرتے رہے، ٹھیک اسی طریقہ سے آپ ﷺ نے جب مکہ مکرمہ ترک فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت فرمائی تو حضراتِ انصار نے نبیٔ کریم ﷺ کی قدر پہچانی، آپ ﷺ کا مقام پہچانا اور وہ بے مثال تاریخ ساز قربانی پیش کی انصار نے کہ آسمان کی چھت کے تلے کوئی قوم ایسی قربانی اس بے مثال طریق پر نہیں پیش کر سکتی۔

انصار کا مہاجرین پر ایثار

حتی کہ صرف ذاتِ اقدس ﷺ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کے وہ پروانے جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان پر بھی انصار اسی طریقہ سے نثار ہوئے جس طریقہ سے شمع پر پروانہ نثار ہوتا ہے، اور یہاں تک خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میری دو بیویاں ہیں اگر آپ فرمائے تو میں ایک رکھوں اور ایک کو طلاق دوں تاکہ وہ عدت کے بعد میرے مہاجر بھائی کے حصہ میں پہنچ جائے، (سیرۃ المصطفیٰ ج۱ص۴۳۹)
یہ بے مثال قربانی اور یہ ایثار اور اس طریقہ سے ان کا جاں نثار ہونا یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی

کرم تھا نبئ کریم ﷺ کے حق میں، مجھے مناسبت یہ ذکر کرنی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی توقیر مصر میں پہنچنے کے بعد جس شان وشوکت کے انداز میں ہوئی ہے دنیا اس سے واقف ہیں، اورٹھیک اسی طریقہ سے آپ ﷺ کو مدنی زندگی میں جو عروج نصیب ہوا وہ ظاہر ہے۔

قصۂ یوسف سے ایمان تازہ ہوجاتا ہے

اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا بعد میں اپنے والد اور خاندان والوں سے لقاء اور ملاقات ایک ایسے عجیب اور ایک ایسے حسین انداز سے ہوا ہے کہ واقعی اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دستِ قدرت گویا اس میں کس طریق پر کام کررہا ہے حیرت ہوتی ہے اور آدمی کا ایمان تازہ ہوتا ہے کہ مشکلات سے جان کا چھڑانا اور مشکلات سے کسی کو نکالنا یہ اللہ تعالیٰ کیلئے کتنا آسان ہے، اور وہ کتنے طریق وتدبیر جانتے ہیں اس باب میں اور کیسے کیسے انداز سے اپنے بندوں کو دشواریوں سے نجات دیتے ہیں، چنانچہ چالیس سال کے بعد ایک تفسیری روایت کے اعتبار سے اور اسی (۸۰) سال کے بعد دوسری تفسیری روایت کے اعتبار سے حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فراق وصال کی شکل میں تبدیل ہوا (معارف القرآن ج ۵ ص ۱۱۷) اور یہ کارواں کنعان سے چل کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے دربار میں پہنچا ہیں، اور پھر جیسی ان کی زندگی گذری ہے خوش عیشی کی وہ بالکل ظاہر ہے، یہ ایک بہت موٹی سی بات تھی جو میں نے ذکر کی، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں حضرت نبئ کریم ﷺ کیلئے تسکین وتسلی ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے زیادہ بیسیوں پچاسوں مناسبتیں ہیں جس کو درس میں ہم لوگ کھولتے ہیں اور اس پر بولتے ہیں، یہاں صرف اجمالاً بہت

موٹی موٹی مختصراً کچھ باتیں کہی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ واقعہ جو بیان کیا قرآنِ کریم میں اس میں سب سے پہلی منفعت اس ذاتِ گرامی کے لئے ہیں جس سے یہ واقعہ بیان کیا جارہا ہے، اوراس کے بعد پھر ساری امت کے حق میں۔

حروفِ مقطعات کا راز کیا ہے؟

چنانچہ واقعہ کا آغاز ہے فرماتے ہیں کہ ”الرٰ“، یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں، قرآنِ کریم میں کچھ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز اس قسم کے کلمات سے ہوا ہے، مثلاً الم، الٓمّرٰ، الٓمّصٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ، اس قسم کے کلمات ہیں، مجموعی طور پر یہ چودہ حروف ہیں تقریباً، اورایسی ۲۹ سورتیں ہیں جن کے شروع میں حروفِ مقطعات آئے ہیں (تفسیرِ عزیزی اردو، حصہ اول، ص ۱۴۷) اور یہ چودہ (۱۴) حروف ہیں (حوالا بالا) جس کا خلاصہ ہیں ”نص حکیم قاطع له سِرٌّ“ اتنے حروف ہیں جو قرآنِ کریم میں حروفِ مقطعات کی شکل میں ہیں، گویا بعض صورتوں کے شروع میں اس قسم کے حروف آئے ہیں اور وہاں پر آپ تفسیروں میں دیکھیں گے کہ اس کے ترجمہ کے بدلے وہاں لکھا ہوگا ”اللہ اعلم بمراده“ اس کی مراد کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیرِ بےنظیر میں یہ بات لکھی ہے کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، وعلی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان چاروں خلفاءِ کرام سے اور انکے علاوہ دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے یہ منقول ہیں کہ ان حروفِ مقطعات کے حقیقی معانی اور ان کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، امت کے افراد اسے نہیں جان سکتے ہیں، بعض علماءِ کرام کا خیال یہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کے حق میں یہ کلماتِ سرّ یہ ہیں، بھید، رموز، راز کے جملے ہیں، جس کی منشاء کو پیغمبر تو سمجھ سکتے ہیں مگر امت کے

افراد نہیں جانتے،(حولا بالا ص ۱۵۶)اور ایک قول اس میں تحقیقی یہ ہے کہ پیغمبر بھی اس کی مراد کو نہیں جان پاتے صرف حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک آزمائش ہیں، وہ کیسے؟ وہ اس طریق پر اسکی علماءِ کرام نے یوں وضاحت کی ہے کہ اللہ جل جلالہ کا بندوں کے ساتھ دو قسم کا معاملہ ہیں، ایک ہے کسی بات کا ماننا اس وقت جبکہ وہ عقل میں آئے، سمجھ میں آئے، ایک نظام یہ ہے، باپ بیٹے سے کوئی بات کہتا ہے اور بیٹا اس بات کو سمجھ رہا ہے کہ واقع میں یہ مفید بات ہے صاف بات ہے بیٹے نے مان لیا، استاذ اپنے شاگرد سے ایک بات کہتا ہے اور وہ بالکل صاف اور ایزی بات ہے اسنے اس کو قبول کرلیا، شیخ اپنے مرید سے ایک بات کہتا ہے اور اس کی سمجھ میں وہ بات آتی ہے کہ واقع میں یہ بات ماننے کے لائق ہے، ایک پہلو تو یہ ہے۔

بات کا دوسرا پہلو وہ ہے کہ جس میں متکلم اپنے مخاطب سے ایک بات کہے اور مخاطب کی عقل اس کی مراد کو نہ پا سکے سامنے والے شخص کی سمجھ اس کا دماغ اس کی فہم متکلم کے منشاء کو نہ سمجھ سکے، ایسی صورت میں اب اندازہ ہوتا ہے کہ متکلم پر مخاطب کو کتنا بھروسہ ہے، آیا وہ متکلم کی بات کو سمجھ کر ہی ماننے کا عادی ہے یا متکلم پر اس کا اعتماد اس درجہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہو کہ یہ جو کہہ رہے ہیں وہ بات میرے حق میں نافع ہے چاہے وہ میری سمجھ میں نہ آئے، ایسے موقعوں پر جن کی طبیعتوں میں انقیاد اور جن کی طبیعتوں میں اطاعت اور جن کی طبیعتوں میں فرمانبرداری رچی بسی ہے جن کی طبیعتِ ثانیہ ہو چکی ہے ایسے افراد اس بات کو جان کر کے کہ یہ میرے مشفق خیر خواہ اور مہربان ہے اگرچہ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے بہر صورت وہ میرے حق میں نافع ہے وہ اس کو مان لیتے ہیں، اللہ جل جلالہ نے بندوں کا امتحان اس شان کے ساتھ کیا کہ کلام وہ نازل فرمایا جس کو بندے سمجھ سکے، مگر اپنے کلام میں کچھ ایسے جملے بھی استعمال فرمائیں کہ جس سے بندوں کے

ماننے کا امتحان ہوتا ہے کہ آیا بندے جن باتوں کو یا کلموں کو یا جملوں کو جن قطعوں کو بندے نہیں سمجھ پاتے ہیں اس معاملے میں وہ اپنی عقل کو امام بناتے ہیں یا ہماری بات کے ماننے کا مزاج ہے ان کا، گویا قرآنِ کریم کی بعض سورتوں کے ابتدائی کلمات تسلیم ورضا کا پیکر بنانا چاہتے ہیں اور بندوں کے انقیاد اور بندوں کے ماننے کا امتحان کررہے ہیں کہ کون ہیں وہ جو اللہ جل جلالہ کے کلام کو اور اسکے کلامِ بلاغتِ نظام کو سمجھ کر مانتے ہیں، اور وہ جملے جہاں سمجھ کام نہ کرسکے عقل کام دے نہ سکے فہم جہاں تک پہنچ نہ سکے اسے بھی مانتے ہیں۔

ایک باریک بات

یہاں ایک بات اور سن لے باریک بات ہے، ایک ہے کسی بات کا عقل میں نہ آنا، اور ایک ہے کسی بات کا عقل کے خلاف ہونا، (خطباتِ حکیم الامت ج۶ ص ۱۲۷) بہت غور سے سنے، بہت زیادہ غور سے سنیں گے تو کچھ پلے پڑے گا، ویسے میں انتہائی کوشش کررہا ہوں کہ بات آپ کے سامنے انتہائی سہل انداز میں پیش کروں، اور اس سے زیادہ میرے امکان میں نہیں ہے، تو پوری توجہ سے سنے، تو ایک ہے عقل کے خلاف ہونا، اور ایک ہے عقل میں نہ آنا دو الگ الگ چیزیں ہیں، بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہے کہ وہ عقل کے عین مطابق ہے، عین موافق ہے، مگر عقل اس کے پانے سے قاصر ہے عقل میں آتی نہیں ہے، وہ عقل کے خلاف نہیں ہے مگر عقل اس کو پا نہیں پاتی اوپر کی بات ہے ذرا۔

عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح

اس کو آپ ایسے سمجھ لے کہ دیکھئے دو چیزیں ہیں، ایک ہے عقلِ سلیم دوسری ہے نقلِ صحیح، (مجالس خطیب الامت ص ۱۷۵) عقلِ سلیم یعنی صحیح عقل اِدھر اُدھر کی مار کھائی ہوئی

نہ ہو، وہ گھِسی ہوئی نہ ہو کسی قسم کا زہر اس پر آیا ہوا نہ ہو سالم اپنی اصلی حالت پر ہو، خارجی اثر اس میں آیا نہ ہو ایسی عقل عقلِ سلیم کہلاتی ہے، عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، قرآن وحدیث میں اور عقل میں ٹکراؤ وہیں ہوگا جہاں عقل مار کھائی ہوئی ہو اور خارجی اثر اس نے قبول کیا ہو، اگر عقلِ سلیم ہے تو قرآن وحدیث کی ہر بات کو وہ ''آمَنَّا وَسَلَّمْنَا وَصَدَّقْنَا،، کہے گی، ہر بات کو ویلکم کرے گی، ہر بات کو وہ بہت خوشی کے ساتھ قبول کرے گی، اور اگر مار کھایا ہے اس نے کہیں پٹائی ہوئی ہے اسکی، وہ مغرب زدہ ہے، یا کسی قسم کا گند اس کے اوپر پڑ چکا ہے، یا کسی اور تہذیب کا رنگ اس کے اوپر چڑھ چکا ہے جیسے کسی شئی کا ایک رنگ ہے مثلاً سامنے دیوار ہے اس پر سفید رنگ ہے، مگر دیکھنے والے نے پیلا چشمہ پہن لیا ہے، دیکھنے والے نے ہرا چشمہ پہن لیا ہے، دیکھنے والے نیلا چشمہ پہن لیا ہے، یا گلابی چشمہ پہن لیا ہے، اور کہتا ہے کہ شئی کا رنگ لال ہے، یا نیلا ہے، یا گلابی ہے، یا اُدا ہے، تو ہم کہیں گے معاف فرمائیے وہ اس کا رنگ نہیں ہے بلکہ آپ کی آنکھوں پر جو چشمہ چڑھا ہوا ہے اس کا رنگ ہے، اور اُس رنگ سے متاثر ہو کر آپ کی آنکھیں اِس شئی کو دیکھ رہی ہے، ٹھیک اسی طریقہ سے کسی کلچر اور تہذیب سے کسی کی نظریں، اور کسی کی بصیرتیں، کسی کا دل ودماغ، اور کسی کی سمجھ اثر لے چکی ہو اور متاثر ہو چکی ہو اور اس کی روشنی میں وہ قرآن وحدیث کو دیکھتا ہو تو ہم ایسے شخص کے بارے میں کہیں گے کہ اس نے سلیم عقل کے ساتھ قرآنِ کریم کو نہیں دیکھا ہے، متاثر ہو کر دیکھا ہے، اسنے خارجی اثر قبول کیا اور اسکی روشنی میں قرآن وحدیث کو سمجھنا چاہتا ہے، قرآن و حدیث ایسی خارجی روشنی سے متاثر ہونے والی نگاہوں میں اگر کوئی کھٹک پیدا کریں تو وہ نگاہوں کا یا چشمہ کا قصور ہے، قرآن وحدیث کا قصور نہیں ہے، لہٰذا چشمہ پہلے اتار دیں اس کے بعد حقیقت کو دیکھیں تو انشاء اللہ آنکھوں کو ٹھنڈک ہی پہنچے گی، اور دل کو سرور ہی

ہوگا، اور رہنمائی ہی نصیب ہوگی۔

مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا ایک مکاشفہ

تو میں یہ ذکر کرر ہا تھا کہ ایک بات تو یہ ہے کہ اس میں آزمائش ہے، مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکشوفات میں ایک بات کہی ہے فرماتے ہیں کہ: قرآنِ کریم کا علم مجھپر منکشف ہوا میں نے دیکھا کہ ایک سمندر ہے بہت بڑا جس کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا حدِّ نظر تک سمندر ہی سمندر سب طرف اس میں فوارے لگے ہوئے ہیں اور فواروں سے پانی بہت جوش کے ساتھ اُبل رہا ہے یہ گویا انہوں نے دیکھا نظرِ کشفی سے، اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ یہ حروفِ مقطعات جو ہیں قرآنِ کریم کے شروع میں ''الر،، ''الم،، فرمایا یہ حروفِ مقطعات تو وہ فوارے ہیں اور بقیہ مضامینِ سورت وہ سمندر ہیں اور دونوں میں رابطہ یہی ہے کہ فوّارے کا پانی سمندر میں جاتا ہے اور سمندر ہی سے فوّارے میں پانی پہنچ رہا ہے، دونوں میں کوئی تنافس یا توڑ کی شکل نہیں ہے وہ اُسی کی ترجمانی ہے۔

حروف مقطعات کی ۱۶ تاویلات ہیں

اس سلسلہ میں اتنی بات پکی ذہن میں رہے کہ ان کلمات کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں اللہ تعالی ہی بہتر جانتے ہیں، مگر ہاں! تفسیرِ قطعی اور مراد متعین کرنے کی بجائے کچھ تاویلات بھی تقریبِ فہم کیلئے کہی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں کلی طور پر جتنی تفاسیر ہیں ذخیرۂ تفاسیر میں کلی طور پر سولہ (۱۶) تاویلات موجود ہیں (حوالا بالا،ص ۱۵۴) مگر مرادِ قطعی کا ایک بھی ذمہ دار نہیں، حقیقی مراد ایک سے بھی واضح نہیں ہوتی (معالم العرفان فی دروس القرآن، ج ۲ ص ۳۶) یہ بات ذہن میں محفوظ رہے خاص طور سے '' اللہ اعلم

بمرادہ،، جواس کی وضاحت ہے وہ بالکل اپنی جگہ ہے۔

حروفِ مقطعات کا ایک راز

اس میں ایک کام کی بات یہ بھی سنتے چلے کہ عرب کے انسانوں کو اپنی زبان دانی پر دعویٰ تھا، بڑا فخر تھا، اپنے کو سمجھتے تھے ناطق اور متکلم اور دوسروں کو سمجھتے تھے گونگا نہ بولنے والے، قرآنِ کریم نے جوان سے چیلینج کیا ہے اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ ایک عربی جب قرآنِ کریم کھولے گا، تو کھولنے کے بعد وہ دیکھتا ہے، الٓمٓ، یا الٓرٰ، یا الٓمٓصٓ، تو وہ چکر میں پڑتا ہے، اسی لئے انہیں یہ بتلایا گیا کہ ان میں جو حروف ہیں، الف ہے، لام ہے، میم ہے، الف ہے، لام ہے، راء ہے، الف ہے، لام ہے، میم ہے، ص ہے، یہ وہ حروف ہیں جس کو تم اپنی بول چال میں روزانہ بار بار استعمال کرتے ہو، تمہارے کلام میں یہ حروف استعمال ہوتے رہتے ہیں مگر انہی حروف کی ایسی جاذب اور ایسی دلکش دِل کو لبھانے والی ترتیب اگر تم دینا چاہو تو تمہیں اختیار ہے، تم پیش کرو، مگر جب سے قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس وقت سے لیکر آج تک اِس وقت جب بیان ہو رہا ہے کوئی نفر ایسا عرب میں پیدا نہیں ہوا جن کو اپنی زبان پر دعویٰ تھا کہ قرآنِ کریم کی ترتیب کے ہم پلہ جاذبیت اور کشش لئے ہوئے کوئی ترتیب ایسی قائم کرے اور قرآنِ کریم کے سامنے پیش کرے (حوالا بالا، ص ۳۹) کہ قرآنِ کریم نے اگر تین حروف جوڑے ہیں ہم بھی جوڑتے ہیں، قرآنِ کریم نے چار حروف جوڑے ہیں ہم بھی جوڑتے ہیں، حروف ضرور انہوں نے جوڑیں مگر خود انہیں کی زبان جاننے والوں نے کہا کہ جو سلاست اور روانی اور جو مٹھاس اور جو حلاوت اور جو اس میں ادبیت اور جو اس کی کیفیت ہے اور

جو اس میں رعایت ہے، نزاکت ہے وہ ساری چیزیں اِس میں نہیں ہے، گویا وہی کلمات جس کو عرب استعمال کر رہا ہیں وہ ان میں استعمال کئے گئے، مگر وہ ترتیب دینے سے قاصر رہیں اور آج تک قاصر ہیں، یہ معمولی بات نہیں ہے، تو ایک فائدہ اس کا یہ بھی ہے۔

حروفِ مقطعات متکبرین کے تکبر کا توڑ ہے

اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ' الــــر ، اگر کسی آدمی کو اپنے علم پر دعویٰ ہو، اپنے علم پر ناز ہو، غرّہ ہو، موٹے عام لفظوں میں بولوں کہ بھمڑی ہو یعنی وہ سمجھتا ہو کہ میں کچھ جانتا ہوں، تو کتاب اللہ کی بہت سی سورتیں جس کو اِس شان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے شروع کی ہے کہ اُس کو کھولنے کے بعد جب وہ دیکھے گا تو اب وہ اس کی مراد سمجھنے سے قاصر، مطلب سمجھنے سے عاجز، مفہوم کو پانے سے کوتاہ ، وہاں تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں ، سمجھنا یہ اس کے بس کا مسئلہ نہیں ہے، تو اس کو یہ احساس ہوگا کہ میں اپنے کو سمجھتا تھا عالم، میں اپنے کو سمجھتا تھا قابل ، لائق ، فائق ، اور ذی حیثیت و استعداد مگر میری حیثیت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی کتنی سورتیں ایسی ہیں کہ جسے میں کھولتا ہوں اور کھولنے کے بعد اُسے بولتا اور پڑھتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ میں اُس کی مراد کو نہیں سمجھ پاتا، گویا قرآنِ کریم میں حروفِ مقطعات متکبرین کے تکبر کو توڑنے اور مغرورین کے غرور کو توڑنے اور دعوئے ہمہ دانی کرنے والے ایسے سارے انسانوں کے پندار اور غرور کو ختم کرنے کیلئے ایک بہترین نسخہ اور معالجہ ہے کہ انہیں قرآنِ کریم کھولتے ہی اپنی بے کسی کا اعتراف ہو جائے اپنی بے بسی کا اعتراف ہو جائے۔

حکیم سنائی رحمہ اللہ کی حکمت بھری بات

یہی وجہ ہے کہ بعض عارفین نے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم کو کھولکر آپ دیکھے تو

قرآنِ کریم کی کتابت کی ابتداء کہاں سے ہورہی ہے، قرآنِ کریم میں ''**اعوذ باللہ من الشیطا ن الرجیم**،،لکھا ہوا آپ کونہیں ملے گا، پڑھنے کا حکم تو ہے کہ''**فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطن الرجیم**'' (نحل،آیت/۹۸) تعوذ پڑھنے کا حکم ہے مگر میرا بیان ختم ہونے کے بعد آپ قرآنِ کریم کھول کر دیکھ لے تو مصحفِ عثمانی میں ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**،، لکھا ہوا نہیں ہوگا کتابت کے اعتبار سے ''**بسم اللہ**،، سے شروع ہوگا، اسی لئے بولتے بھی ہے بسم اللہ کی ''ب،، سے والناس کی سین تک، حکیم سنائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: بسم اللہ کی ''ب،، سے قرآن کریم کی ابتداء ہے اور والناس کا سین قرآن کی انتہاء دونوں کو ملا لو تو ہوجاتا ہے ''بس،، گویا ہدایت کیلئے اب کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے، قرآنِ کریم ''بس،، ہے یعنی کافی ہے،(مجالسِ خطیب الامت:۱/۱۴۲)

اور میں تو کہا کرتا ہوں بطورِ لطیفہ کے کہ اس دعوی میں دلیل بھی موجود ہے کہ اسی '' بس،،کو اگر آپ الٹ دیں تو ''سب،، ہوجاتا ہے کہ سارے حقائق اور علوم اس کے اندر موجود ہیں اس لئے کہ بس کو الٹنے پر سب ہوجاتا ہے (حوالا بالا) مگر یہ بس چلتی ہے اس کو مت اُلٹنا ورنہ آپ اس کو الٹ دیں تو سب چوپٹ ہی ہوجائے گا، بلکہ لفظِ ''بس،، کو آپ الٹ دیں، تو بسم اللہ کی ''بے،، سے ابتداء ہے اور والناس کی ''سین،، یہ انتہاء ہے،، تو حضرت حکیم سنائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ہدایت کیلئے کلی طور پر قرآنِ کریم کافی ہیں۔

حدیث کا منکر قرآنِ کریم کی مراد کونہیں پاسکتا

حدیثیں اور فقہ اس کی تشریح ہیں اس سے انکار نہیں ہے، جو حدیث شریف کا منکر ہو وہ قرآنِ کریم کی حقیقت نہیں پاسکتا یہ یاد رہیں، یہ ٹھوس دعویٰ ہے اس سے انکار

نہیں کیا جا سکتا ہے، ہاں! کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور ایران تُران کی کتاب کی ضرورت ہدایت کے لئے نہیں ہے۔

کتاب اللہ کی ابتداء ''ب،، سے کیوں ہوئی، اس کی ایک حکمت

سوال یہ ہے کہ کتاب اللہ کی ابتداء ''ب،، سے کیوں ہوئی، تو بعض عارفین لکھتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ آپ جب الف (ا) لکھیں گے تو الف ایسا کھڑا ہوتا ہے بھائی الف کی صورت تو دیکھی ہے نا! الف سے الفت تو ہے ہی، الف کی شکل یہ ہے کہ بالکل کھڑا ہوا، اور (با) لکھیں گے تو وہ اس طرح سے ہے (ب) لیٹا ہوا، پڑا ہوا تو الف ہے کھڑا ہوا اور با ہے پڑا ہوا، لکھتے ہیں بعض عارفین کہ الف صورتاً ظاہراً اپنے کو لئے ہوئے ہے اور ب صورتاً اور ظاہراً اپنے کو گرائے ہوئے ہے، گویا ادھر اشارہ ہے کہ قرآنِ کریم کھولنے کے بعد پہلا لفظ اس بات کی تعلیم دے رہا ہے قاریٔ قرآن کو کہ اپنے کو مٹاؤ اور گراؤ خدائی احکام کے سامنے تو خدا شوکتیں عطا فرمائیں گے اور خدا عزتیں نصیب فرمائیں گے، تو ''بسم اللہ،، کا پہلا حرف اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ اپنے کو مٹا دو گویا قرآنِ کریم پڑھنے کے بعد مٹانا تو اپنی جگہ ہے، اس کا آغاز اس کی اسٹارٹنگ اس کی ابتداء اور اس کی شروعات بھی اس بات کی تعلیم و تلقین کر رہی ہے کہ اپنے کو مٹا دو ان احکام کے سامنے اور اس کلام کے سامنے تو برکتیں ظاہر ہوں گی۔

قرآنِ کریم بندوں کو خدا سے ملانے کیلئے آیا ہے

اور ''ب،، کا فائدہ یہ لکھا ہے کہ باء (ب) آتا ہے ملانے کیلئے ''الباء للالصاق،، باء کے معنی ہے ملانے کے (مسائل النحو والصرف ص ۳۳) اسی لئے

لکھا ہے کہ ساری آسمانی کتابوں کا علم چار کتابوں میں ہیں، تورات، انجیل، زبور فرقان، اور پھر سب کا خلاصہ قرآنِ کریم میں ہیں، اور پورے قرآنِ کریم کے علم کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''**بسم اللہ الرحمن الرحیم**'' میں ہے اور ''**بسم اللہ الرحمن الرحیم**'' کے سارے علم کا خلاصہ بسم اللہ کی باء (ب) میں ہے اور با (ب) نقطہ میں اور نقطہ قدرت میں غائب ہے، (طشت جواہر ص ۲۶ بحوالہ سبع سنابل) یا باء (ب) آتا ہے ملانے کیلئے گویا منشاء یہ ہے کہ آسمان سے آنے والی یہ کتاب اس لئے آئی ہے تا کہ بندے خدا تعالی سے جُڑ جائیں، تو قرآنِ کریم بندوں کو خدا تعالی سے ملانے کیلئے آیا ہے۔

وصی الامت رحمہ اللہ کا ایک قیمتی ملفوظ

ہمارے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے مجھے الحمدللہ تقریباً دو سال ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے، فرمایا کرتے تھے کہ: حق تعالیٰ فرماتے ہیں'' **قد جاء کم من اللہ نور و کتٰب مبین**'' (مائدہ،۱۵) تمہارے پاس نور آیا، تمہارے پاس برہان آیا، تمہارے پاس کتاب آئی، یہ نہیں کہ تمہیں جانا پڑا لینے کیلئے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوئی کہ کتاب اور نور تو وہاں سے چل کر تمہارے پاس آئے اور تم ذرا سِرک کر خدا تک پہنچنے کی کوشش نہ کرو اپنی طبیعتوں اور عادتوں پر جمے رہو، ٹھہرے رہو، اس سے زیادہ محرومی کی کوئی بات نہیں ہوگی، کہ خدا تعالی نے اپنا کلام بھیجا، تو وہ تو آیا، اور تم اب آگے سِرکنا نہ چاہو اور کوشش کرنا نہ چاہو تو ظاہر ہے کہ اس کا حشر کیا ہوگا، تو ایک فائدہ اس کا یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اپنے سارے غرور کا پتہ چل جائے گا اور اس کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ میں نہیں جانتا اس کو اپنی

جہالت کا اعتراف کرنا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ ''اللہ اعلم بمرادہ، بس آج اتنے ہی پہ اکتفاء کریں۔

درس نمبر (۳)

الحمد لله و کفی و سلام علیٰ عباده الذین اصطفی، امابعد ،

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم،بسم الله الرحمن الرحیم ،

الٓرٰ ،تلک آیٰت الکتاب المبین ،انا انزلنه قرانًا عربیا لعلکم تعقلون، نحن نقص علیک احسن القصص بمااوحینا الیک هذا القرآن، وان کنت من قبله لمن الغفلین، (یوسف،آیت : ۱ / ۳) **صدق الله مولانا العظیم.**

کل جدید لذیذ

بزرگانِ محترم! کل یہ گفتگو چل رہی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کی بعض سورتوں کی ابتداء ایسے انداز سے فرمائی ہے کہ جن میں حروف تو وہ ہیں جسکو اہلِ عرب روز استعمال کرتے تھے ،مگر ترتیب اس کی اتنی پیاری ہے اور ایسی بلیغ ہے کہ اس جیسی ترتیب اختیار کرنے سے وہ عاجز اور قاصر تھے۔

بعض اربابِ تفسیر نے یہ لکھا ہے کہ ایک منشاء یہ بھی ہے کہ کلام نازل ہوا اہلِ عرب کے سامنے تو ان کو متوجہ کرنا ہے (تفسیرِ عزیزی،ص۱۵۷) کیونکہ جب آدمی کوئی نئی اور انوکھی چیز دیکھتا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یہ ایک فطری اور نفسیاتی بات ہے کہ انسان کسی نئی اور انوکھی چیز کی جانب متوجہ ہوتا ہے، تو حروف کی یہ ترتیب اپنے انوکھے پن کی وجہ سے ان کے حق میں بالکل البیلی تھی ، انوکھی تھی ، نئی تھی ، جس کا منشاء یہ تھا کہ وہ ان حروف کے ذریعہ سے قرآنِ کریم کی طرف متوجہ ہو جائے ، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب یہ کلمات پڑھے جاتے تھے تو ان کے کان قرآنِ کریم کی طرف لپکتے اور متوجہ ہوتے تھے، حافظ ابن تیمیہ حنبلی حرانی رحمہ اللہ اور علامہ زمخشری رحمہ اللہ جیسے بزرگوں نے بھی یہ وجہ نقل

کی ہیں کہ طبیعتوں کو کھینچنے اور دلوں کو مائل کرنے اور مزاجوں کو موڑنے اور ذہنوں کو ادھر متوجہ کرنے کی غرض سے یہ ترتیب اللہ جل شانہ نے اختیار فرمائی ہیں۔

حروفِ مقطعات یہ سورتوں کے نام ہیں

بعض بزرگوں سے یہ منقول ہیں کہ یہ سورتوں کے نام ہیں (تفسیرِ عزیزی ص۱۵۶) جیسے سورۂ بقرہ کا نام ''الٓـم''، اسی طریقہ سے سورۂ یوسف کا نام ''الٓـر''، اور بعض سلفِ صالحین سے منقول ہیں کہ یہ قرآنِ کریم کے اسماء ہیں۔ (حوالا بالا) قرآنِ کریم کے تقریباً پچپن (۵۵) نام تفسیرِ کبیر میں امام رازی رحمہ اللہ نے شمار کروائے ہیں یہ تو وہ اسماء ہیں جو قرآنِ کریم کے درمیان میں ہیں (البرھان ج ۱ ص ۲۷۳، اسرار کائنات ص ۲۸۳) لیکن ان کو بھی ناموں سے تعبیر کیا گیا ہیں، گویا قرآنِ کریم کا ایک نام ''کھیعص''، قرآنِ کریم کا یک نام ''المر''، قرآنِ کریم کا یک نام ''الر''، قرآنِ کریم کا یک نام ''الم''، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ منقول ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں اس لئے کبھی کبھی دعا میں وہ فرماتے تھے کہ ''یا کٓھیٰعٓص''، گویا ان سورتوں کی ابتداء میں جو کلمات ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہیں وہ فرماتے تھے کہ: یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں (حوالا بالا)

بہرحال، وہ قرآنِ کریم کے نام بھی ہوسکتے ہیں، سورتوں کے نام بھی ہوسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نام بھی ہوسکتے ہیں، عربوں کو عاجز کرنے کیلئے بھی کہ روزانہ تم ان کلمات کو استعمال کرتے ہو اور پھر ایسی ترتیب نہیں دے سکتے، تو یہ منشاء بھی ہوسکتا ہے، طبیعتوں کو متوجہ کرنا اور راغب کرنا یہ بھی ہوسکتا ہے، اور اس کے علاوہ اسرار وسر ہیں بہت ساری حکمتیں ہیں جو ان میں موجود ہیں۔

حروفِ مقطعات قرآنِ کریم کی صداقت کی دلیل ہے

ایک بات کام کی اخیری یہ سن لے کہ جہاں کہیں ایسے حروف استعمال ہوئے ہیں عام طور پر قرآنِ کریم میں اس کے بعد کتاب کا تذکرہ ہے قرآنِ کریم کا تذکرہ ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی صداقت کے لئے اور اس کی سچائی کیلئے دلیل کے طور پر اسے پیش کیا ہے جیسے مثلاً فرمایا'' الٓمٓ،'' ذلک الکتاب،، یا فرمایا'' الٓرٰ،، کتب احکمت ایته،، یا فرمایا'' المٓصٓ،، کتب انزل الیک، ، یا جیسے اسی سورت میں فرمایا'' الٓرٰ، تلک ایت ا لکتب،، تو عام طور پر قرآنِ کریم میں جہاں کہیں اس قسم کے حروف کی ترتیب آپ کو ملے گی جس کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں اس کے بعد کتاب کا اور قرآنِ کریم کا ذکر ہے، گویا قرآنِ کریم کی صداقت اور سچائی کیلئے بطورِ دلیل کے یہ بات پیش کی گئی ہے۔

حروفِ مقطعات سے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کے عطایا کی طرف اشارہ ہے

بعضے بزرگوں سے یہ منقول ہیں کہ خود ان حروف میں اللہ تعالیٰ کے اسموں کی طرف اشارہ ہے(ناموں کی طرف)۔ مثلاً'' الف،، میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف،'' لام،، میں اشارہ ہے لطیف کی طرف لطف ومہربانی ،اور'' راء،، میں اشارہ ہے رحمٰن کی طرف، یا'' راء،، میں اشارہ ہے رؤف کی طرف، یا'' راء،، کے اندر اشارہ ہے رحیم کی طرف۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کے ناموں کی طرف اشارے موجود ہے، اور بعض عارفین نے اس سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کی طرف اشارہ ہے'' الف،، میں

اشارہ ہے اعلاء اللہ اللہ تعالی کی نعمتیں ''لام،، میں اشارہ ہے لطف اللہ اللہ تعالی کی عنایتیں ''میم،، میں اشارہ ہے مجد اللہ اللہ تعالی کی طرف سے عطا فرمودہ بزرگی، اس کی عنایتیں، اور اس کی نوازشیں جو ہیں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے ناموں کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عطا ہیں جو بخشش ہیں جو عنایت ہیں اس کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، اور بعض بزرگوں سے یہ منقول ہیں کہ ان کو ملانے سے اسماء بنتے ہیں جیسے مثلاً ''الــر،، اس کو آپ لکھیں تو یوں الف، لام، راء، اس کے بعد **حم** لکھدے اور پھر نون (نٓ) لکھدے تو ''**الرحمن**،، بن جائے گا، تو آپس میں ان کو جوڑنے سے خود مستقل چیزیں بنیں گی، بہر حال، یہ علمی ابحاث ہیں مجھے ان کی تفصیل میں نہیں جانا ہے، بہت مختصراً اشارے آپ کے سامنے کئے ہیں۔

کائنات میں دو قسم کی نشانیاں ہیں

حق تعالیٰ اس کے بعد فرماتے ہیں'' **تلک آیت الکتب المبین**،، کہ یہ روشن کتاب اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں، تلک کا لفظی ترجمہ ہے وہ، اور مراد ہے اس سے یہ عظمت کیلئے اور اہمیت کیلئے یہ بات کہی گئی ہے۔

بزرگانِ محترم! یہاں ایک خاص بات ذہن نشیں رہیں کہ جب آپ قرآنِ کریم کی تلاوت کریں گے تو بار بار لفظِ'' آیات،، آپ کے سامنے آئے گا، آیات اللہ، یا تلک آیٰت الکتاب، آیات کا لفظ بولتے ہیں نا کہ اتنی آیتیں پڑھیں، آیات جمع ہے آیت کی، آیت کا ترجمہ ہے علامت، نشانی، کہ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک مسافر چلتا ہے سفر کرتا ہے تو بورڈ لگا ہوا ہوتا ہے نشانی، کہ بھائی ادھر مڑ جاؤ ادھر چلے جاؤ، اور وہ روبٹ ہوتا ہے کہ یہاں رک جاؤ، اور سبز نشان ہوتا ہے کہ چلے جاؤ، اور لال نشان ہوتا ہے تو رک

جاؤ، نشانیاں ہوتی ہیں، علامتیں ہوتی ہیں، یا جیسے مثلاً پتھر پر سفید رنگ لگادیئے پہلے غیر متمدن اقوام میں یہ طریق تھا اور اب بھی بہت سے ملکوں میں ہے، تو آیت کے معنی آتے ہے نشانی کے، اس کی جمع ہے آیات، اس کے معنی ہے علامت اور نشانی، اللہ جل جلالہ کی کائنات میں دو قسم کی نشانیاں ہیں، دو قسم کی آیتیں موجود ہیں، ایک آیات علمی ہیں، اور ایک آیات عملی ہیں، علمی آیات جو علماً انسانوں کو رہنمائی کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو وہ قرآنِ کریم ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''هٰذا كتابنا ينطق عليكم بالحق،، (جاثية، آیت: ۲۹) یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے سچ سچ بولتی ہے، جیسے کسی کے پاس کوئی خط آجائے اور اس میں ہو کہ بھائی تم کو یہ کرنا ہے یہ نہیں کرنا ہے۔

تیس پاروں پر مشتمل خدا تعالی کا انسانوں کے نام ایک خط

امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ جب کسی کے پاس کوئی ٹیلی گرام آیا، کسی کے نام کوئی خط آیا، کسی کے نام کوئی لفافہ آیا اور وہ اس کے مضمون کو نہ جانتا ہو اس کے مفہوم کو نہ سمجھتا ہو تو آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں کے پاس لیکر دوڑتا ہے کہ یہ میرا ٹیلی گرام ہے اس کو پڑھ کر بتاؤ کہ اس میں کیا لکھا ہے، کیونکہ جب تک معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک طبیعت میں تشویش رہتی ہے، اور بے چینی رہتی ہے، اور یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس میں جو بات ہوگی زیادہ سے زیادہ کوئی خوشی کی بات ہوگی، یا غم کی بات ہوگی، اور خوشی بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی بچہ پیدا ہوا ہوگا، یا یہ کہ کوئی امتحان میں کامیاب ہوا ہوگا، یا یہ کہ کوئی ڈلّہ مال و دولت مل گیا ہوگا کسی کو، اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہے اس دنیا میں، اور غم کی خبر یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی کی موت ہوگئی ہو، بڑے

سے بڑا غم یہی ہے، یا یہ کہ کوئی امتحان میں فیل (ناکام) ہوگیا ہو، یا کوئی اور ایمرجنسی حادثہ ہوگیا ہو، تو خوشی کی خبر یا غم کی خبر اور خوشی بھی محدود اور مختصر اور غم بھی محدود اور مختصر، مگر آدمی اس مضمون کو سمجھنے کیلئے اور اس پر واقف ہونے کے لئے بے چین ہو کر دوسروں کے پاس دوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائی یہ ٹیلی گرام پڑھ کر بتاؤ، یہ خط پڑھ کر بتاؤ، یہ لفافہ پڑھ کر بتاؤ، امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اللہ تعالی کا بڑا انعام ہے اللہ جل جلالہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے تمام فرشتوں میں مکرم فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ اور یہ جملے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بھی ہیں کہ حضرتِ جبرئیل کے ذریعہ جو تمام فرشتوں میں مکرم ہیں، اور مہینہ نہایت بابرکت رمضان المبارک کا ''شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن،، (بقرۃ، آیت: ١٨٥) اور مکان نہایت مکرم جس کو حرم شریف سے تعبیر کیا جاتا ہے مکہ شریف، اور جن کے پاس لائی گئی ہے باتیں وہ تمام انسانوں میں سب سے بہترین انسان، تو زمانہ بہترین، مکان بہترین، لانے والے بہترین، جن پہ لایا گیا وہ بہترین، اور جو مضمون اور کتاب ہے وہ ساری آسمانی کتابوں میں سب سے بہترین سب سے اشرف، تو اشرفِ کتب، اشرفِ رسل کے ذریعہ سے، اشرف مکان میں، اشرف زمان میں، اشرف انسان پر، حق تعالی کی طرف سے نازل فرمودہ ہے، تو یہ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھ رہے ہیں (فوائد عثمانی ص ٣١١) امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا خط ہے تیس پاروں پر مشتمل یہ خط انسانوں کے نام ایک پیغام ہے خدا تعالی کا، اور تفصیلی پیغام ہے کہ یہ، یہ، یہ، چیزیں تمہیں کرنی ہیں اور یہ، یہ، یہ چیزیں تمہیں چھوڑنی ہیں مگر خدا تعالی کی طرف سے آئے ہوئے یہ لفافے اور خدا تعالی کی طرف سے آئے ہوئے اس خط کے مضمون سے لوگ ناواقف ہیں، اس کو نہیں جانتے اور اس کو نہیں سمجھتے، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ انسانوں میں بے چینی ہو جاتی اور خود دوڑتے اور پہنچتے جاننے

والوں کے پاس کہ ہمیں معلوم ہو جائیں کہ ہمارے مہربان رب کی طرف سے اور ہمارے مشفق اور رحمٰن پروردگار کی طرف سے ہماری طرف آئے ہوئے اس خط کا مضمون کیا ہے، ان کا خطاب ہم سے کیا ہیں، وہ ہم سے کیا کہنا چاہتے ہیں، وہ کچھ کروانا چاہتے ہیں، یا کسی چیز سے ہم کو بچانا چاہتے ہیں، یا وہ ہم سے متعلق کوئی مستقبل اور فیوجر کی خبر دینا چاہتے ہیں، یا کوئی بشارت ہے، یا کوئی ڈر کی چیز ہے، کیا پیغام ہے، یہ ہم سمجھنا چاہتے ہیں، اس بے چینی کو لیکر ایک آدمی جاننے والے کے پاس پہنچتا اور اس کو سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ خط میرے نام پہنچا ہے اور کتنے اچھے اچھے اور قیمتی اور اعلی واسطوں سے پہنچا ہیں مجھے اس کو سمجھا دو۔

مسلم قوم کے ڈاؤن ہونے کا سبب کیا ہے؟

تو میں ذکر کر رہا تھا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ خدا تعالی کی طرف سے آئے ہوئے خط کے لئے لوگوں میں بے چینی نہیں ہے انسانوں کی طرف سے آئے ہوئے خط کے مضمون کو جاننے کیلئے تو بے چین ہوتا ہے کہ بھائی یہ خط آیا ہوا ہے اس کو پڑھ دو پتہ نہیں اس میں کیا خبر ہے، بے چین ہوتا ہے آدمی کہ اس میں نہ معلوم کیا خبر ہے، کوئی خطرے کی خبر ہے یا خوشی کی خبر ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں وہ بشارتیں ہیں جن کی تفصیلات جناب نبی کریم ﷺ نے جنت کی نعمتوں کی شکل میں کی ہیں، اللہ تعالی کی کتاب میں ڈر کی وہ آیتیں ہیں جن کی تفصیلات جہنم کے عذابات کی شکل میں جناب کریم ﷺ نے کی ہیں، اس وجہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ کتاب اللہ سے بے توجہی آج مسلم قوم کے ڈاؤن ہونے اور ان کے پست ہونے اور ان کے اپنے مقام سے گرنے اور دنیا میں پٹنے اور لٹنے اور دنیا میں ضائع ہونے کا سبب بنی ہوئی ہے، اسی لئے کہنے والے نے کہا ؎

درسِ قرآن نہ زمانے نے بھلایا ہوتا

یہ زمانہ نہ زمانے نے دکھایا ہوتا

آج جو دن ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اگر قرآنِ کریم کو ہم نے نہ چھوڑا ہوتا، قرآنِ کریم کو ہم نے پکڑا ہوتا، تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا، لیکن قرآنِ کریم کو چھوڑنے کے نتیجہ میں آج ہم سے سب چیزیں جاتی رہیں۔

بزرگی تقویٰ میں ہے، نہ کہ پیسوں میں

ہم خوش ہولیں ڈالروں اور پاؤنڈ کی کثرت پر مگر ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ قوم جن کو اپنے ملک سے نکالنے کیلئے ہمارے بزرگوں نے سالہا سال نہیں صدیوں محنتیں کی ہیں، ان کی غلامی کر کے اگر ہم کچھ ڈالر اور پاؤنڈ پیدا کرلیں، تو یہ شرف کی بات نہیں ہے، بزرگی تقویٰ میں ہے، علم میں ہے، چار پیسوں کے کما لینے میں اگر کوئی آدمی بزرگی سمجھتا ہے تو وہ بیچارہ دھوکہ میں ہے، وہ غلط فہمی کا شکار ہے، اس کو حقیقت ہی معلوم نہیں کہ بڑائی اور بزرگی کس چیز کا نام ہے، اس نے چند سکوں کو بڑائی اور بزرگی سمجھ لیا جو موت تک کام دینے والے تھے۔

خارجی کمال پر نہ اتراؤ، اپنے اندر کمال پیدا کرو

افلاطون کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا ماہر حکیم گذرا ہے وہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں رات دن جنگلوں میں چکر لگاتا اور شام کے ٹائم آ کر تھک تھکا کر بیچارہ لیٹتا اور فوراً آنکھ لگ جاتی، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ سڑک کے کنارے بیٹھا تھا اور دن بھر کا تھکا ہوا اس کی آنکھ لگ گئی، اس زمانہ میں کوئی بادشاہ تھا اس کی سواری جب نکلی ہے تو اس کا جو سیکورٹی گارڈ تھا جو آگے آگے چل رہا تھا وہ آواز لگا رہا تھا کہ ہٹو، بچو،

بھاگو، تو اس نے اس کو بھی اٹھایا مگر بہت گہری نیند تھی آنکھ کھلی پھر لگ گئی، بہر حال پھر اس کو جھنجوڑ کر اٹھایا، یہاں تک کہ بادشاہ قریب پہنچ گیا، اس نے افلاطون کو دھکّا دیکر کہا اور بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ لات مار کر بادشاہ نے کہا کہ تم پہچانتے نہیں ہم کو کہ ہم کون ہیں؟ تو اس پر افلاطون نے آنکھ ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! میں کوشش کر رہا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کس جنگل کے جانور رہے، تو وہ کہنے لگا کہ ہیں! میں اتنا بڑا بادشاہ ملک کی کنجیاں اور چابیاں میرے ہاتھ میں ہے ملک کا اقتدارِ اعلی اور بڑائی میرے ہاتھ میں ہے اور تم مجھے جنگل کا جانور کہتے ہو، تو اس پر افلاطون نے کہا کہ ذرا سنبھل کر بیٹھیں اور میری بات سنیں، بادشاہ سے افلاطون نے کہا کہ تم کو جس دولت پر ناز ہے ان دولتوں کے خزانوں کی کنجیاں اگر کوئی فوجی آپ کے ہاتھ سے چھین لیں تو آپ جو ہے مفلس اور قلّاش ہو جاؤ گے اور تنگ دست ہو جاؤ گے، جس کرسی پر تمہیں ناز ہے اگر دھکّا دیکر اس کرسی سے تمہیں نیچے اتار دیا جائے تو کسمپرسی میں پڑ جاؤ گے اور بیکسی پیدا ہو جائے گی کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا، کرسی سے تمہیں عزت ملی ہے، تمہاری پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ تمہاری وجہ سے کہ کرسی کو عزت نصیب ہو، جس تاج پر تمہیں فخر وغرور ہے اگر تمہارے سر سے وہ نکال لیا جائے تو تمہارا کوئی ویلو اور تمہارا کوئی وزن اور تمہاری کوئی پوزیشن، مقام اور کوئی حیثیت معاشرے میں تمہاری باقی نہیں رہے گی، اور جس فوج کی طاقت پر تمہیں ناز وغرور ہے اگر وہ تمہاری باغی ہو جائیں تمہارے خلاف ہو جائیں تو پھر تمہاری ساری طاقتیں ختم ہیں اور تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے، تو خزانوں کی جھنکاریں، دولتوں کی کثرتیں، تاج کی چمک دمک، کرسی کا غرّہ یہ ساری حیثیتیں تمہارے لئے سب خارجی چیز ہیں، سوال یہ ہے کہ تم نے اپنے اندر کونسا جوہر پیدا کیا ہے، اپنے اندر کونسا کمال پیدا کیا اپنے اندر کونسی ایسی قابلیت پیدا کی ہیں (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۴ ص ۵۱۷) مؤمن

تو اس عالم میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اپنے اندر یہ کمال پیدا کریں کہ ملک الموت کا جھٹکا اور موت کا کھٹکا اور قیامت کا لٹکا یہ ساری چیزیں اس پہ اثر انداز نہ ہو، قبر سے اُٹھنے کے بعد بھی وہ انہیں کمالات کے ساتھ ہو تو یہ باہر کا کور اور باہر کے لفافہ پر آدمی کا فخر کرنا بہت بڑی نادانی کی بات ہے، اس لئے قرآنِ کریم کے علم کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کی عظمت پہچاننے کی ضرورت ہے۔

آیات کی دو قسمیں ہیں

میں یہ ذکر کررہا تھا کہ آیات کی دو قسمیں ہیں، ایک علمی آیت یہ قرآنِ کریم یہ سارا کا سارا علمی آیتیں ہیں، یہ خدا تعالی کی طرف سے آیا ہوا ایک پیغام ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا اپنے بندوں کے نام ایک خط اور لفافہ ہے جو تیس (۳۰) پاروں پر مشتمل ہیں آدمی اسے سمجھیں۔

اور دوسری عملی آیتیں ہیں پہاڑوں کا وجود، چاند کا وجود، سورج کا وجود، آسمان کا وجود، زمین کا وجود، رختوں کا وجود، چلنے والی ہواؤں کا وجود، انسانوں کا وجود، یہ ساری کائنات میں بکھری ہوئی چیزیں اللہ جل جلالہ کی عملی آیتیں ہیں اس کی قدرت پر دلالت کرنے والی اور اس کے کمالات پر دلالت کرنے والی اور اس کے ایک ہونے پر رہنمائی کرنے والی ہیں، تو گویا آیات کی دو قسمیں ہوئیں، ایک علمی آیت، اور دوسری عملی آیت، پورے قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے بار بار اللہ تعالیٰ نے آیات کا تذکرہ فرمایا ہیں، دیکھوں راستے کے نشانات کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے تا کہ آدمی ان سے راستے کے نشانات کی حقیقت کو سمجھ سکے اور اسکے نتیجہ میں منزلِ مقصود تک پہنچ سکے، اگر راہ کا نشان آدمی خاطر میں نہ لائے اور راستے کے لگے ہوئے سگنل کو اور راستے کی لگی ہوئی علامتوں

کو آدمی گردانتا نہ ہو تو یقیناً وہ ماخوذ ہوگا اور پکڑا جائے گا، اور وہ منزلِ مقصود تک سلامتی کے ساتھ نہیں پہنچ سکتا، اسی لئے قرآنِ کریم نے خدا تعالی تک پہنچنے کی جتنی صحیح راہیں ہیں ان تمام باتوں کو واضح طور پر کھول دیا ہے اور جناب نبیٔ کریم ﷺ نے احادیث میں اس کی وضاحت فرمائی ہیں، اور پھر فقہاء نے اس کی وضاحت فرمائی، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ آیات اللہ کی عظمت آدمی سمجھ لے، تو دو قسم کی آیتیں ہیں، ایک علمی آیت، اور دوسری عملی آیت۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالی نے شفقت کا انداز اختیار کیا ہے

فرماتے ہیں کہ: ''تلک آیت الکتاب المبین،، یہ ایک واضح کتاب کی آیتیں ہیں، روشن کتاب کی آیتیں ہیں، اور ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام آیا اس کے اندر کوئی گنجلک پن نہیں ہے کہ کوئی بات ایسی مبہم کہہ دی ہو کہ سمجھ میں نہ آتی ہوں، کوئی بات ایسی کہہ دی ہو جس میں کچھ اینچ پینچ ہو صاف صاف کھول کھول کر قرآنِ کریم نے ایک ایک بات کو کئی کئی طریقہ سے سمجھایا ہے اور شفقت کا انداز اختیار کیا ہے (ملفوظاتِ حکیم الامت) دیکھو! ایک ہے ضابطہ، قانون، اور ایک ہے رابطہ، اگر اللہ تعالیٰ ضابطہ سے کام لیتے تو پورے قرآنِ کریم میں نماز کا ایک ہی جگہ تذکرہ ہوتا، اگر ضابطہ سے اور قانون سے کام لیتے تو اس صورت میں پورے قرآنِ کریم میں ایمان لانے کا ایک ہی جگہ ذکر ہوتا، زکوٰۃ دینے کا ایک ہی جگہ تذکرہ ہوتا، سچائی کا ایک ہی جگہ ذکر ہوتا، گناہوں کے چھوڑنے کا ایک ہی جگہ تذکرہ ہوتا، لیکن قرآنِ کریم نے بجائے ضابطہ کے اور قانون اختیار کرنے کے نہایت شفقت اور نہایت محبت سے کام لیا ہے اور اللہ جل شانہ نے بار بار ہمیں ایک چیز سمجھائی ہیں تا کہ ذہن نشین ہو جائیں، دل نشین

ہو جائیں اور راہِ راست پر آ جائیں، اگر صرف قانون اختیار کیا جاتا تو ایک مرتبہ کہنا کافی تھا، مگر اللہ تعالیٰ کی شفقتوں اور عنایتوں پر قربان جائیے کے بار بار سمجھایا ہے۔

قرآنِ کریم کی وجہ تسمیہ کئی ہیں

تو فرماتے ہیں کہ یہ روشن اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں، اور پھر فرمایا ''انا انزلنہ قراٰنا عربیا '' ہم نے اس قرآن کو نازل کیا جو پڑھا جاتا ہے، قرآنِ کریم کی وجہ تسمیہ کئی ہیں، منجملہ ان میں کے '' قرن،، ہے '' قرن،، میں ملنے کا مفہوم ہے کہ قرآنِ کریم بندوں کو خدا تعالیٰ سے ملانے کیلئے آیا ہے، اس قرآنِ کریم کو ہم نے عربی زبان میں نازل کیا ہے، عربی کے معنی آتے ہیں واضح ہونے کے، صاف ہونے کے، (لغات القرآن ج۴ص ۲۶۸) اسی لئے زبر، زیر، پیش کو اعراب کہتے ہیں کہ جو مراد گنجلک ہے اور واضح نہیں ہے اس زبر، زیر، پیش، اور اعراب کی وجہ سے وہ مراد کھل جایا کرتی ہے، تو عربوں کی کیفیت یہ تھی کہ اپنی مراد کو اور اپنے دل کی بات کو اتنے واضح طور پر نقل کرتے تھے اور بیان کرتے تھے کہ اپنے مقابل میں ساری دنیا کے انسانوں کو عجم سمجھتے تھے، فرماتے ہیں '' انا انزلنہ قراٰنا عربیا،، ہم نے قرآنِ کریم کو عربی زبان میں نازل کیا، لعلکم تعقلون ☆ تاکہ تم قرآنِ کریم کی حقیقت کو سمجھ سکو اور قرآنِ کریم کے منشاء کو سمجھ کر منزلِ مقصود کو پا سکو، یہ ابتدائی باتیں حق تعالیٰ بطورِ ترغیب کے فرما رہے ہیں کہ بعد میں آنے والا قصہ اور بیان کیا جانے والا واقعہ لوگ غور کے ساتھ سنیں، اور اس سے جو نتائج ہیں وہ اخذ کریں۔

ہر قصہ سے کوئی نتیجہ مقصود ہوتا ہے

دیکھیں! قصہ اور واقعہ کو قرآنِ کریم نے کبھی اس انداز سے بیان نہیں کیا کہ

آدمی اسکی دلچسپی میں گم ہوکر رہ جائے، ہمیشہ کسی واقعہ سے کوئی نتیجہ مقصود ہے، اور ہمیشہ کسی بات سے کوئی عبرت مقصود ہے، حتیٰ کہ کسی بات کی خبر دی ہے تو اس خبر میں بھی کوئی نتیجہ مقصود ہوتا ہے، اس کی میں آپ کو ایک مثال دوں آپ مسجد کے باہر راستہ پر کھڑے ہوجائے اور آنے والے سے کہیں کہ آگے بہت بڑا کالا سانپ ہے، آگے بہت بڑا کالا ناگ ہے، یہ ایک خبر ہے، آپ اطلاع دے رہے ہیں، مگر اس خبر کا مقصد کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ سامنے والے کو آپ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ آگے تشریف نہ لے جائیں، یا مثلاً آپ یہ کہیں کہ فلاں مقام پر انعام تقسیم ہورہا ہے فلاں مقام پر فلاں فائدہ حاصل ہورہا ہے، یہ ایک خبر ہے، اس خبر کا منشاء یہ ہے کہ گویا آپ تلقین کرنا چاہتے ہیں اور ترغیب دینا چاہتے ہیں کہ آپ جایئے ضرور، تو قرآنِ کریم نے ایک مقام پر فرمایا'' قل،، آپ کہئے، **ھو اللہ احد**☆ (سورۂ اخلاص، آیت، ۱) اللہ ایک ہے، یہ ایک خبر ہے، مگر دنیا کے انسانوں کو اس خبر میں یہ فائدہ بتانا مقصود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک ہے تو تم اسے مانو بھی ایک، یہ غلط بات ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک ہے اور تم اسے ایک سے زیادہ مان کر شرک میں مبتلا ہوجاؤ، تو اللہ میاں خبر دے رہے ہیں کہ اللہ ایک ہے لہذا تمہارے ذمہ یہ ہے کہ تم اسے ایک مانو، ٹھیک اسی طریقہ سے آگے جو واقعہ بیان فرمارہے ہیں حق تعالیٰ شانہ اس واقعہ سے جو کچھ نتائج ہیں ان نتائج کو سمجھنے کیلئے اپنی سلیم عقل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے جو ٹھیک اور درست طریقہ پر چلے، فرماتے ہیں کہ: ہم نے اس کو واضح زبان میں نازل کیا، عربی زبان میں نازل کیا، جو تمام زبانوں کی سردار ہے تاکہ تم اسے سمجھو اور منشاء کو پاسکو، اِسے آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کے سلسلہ میں ایک تمہید سمجھ لے جس کا تذکرہ آگے ہورہا ہے اور لوگوں کو تشویق اور شوق دلایا گیا کہ اب جو واقعہ بیان ہوگا حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کا وہ اپنے اندر بہت سے نتائج اور بہت سی عبرتوں کو

لئے ہوئے ہیں۔

سورۂ یوسف کے فوائد

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسکے بڑے بڑے فوائد ہیں، بلکہ بعض حدیثوں میں ہے کہ سورۂ یوسف اگر غلاموں کو پڑھائی جائے تو ان کی غلامی ختم ہوجائے، سورۂ یوسف کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ سورۂ یوسف اگر کوئی شخص پڑھتا رہے تو اس کی کڑکی دور ہوجائے اس کی جو ہے تنگ دستی دور ہوجائے اور خدا تعالی اس کو غنا کی شکلیں عطا فرمائیں گے، سورۂ یوسف کا ایک فائدہ یہ ہے کہ دلوں کو اطمینان نصیب ہوگا، اور جو سورۂ یوسف کا وِرد کرے اور اس کے تقاضے پر چلے تو وہ کیسا ہی ذلیل ہو اللہ تعالیٰ اسے عزت عطا فرمائیں گے، سورۂ یوسف کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ گھر سے بے گھر ہو اور وطن سے بے وطن ہو مگر سورۂ یوسف کا وِرد رکھے آدمی تو حق تعالیٰ اسے اپنے اقرباء سے اور اپنے اعزاء سے اور اپنے رشتہ داروں سے اسے ملائیں گے، یہ سارے فوائد سورۂ یوسف کے لکھے ہیں، بہرحال، سورۂ یوسف میں بڑے بڑے علوم ہیں۔

یہ واقعہ کل انشاء اللہ شروع ہوگا، اللہ تعالی سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں، اور اپنی مرضیات پہ چلائیں، آمین۔

درس نمبر (۴)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ باله من الشیطان الرجیم،بسم الله الرحمٰن الرحیم

نحن نقص علیک احسن القصص بمااوحینا الیک هذا القرآن،وان کنت من قبله لمن الغفلین ☆ اذقال یوسف لابیه یاابت انی رایت احدعشر کوکبا والشمس والقمر رایتهم لی سجدین☆قال یبنی لاتقصص رؤیاک علی اخوتک فیکیدوا لک کیدا، ان الشیطن للانسان عدو مبین، صدق الله مولانا العظیم(یوسف،آیت:۵/۳)

احسن القصص کہنے کی وجہ

بزرگانِ محترم!حق تعالیٰ شانہ فرمارہے ہیں کہ'' نحن نقص علیک احسن القصص ،،ہم آپ پر یعنی محمد ﷺ ایک بہترین قصہ پڑھ سناتے ہیں،آپ کوایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں'' بمااوحیناالیک هذا القرآن ،،یہ جوقرآنِ کریم ہم نے آپ کی طرف نازل کیااوروحی کی اس کے ذریعہ سے ہم آپ کوایک بہترین قصہ سناتے ہیں''وان کنت من قبله لمن الغفلین ☆اورآپ اس سے پہلے البتہ ناواقف تھے اور بے خبر تھے، یہ واقعہ اس کواحسن القصص کہا گیا ہے،تمام قصوں میں سب سے اچھا قصہ،عربی کی ایک تفسیر ہے روح المعانی جو بہت ٹھوس اور تحقیقی تفسیر ہے علامہ آلوسی سید محمود بغدادی رحمہ اللہ کی لکھی ہوئی اس میں لکھا ہے کہ احسن القصص کہنے کی کئی وجہیں ہیں، فرمایا کہ یہ مشتمل ہے بہت سی حکمتوں پر، بہت سی کام کی باتوں پر، مالک اور مملوک

کا واقعہ اس میں ہے، ایک محبّ اور محبوب کا، عاشق اور معشوق کا تذکرہ اس میں ہے، اس میں حسد اور عناد کے واقعات بھی ملیں گے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر ایک ایسی چیز ہے جو نافع اور مفید ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر نافع نہیں ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کسی کیلئے کوئی کمال اور کوئی خوبی لکھ دیں تو اسے کوئی شخص ٹال نہیں سکتا، اس سورت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم میں جیسے وصال ہے، ملنا، ویسے ہی فراق بھی لگا ہوا ہے، اس سورت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی پریشانی ہے تو کبھی اطمینان ہے، اور کبھی اطمینان ہے تو کبھی پریشانی ہے، ایک حالت پر عالم کے انسان قائم نہیں ہیں، برقرار نہیں ہے، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیطان کی کوششیں اور کاوشیں انسانوں کے بگاڑ اور ان کے حالات کے فساد اور اس کی خرابیوں کیلئے ہمیشہ لگی ہوئی ہیں، اس سورت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نفس تمام شروں کا منبع ہے اور سرچشمہ ہے، اگر نفس میں سدھار ہے جو اندر کا ایک جوہر ہے تو پھر انسان کا سدھرنا آسان ہے، اور اگر انسان کے نفس میں خرابی آگئی اندر بگاڑ آ گیا تو انسان کا بگاڑ بہت سہل اور آسان ہے، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ انسان کی عفّت کا اور انسان کی آبرو کا یعنی تقویٰ کا امتحان تنہائیوں میں ہوتا ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے تقویٰ کا امتحان تنہائیوں میں ہوا، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جن حالات سے گذارا وہ کچھ عجیب شان کے تھے کہ جب بھائیوں نے انہیں کنویں میں ڈالا تو بھائی انہیں بے وطن بنا رہے تھے، اور قافلے والے جب انہیں خرید رہے تھے تو وہ ذریعۂ ثمن بنا رہے تھے کہ ان سے مصر کے بازار میں جا کر خوب قیمت حاصل کریں گے، خوب پیسے حاصل کریں گے، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس میں یہ کارفرما تھا

اور قدرت یہ کرنا چاہتی تھی کہ انہیں شاہِ زمن بنایا جائے، تو بھائی بے وطن بنا رہے تھے، قافلے والے ذریعۂ ثمن بنا رہے تھے، اور رب العالمین شاہِ زمن بنا رہا تھا، (فوائدِ عثمانی ص ۳۱۵) اور ہوا ایسے ہی کہ بعد میں جا کر حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے تخت و تاج کے مالک ہوئے ہیں، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ شہوت ایک ایسی چیز ہے کہ جو بادشاہ کو بھی غلام بنا دیتی ہے، زلیخا کا ابتدائی حال اس کا پتہ دیتا ہے، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آدمی اگر تقویٰ پر رہے تو غیبی اعتبار سے نصرتیں ہوتی ہیں، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اگر تقویٰ ہے تو معاش کی اور دنیوی نظام کی عقل بھی حق تعالیٰ سجاتا ہے اور بتلاتا ہے، اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ رب العالمین کا تعلق نتیجۃً انسان کی سرخ روئی کا باعث آخرت میں تو ہے ہی دنیا میں بھی انسان کی سرخ روئی کا باعث ہے کہ برادرانِ یوسف اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کے سامنے جھکے اور ان کی عظمت کو تسلیم کیا، تو اس سورت سے بہت سی عبرتیں، بہت سی بصیرتیں، اور بہت سے فوائد نکلتے ہیں، اس کی تفصیلات آتی رہے گی انشاء اللہ۔

واقعۂ یوسف بھی آپ ﷺ کی نبوت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے

حق تعالیٰ نے اسی لئے اس واقعہ کو احسن القصص سے تعبیر کیا ہے کہ تمام قصوں میں بہترین قصہ، چنانچہ اس کا آغاز اور اس کی ابتداء سے پہلے ایک بات یہ بتائی حضور ﷺ کو کہ آپ پہلے اس قصہ سے ناواقف تھے، بے خبر تھے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نبیٔ امی جو خاکِ پاکِ بطحاء اور مکہ میں رہتے ہو اور جن کی تعلیم کے خارجی ذرائع کچھ نہ ہو کسی یونیورسٹی میں، کسی کالج میں، کسی معلم اور استاذ کے سامنے

انہوں نے زانوئے ادب تہہ نہ کیا ہو، اور پھر وہ ایسی دانائی کی باتیں اور پچھلے واقعات اس انداز کے ساتھ بیان کریں کہ اس میں ذرّہ برابر کمی بیشی نہ ہو، بالکل حرف بحرف، نقطہ بہ نقطہ، کوپی ٹو کوپی جس کو کہتے ہیں، یہ درحقیقت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی ایک علامت قرار دی گئی ہے کہ جو واقعات اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں، اور ان پر مطلع ہونے کا کوئی ایسا معقول ذریعہ بھی آپ کے پاس نہیں تھا کہ جس کے ذریعہ سے آپ واقف ہوجاتے، اور پھر ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں یہ دلیل ہے آپ ﷺ کی رسالت کی کہ خدا تعالی کی وحی کے ذریعہ سے اور خدا تعالی کے بتانے سے آپ نے لوگوں کو بتایا، اسی لئے حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعہ کا تذکرہ فرمانے کے بعد قرآنِ کریم میں موجود ہے ''وما کنت لدیھم اذ یلقون اقلامھم ایھم یکفل مریم،، (آلِ عمران، آیت: ۴۴) کہ حضرت مریم رضی اللہ تعالی عنھا کی کفالت کیلئے جو انہوں نے قرعہ اندازی کا سلسلہ قائم کیا تھا تو آپ وہاں موجود نہیں تھے، اور پھر قوم کو اس واقعہ کی خبر دے رہے ہیں، معلوم ہوا کہ ہمارے بتلانے سے آپ لوگوں کو بتلاتے ہیں، اور ہمارے خبر دینے سے لوگوں کو آپ خبر دے رہے ہیں، یہ دلیل ہے آپ ﷺ کی نبوت کی آپ ﷺ کی رسالت کی، آپ ﷺ کی پیغمبری کی کہ ایک بات ہم نے آپ سے کہی اور پھر آپ لوگوں کو پہنچاتے ہیں، ورنہ آپ کے بس کی بات نہیں تھیں کہ ان واقعات کو اس تفصیل اور درستگی کے ساتھ ٹھیک ٹھیک طریقہ سے بیان فرماتے۔

یہ شاعرانہ باتیں نہیں، کلامِ خداوندی ہے

تو پہلے گویا اس چیز کو ذکر کر کے ادھر اشارہ کرنا ہے کہ یہ بیان خداوندی بیان ہے، اس میں آپ کو شاعرانہ مبالغہ نہیں ملے گا کہ آسمان وزمین کے قلابے ملا دیئے

جائیں، شاعروں کے یہاں تو یہی ہوتا ہے نا کہ آسمان وزمین کے قلابے ملائیں جاتیں ہیں، وہ ایک شاعر تھے نواب صاحب کے یہاں پہنچے اور جاکر تعریف شروع کی کہ آپ کی سخاوت ایسی ہے کہ سورج نکلتا ہے تو شرمندگی کے ساتھ، اور بادل آتے ہیں تو خجالت وندامت کے ساتھ، اور سمندر جب آپ اس کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو وہ اپنا منہ چھپانا چاہتا ہے مگر کوئی شئ ملتی نہیں اس کو، یہ ساری چیزیں آپ کی سخاوت سے شرمندہ ہیں، تو آسمان وزمین کے قلابے ملائیں اور لمبی چوڑی باتیں کیں، اشعار کہے، نواب صاحب تھے بہت ہوشیار زمانہ دیکھے ہوئے، انہوں ے کہا کہ اچھا! تین روز بعد آپ آیئے آپ کو انعام دیا جائے گا، اب یہ میاں سمجھے کہ نواب صاحب میرے اشعار سے بہت خوش ہوگئے، بڑے تگڑے اور لمبے چوڑے گویا الفاظ تھے اس میں تو انعام بھی بڑا ہوگا، اب یہ جناب آئے اور آکر انہوں نے قرض لیا، اور قرض لیکر محفلِ نشاط اور مجلسِ نشاط انہوں نے تیار کی، دور چلنے لگا، جام چلنے لگے، اور مشاعرہ ہو رہا ہے، پُر لطف باتیں ہو رہی ہیں، کسی نے کہا کہ یہ ساری سخاوتیں اور یہ ساری دریادلی اور یہ سارا کیف وسرور کیسے شروع ہوگیا، انہوں نے کہا کہ بس پوچھومت! بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی انہوں نے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور نواب صاحب نے انعام کا وعدہ کیا ہے اور وہ یقیناً بڑا ہی ہوگا، اس وجہ سے اس توقع پر اور اس امید پر یہ ساری محفلِ نشاط ہے اور یہ سب گرما گرمی ہے، تین دن گذرنے کے بعد یہ نواب صاحب کی خدمت میں پہنچے، جب وہ وہاں پہنچے تو ان کا خیال تھا کہ ان کا بڑا استقبال کیا جائے گا، آؤ بھگت ہوگی، ویلکم ہوگا، لیکن کچھ بھی نہیں، خیر، وہ ایک جگہ جاکر بیٹھ گئے، اب وہ نواب صاحب سر نیچے کئے ہوئے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے، انہوں نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں، یہ سمجھے کہ نواب صاحب مشغول اور مصروف زیادہ ہے بہت بزی ہے، جب

فارغ ہوں گے تب متوجہ ہوں گے میری طرف، تھوڑی دیر گذری پھر توجہ نہیں، پھر اور وقت گذرا پھر التفات نہیں، دھیان نہیں، تو انہوں نے کنکھارا ذرا، تھوڑی دیر بعد اور کنکھارا، یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کنکھارتے رہے، وہ سمجھ گئے نواب صاحب ان کی حرکت، اس کے بعد پھر متوجہ ہوئے کہا کیا بات ہے؟ کہا بندہ حاضر ہے، جنابِ والا نے یاد فرمایا تھا مجھے، حضور جہاں پناہ نے فرمایا تھا کہ تین روز بعد حاضر ہونا تو حاضر ہوگیا میں، کہا بہت اچھا خوشی کی بات ہے اور کیا بات ہے؟ کہا بس وہ یاد فرمایا تھا آپ نے اس لئے، اور وہ پھر اپنے کام میں لگ گئے، انہوں نے یاد دلایا کہ وہ آپنے جو انعام کے سلسلہ میں آج آنے کو فرمایا تھا وہ جو اشعار کہے تھے میں نے آپ کی شان میں آپ کی تعریف میں، تو نواب صاحب کہنے لگے کہ تم بڑے بیوقوف معلوم ہوتے ہو، بڑے کم سمجھ معلوم ہوتے ہو، بڑے نادان معلوم ہوتے ہو، تمہارے اشعار کا انعام اور اس کا بدلہ وہ تو ہو چکا، وہ کہنے لگے وہ کیسے؟ کہا دیکھو! تم نے میری تعریف کی تھی الفاظ سے کہ تم ایسے ہو اور ویسے ہو ڈبل پیسے ہو اور آسمان وزمین ایک کردیا تھا تم نے کہ ایسے سخی داتا ہیں اور فلاں ہیں، تو یہ ساری تعریف وتوثیق کی تھی وہ خالی الفاظ تھے، کاغذ کے پھول تھے، الفاظ کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں تھی، تو گویا تمہارے اشعار نے مجھے خوش کیا تو میں کہوں گا کہ لفظوں نے مجھے خوش کیا تو تم نے لفظوں سے خوش کیا حقیقت کچھ نہیں تھی، تو میں نے بھی مناسب سمجھا کہ کچھ الفاظ اپنے منہ سے کہدوں اور تمہیں خوش کردوں تو تم نے مجھے لفظوں سے خوش کیا تو میں نے بھی تمہیں لفظوں سے خوش کردیا، تم نے مجھے اپنے بول سے خوش کیا تو میں نے بھی اپنے بول سے تمہیں خوش کیا، اب انعام کیسا؟ وہ بڑے سٹ پٹائے اور مایوس ہوکر اتنا سا منہ لیکر چلے آئے، (خطباتِ حکیم الاسلام، ج ۳، ص ۲۷۲) بہرحال، کہنے کا منشاء یہ ہے کہ شاعروں کے یہاں مبالغہ ہوتا ہے، قرآنِ کریم کا بیان اس طریق پر

نہیں ہے۔

جیسے انوری نے مبالغہ کیا تھا بادشاہ نے اسکو گھوڑا دیا شاہی گھوڑے کی وہ پوری نگرانی نہیں کر سکے اور گھوڑے کا رات میں انتقال ہو گیا، ان کو خیال ہوا کہ کوئی دشمن حسد کے مارے بادشاہ کو خبر کرے تو نتیجۃً کوئی سزا نہ ہو جائے، تو خود ہی بادشاہ کے پاس پہنچ گئے، اور پہنچنے کے بعد جا کر فارسی میں اشعار کہے اور بادشاہ سے کہا کہ حضور جہاں پناہ! آپ نے جو گھوڑا دیا تھا وہ اتنا تیز رفتار تھا اور اتنا برق رفتار اور اتنا دوڑنے والا کہ ایک رات میں سارے ورلڈ اور ساری دنیا کا سفر طے کر کے اس نے آخرت میں قدم رکھ دیا، یعنی انتقال ہو گیا اس کا، تو وہ تعبیر اس انداز سے کی کہ بادشاہ نے انعام دیا، (خطبات حکیم الاسلام ج ا ص ۴۹)

خیر، مجھے یہ بات بتانی تھی کہ شاعروں کے یہاں مبالغہ ہوتا ہے، مگر قرآنِ کریم کا بیان صداقت پر اور حقیقت پر مبنی ہے اور واقعہ من حیث الواقعہ بیان کیا جاتا ہے، اس میں آسمان و زمین کی باتیں بغیر کسی حقیقت کے ملا دی جائے ایسا نہیں ہوتا ہے، تو یہ آیت جو شروع میں بیان کی گئی وہ اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ یہ قصہ درحقیقت خداوندی بیان ہے جو بالکل علم و حکمت کے کانٹے پہ تُلا ہوا ہے، صداقت کی ساری نوک پلک اس کی درست ہے، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے بالکل ساڑھے سولہ آنہ ٹھیک صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے۔

جو محبت اللہ تعالی کو سال کے ۱۲ مہینوں میں رمضان سے ہے ویسی ہی محبت حضرت یعقوبؑ کو اپنے ۱۲ بیٹوں میں حضرت یوسفؑ سے تھیں

اب واقعہ کا تذکرہ فرماتے ہیں، اس سے پہلے اتنی بات ذہن نشیں رہیں کہ

کنعان کے اندر حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام تشریف فرما تھے، حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام صاحبزادے ہیں حضرت اسحٰق علیہ الصلوۃ والسلام کے، اور حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والسلام کے کل بارہ بیٹے تھے، اس میں حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام اور بنیامن یہ دونوں اخیافی بھائی تھے اخیافی ماں شریک بھائی کو کہتے ہیں، (تفسیر عثمانی) اور والد تو سب کے ایک تھے ہی صحیح، تو بایں معنی یہ دونوں حقیقی بھائی تھے اور دوسرے دس بھائیوں سے یوسف علیہ السلام باپ شریک ہیں، ماں شریک نہیں ہیں۔

لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بڑی محبت تھیں اور بڑی شفقت ان پر فرمایا کرتے تھے، ایسی مثال دی ہے کہ اللہ تعالی کو سال کے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک سے جیسی محبت ہے ویسے ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بارہ بیٹوں میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ہیں کہ یہاں بارہ مہینہ ہیں سب سے زیادہ چہیتہ مہینہ اور پسندیدہ رمضان المبارک ہے، وہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے اس میں سب سے زیادہ چہیتے اور پسندیدہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، تو ان سے بہت زیادہ شفقت اور محبت اور لاڈ پیار کا معاملہ تھا اور تھے بھی چھوٹے ہی۔

واقعۂ یوسف کی ابتداء ایک خواب سے ہوتی ہے

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بچپن میں ایک خواب دیکھا، اور یہ بات ذہن نشین رہے کہ خواب کی تعبیر ڈریم جسے کہتے ہیں تو خواب کی تعبیر کا علم حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی تھا، اور واضح اور صاف اور ایزی خواب ہو تو اس کی تعبیر حضرت

یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی سمجھ لیتے تھے، مگر خاص طور سے خصوصیت کے ساتھ یہ علم اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا، اسی لئے سورت کے اخیر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالی کے احسانات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ''وعلمتنی من تاویل الاحادیث'' (یوسف، آیت:۱۰۱) آپ نے مجھے خواب کی تعبیر کا علم عطا فرمایا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بڑا علم ہے، تو بچپن میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا ہے اور اُس خواب سے ہی اس واقعہ کی ابتداء ہو رہی ہے، مگر یہ ذہن نشین رہے کہ ابتداء خواب سے ہے اور بعد میں اس کی تعبیریں سامنے آ رہی ہیں، اس لئے قصہ صرف خواب ہی خواب نہیں ہے بلکہ نفس الامر میں خارج میں آنکھوں دیکھا حال ہے جس کا وقوع ہوتا رہا ہے، اس کا تذکرہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ'' اذ قال یوسف لابیہ'' اس وقت کو یاد کرو جب یوسف علیہ السلام نے اپنے والدِ بزرگوار سے یہ بات کہی ''انی رأیت احدعشر کوکبا'' کہ بیشک دیکھا میں نے اور دیکھنا بھی کونسا، رؤیا والا دیکھنا، خواب والا دیکھنا کہ میں نے دیکھا'' احد عشر،، گیارہ ستارے'' والشمس،، اور سورج سن (SON) جسے کہتے ہیں، ''والقمر،، اور چاند (MOON) تو گیارہ ستارے دیکھے، سورج دیکھا، چاند دیکھا ''رایتھم لی سجدین،، (یوسف، آیت؛۴) کہ وہ میرے آگے جھکے ہوئے ہیں، سجدہ ریز ہیں، میرے آگے پست ہیں اس حال میں گویا میں انہیں دیکھ رہا ہوں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدِ بزرگوار سے یہ خواب بیان کیا، خواب سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام خواب سے اندازہ لگا چکے کہ یہ بچہ آگے چل کر بہت ہونہار ہونے والا ہے، اور بعض روایتیں ایسی آ رہی ہیں جس کو اربابِ تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا خواب سنکر کہ انشاء اللہ اس کی تعبیر ہو کر رہے گی، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس خواب کے بارے میں فرمایا کہ

'' یابنی لاتقصص '' اے پیارے بیٹے ! اے ننھے بیٹے، نہ بیان کر !'' رؤیاک علی اخوتک '' اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں پر، کیوں؟ ''فیکیدوا لک کیدا''، ممکن ہے وہ کوئی تدبیر کرے تمہارے لئے، ممکن ہے تمہارے خلاف کوئی حیلہ کر بیٹھے، کوئی شکل ایسی اختیار کر بیٹھے ''کید،، کا لفظ ہے کہ جس میں تمہارے لئے کوئی ضرر ہو، یہ اس لئے کہ وہ نبوت کے خاندان کے ہیں، اور خواب بالکل صاف اور بالکل ایزی ہے، وہ سن کر سمجھ جائیں گے کہ یقیناً اس خواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آگے چل کر ان کو ایسی شان نصیب ہونے والی ہیں کہ ہم سب کو ان کی عظمت ماننی پڑے گی، تو ممکن ہے کہ شیطان انہیں ورغلائیں ان کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا کرے اور وہ کوئی تدبیر کر بیٹھے، ''ان الشیطن للانسان عدو مبین ☆ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، یہ تو دو آیتوں کا ترجمہ ہوا، اب اس میں کچھ تھوڑی سی تفصیل ہے۔

خواب کسے کہتے ہیں اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

ایک بات یہ ذہن نشین رہے کہ خواب کی حقیقت کیا ہے؟ خواب کہتے کس کو ہیں؟ عصرِ حاضر میں موجودہ سائنس بہت زور لگا رہی ہے کہ خواب کی صحیح حقیقت پر مطلع ہو، اس کے لئے کچھ آلات بھی انہوں نے لگائے ہیں، اور کچھ انہوں نے کہروبائی لہریں ایسی معلوم کی ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جس سے ان کو اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شئی ہے جس میں حدّت بھی ہے، کچھ روشنی بھی ہے، مگر یہ کہ آج تک سائنس اس معاملہ میں کسی آخری نکتہ پہ نہیں پہنچی ہیں کہ اس کی تحقیق کو حرفِ آخر کہکر ہم تسلیم کر لیں، خواب کے سلسلہ میں علماءِ امت کی جو تصریحات ہیں اس کا خلاصہ آپ سن لے، وہ یہ ہے کہ عالم کی کلی طور پر تین قسمیں ہیں، (ثمرات الاوراق،ص ۲۱۰) ایک عالم عالمِ مجرد کہلاتا ہے، اور ایک

عالم عالمِ برزخ کہلاتا ہے، اور ایک عالم یہ عالمِ ناسوت کہلاتا ہے، اس کو آسان لفظوں میں ایسے سمجھ لو کہ ایک وہ عالم ہے کہ جو بالکل ہائی کنڈیشن نہایت اعلیٰ کہ جہاں پر کثافتیں نجاستیں، غلاظتیں، کدورتیں، گندگیاں، اور کسی قسم کی خرابی نہیں ہیں، بلکہ لطیف بہت ہی پرنور قسم کا عالم ہے کہ جو اِس عالم سے بالکل مختلف ہے اور یہ عالم بالکل نچلا ہے، اور اِن دو عالموں کے بیچ میں ایک عالم برزخ کہلاتا ہے درمیانی عالم واسطہ بیچ کا اسے عالمِ مثال بھی کہتے ہیں اور عالمِ برزخ بھی کہتے ہے اس کو، تو کلی طور پر عالم کی تین قسمیں ہیں، ایک عالمِ مجرد، ایک عالمِ مثال، اور ایک عالمِ دنیا، جب آدمی سوتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ نیند کی حالت میں روحِ ربّانی بدن سے نکل جاتی ہے اور روحِ حیوانی باقی رہتی ہے، روحِ حیوانی کا کام کیا ہے؟ روحِ حیوانی کا کام یہ ہے کہ نبضیں جو ہیں اچھلتی رہتی ہے، بدن میں گرمی ایک خاص قسم کی باقی رہتی ہے، کھانا ہضم ہوتا رہتا ہے، انسان کو اگر کوئی چیز کاٹے تو اس کا احساس ہوتا رہتا ہے، سردی لگے تو اس کا احساس ہوگا، گرمی ہو تو اس کا احساس ہوگا، تو روحِ حیوانی جو ہے وہ ان کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے، اور روحِ ربّانی نکل جاتی ہے عالمِ بالا کی طرف اور وہاں سے اس بدن پر اس کا فاکس اور عکس ایسے پڑتا ہے جیسے سورج اوپر ہے اور اس کی روشنی آپ زمین پر دیکھتے ہیں اس کی دھوپ آپ زمین پر دیکھتے ہیں اس طریقہ سے وہ بدن کی تربیت کرتی ہے اور بدن پر اس کا اثر گویا قائم رہتا ہے، اور ان دونوں میں ایسا قوی رابطہ ہوتا ہے کہ ذرا آپ اس کو ہاتھ لگائے، یا ذرا آواز دے کے اٹھائے تو وہ جو بیداری ہے اس بیداری کے ساتھ اس کا بجلی سے زیادہ قوی تعلق ہوتا ہے کہ آناً فاناً وہ اس میں حاضر ہو جاتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ گویا یہاں جاگ جائے اور اس کی روح اس عالم میں رہے، قرآنِ کریم میں چوبیسویں پارے کے دوسرے رکوع میں ایک مقام پہ ارشاد ہے، ''اللہ یتوفی

الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی،،(زمر،آیت:۴۲).

اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہوان کے مرنے کا اور جونہیں مرے ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرادیا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کوایک وعدہ مقرر تک،تو یہ ایک درمیانی عالم ہے،اور یہ ذہن نشین رہے کہ ہر شئی کی ایک حقیقت اُس عالم میں موجود ہے،انسان اس کی حقیقت،درخت اس کی حقیقت،تو ہر شئی کا ایک اثر اُس بیچ کے عالم میں موجود ہیں،اسی لئے نیند کے عالم میں جب روح نکل کر چلتی ہیں تو جس شئی سے مناسبت ہوتی ہے اس کے سامنے ٹھہر جاتی ہے، اور اس ٹھہرنے کی وجہ سے پھر وہ چیزاسے نظر آتی ہے،تو خواب میں درحقیقت اشیاء کے ساتھ مناسبات جیسی جیسی قائم ہوتی ہیں وہ نظر آتی رہتی ہیں اس کو،اور بعض مرتبہ مزاج بھی اس میں اثر انداز ہوتا ہے مثلاً ایک آدمی ہے بلغمی مزاج ہے،بلغم بہت ہے اب وہ دیکھ رہا ہے کہ میں ندی میں نہار ہاہوں، تالاب میں ڈوب رہاہوں،دریا میں ڈوب رہاہوں، پریشان ہورہاہوں یہ سب،تو پانی کی لائن کی جتنی چیزیں اس کووہ دیکھے گا یہ بلغم کا اثر ہے، یامثال کے طور پر کالی چیزیں دیکھتا ہے،ڈراؤنی چیزیں دیکھتا ہیں کہ بھوت آیا،جن آیا،تو وہ سوداء کا اثر ہے،(تعبیر الرؤیا ص۳۸)ایک مادہ ہوتا ہے بدن میں اس کوسوداء سے تعبیر کرتے ہیں،یامثلاً تمام چیزیں لال نظر آتی ہوتو یہ دموی مزاج جن کا ہوتا ہے خون کا غلبہ جن پر ہوتا ہے اس کا اثر ہوتا ہے،یاساری چیزیں پیلی پیلی نظر آتی ہو(YALO) جسے کہتے ہیں تو وہ صفراء کے غلبہ سے ہوتا ہے،(حوالا بالا)تو کچھ مناسبات اس کی بھی ہیں، اصل میں یہ مضمون بڑا علمی اور بڑا تفصیلی ہے، میں بہت او پراو پراور آسان لفظوں میں اس کو بیان کرر ہاہوں کہ کچھ کچھ پلّے پڑ جائے،زیادہ تحقیق میں جانا نہیں چاہتا میں صرف

اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بڑی مناسبات ہیں۔

خواب کی تعبیر کیلئے کیا کیا جاننا ضروری ہے؟

بہر حال، خواب کا ایک مستقل علم ہے، اسی لئے خواب کی تعبیر کے بارے میں یہ ذہن میں رہے کہ اس کے لئے قرآنِ کریم کا جاننا ضروری ہے، حدیثِ پاک کا جاننا ضروری ہے، لغت کا جاننا ضروری ہے، اور خود دیکھنے والے کی مناسبت بھی، (تعبیر الرؤیا ص۱۴)

چنانچہ علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ حضرت! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اذان دے رہا ہوں، فرمایا کہ: تم حج کروگے، یہ تعبیر دی (ملفوظاتِ فقیہ الامت، ج۱، ص۵۶) دوسرا ایک شخص آیا اس نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں خواب کے اندر اذان دے رہا ہوں، کہا سچی بات ہے تو اس نے کہا بالکل سچی بات ہے، لوگوں سے کہا کہ اسے پکڑو یہ چور معلوم ہوتا ہے (حوالا بالا) لوگوں نے سوچا کہ یہ کیا مصیبت ہے، ایک کو تو کہا کہ تم حج کروگے، اور دوسرے کو کہا کہ یہ چور ہے، لوگوں نے پوچھا کہ حضرت یہ فرق کیوں؟ کہا قرآنِ کریم میں اذان کا دو جگہ تذکرہ ہے، ایک تو سورۂ حج میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب وہ کعبہ کو بنا کر فارغ ہوگئے "واذن فی الناس با لحج"، (حج، آیت: ۲۷) کہ لوگوں میں حج کی ندا دیدو، اب جن کیلئے حج مقدر تھا ان کی روحوں نے لبیک کہا ہے، تو "واذن فی الناس باالحج" میں وہاں اذان کا لفظ ہے کہ ندا کردو، اور چہرے سے نیکی معلوم ہوتی تھی، صلاح معلوم ہوتی تھی، تقویٰ معلوم ہوتا تھا، تو میں نے اس اذان کو اس پر محمول کیا اور یہ سمجھا کہ اس کو حج نصیب ہوگا، اور دوسری ایک جگہ تذکرہ ہے کہ جب حضرت یوسف

علیہ السلام کے بھائی مصر سے چلے ہیں تو بنیامین جو حضرت یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی تھے ان کے برتن میں حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہی پیالہ رکھوا دیا تھا اور جب کچھ آگے بڑھے ہیں تو ندا دی ''واذن موذن ایتھا العیر ''، کہ پکارنے والے نے پکارا اور ندا دینے والے نے ندا دی کہ اے قافلے والوں ''انکم لسارقون ''، تم چور ہوں ہمارا شاہی پیالہ جا چکا ہے، وہ بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کی ایک تدبیر تھی جس کی تفصیلات آئے گی بعد میں انشاء اللہ، تو وہاں بھی اذان کا لفظ ہے اور یہاں اس کے چہرے سے میں نے محسوس کیا کہ اس پر شر اور معصیت اور گناہ کے آثار ہیں، تو میں نے اس اذان پر محمول کر کے یہ سمجھا کہ یہ چور ہے (حوالا بالا) کیسی ان کی ذکاوتیں تھیں۔

یہ کفن چور معلوم ہوتا ہے

چنانچہ حافظ ابنِ سیرین رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص آئے اور آنے کے بعد کہا کہ حضرت! میں نے ایک خواب دیکھا ہے، مناسبات دیکھئے، خواب یہ دیکھا کہ میرے ہاتھ میں ایک انڈا ہے اس کو میں نے پھوڑا اور پھوڑنے کے بعد اس کی سفیدی میں نے لے لی اور زردی چھوڑ دی، کہا واقعی ایسا خواب دیکھا ہے اس نے کہا بالکل سچی بات ہے، لوگوں سے کہا اس کو پکڑو، یہ کفن چور معلوم ہوتا ہے، اور اس کے بعد تعبیر دی کہ انڈا مشابہ قبر کے ہے، اور سفیدی وہ تو اس کا کفن ہے، اور زردی وہ اصل مردہ ہے، (تعبیر الرؤیا) چنانچہ تحقیق کی گئی تو وہی نکلا، عجیب عجیب مناسبات ہوتی ہے بڑی لطیف۔

چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء میں لکھا ہے کہ ایک معبّر کے پاس ایک شخص پہنچے اور جا کر کہا کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرے ہاتھ میں مہر ہے، میں مہر سے لوگوں کے منہ پر اور لوگوں کی شرمگاہ پر ٹھپہ مارتا ہوں، سِل لگاتا ہوں، منہ بھی بند اور شرمگاہ بھی

بند، کیا تعبیر ہے؟ انہوں نے فرمایا اس کی تعبیر یہ ہے کہ تم مؤذن معلوم ہوتے ہو اور رمضان میں سحری کی اذان جلدی دیدیتے ہو کہ کھانے والے کا کھانا بند اور جو بیوی سے مشغول ہے وہ کام بند، (رہنمائے سعادت ص ۷۱) تو تمہارا یہ فعل لوگوں کے حق میں درحقیقت مہر کی حیثیت ہے کہ سب بند۔

تمہاری بیوی کو بچہ پیدا ہوگا لیکن تمہاری بیوی کا انتقال ہو جائے گا

یا جیسے مثلاً ایک معبر سے ایک شخص نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں پیالہ ہے اس میں پانی ہے اور پیالہ ہاتھ سے چھوٹا اور چھوٹنے کے بعد پیالہ تو ٹوٹا اور پانی ویسے ہی باقی رہا، پیالہ ٹوٹ گیا اور پانی سالم رہا، کہا اگر یہ خواب تم نے دیکھا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمہاری بیوی کو حمل ہے اسے بچہ پیدا ہوگا، بچہ کی پیدائش کے بعد بیوی کا تو انتقال ہو جائے گا اور بچہ زندہ رہے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بیوی کا ہوگیا انتقال اور بچہ زندہ رہا، تو بڑی مناسبات ہوتی ہیں اور عجیب عجیب جوڑ ہوتے ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ خواب اپنے والدِ بزرگوار کو سنایا اور کہا ”انی رأیت احد عشر کو کبا والشمس والقمر رأیتھم لی سجدین“ (یوسف، آیت: ۴)۔

تو گیارہ بھائی تو ستارے ہوئیں، اور باپ جو ہے وہ شمس ہے، اور ماں جو ہے وہ قمر ہے، اور فرمایا کہ: ان کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کررہے ہیں، یعنی میرے آگے جھکے چلے جارہے ہیں، چونکہ خواب کی تعبیر بہت صاف تھی، بہت واضح تھی، لہٰذا باپ نے اس کو بھائیوں سے بیان کرنے سے روکا۔

خواب یا تو حبیب سے بیان کرو، یا لبیب سے بیان کرو

اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ خواب ہر ایک کو نہیں سنانا چاہئے کہ ہر کس

و نا کس کے سامنے بیان کریں، ترمذی شریف کی حدیث ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ خواب یا تو حبیب سے بیان کرو یا لبیب سے بیان کرو (تعبیر الرؤیا ص۵) حبیب سے بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو تم سے محبت رکھتا ہے یا تم کو جس سے محبت ہے اس سے بیان کرو تو وہ محبت کی وجہ سے اچھی تعبیر دے گا، اور لبیب مراد اس سے عقلمند ہے کہ اگر عقلمند سے خواب بیان کیا تو وہ عقل کی وجہ سے اچھی تعبیر دے گا، اور اگر کسی اور سے بیان کیا تو اس کا ضرر ہو سکتا ہے، چنانچہ بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ پرندے کے پیر پر گویا خواب ہے (مسند احمد، تعبیر الرؤیا ص۴) تعبیر دیدی تو واقع ہو جائے گی، مگر اس میں اتنی قید ضرور ہے کہ تعبیر کچھ اصول سے تعلق رکھتی ہو، اور خواب کی تعبیر کے بھی خود مستقل اصول بیان کئے گئے ہیں ان اصولوں کو اگر آدمی سمجھے تو وہ بڑا علم ہے اور بڑا دقیق علم ہے، اور اس کے بعد ہی تعبیر دی جاسکتی ہے، یا پھر اللہ تعالیٰ تقویٰ کی برکت سے کسی کا سینہ کھولدے اور اس کو خواب کی تعبیر کا علم نصیب فرمادیں وہ الگ بات ہے۔

ضرر کا اندیشہ ہو تو اپنے کمالات کو ظاہر نہیں کرنا چاہئے

تو میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ خواب بہت صاف تھا اور بڑا عظیم الشان اس لئے کہ ستاروں کا جھکنا، اور سورج کا جھکنا، اور چاند کا جھکنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور سجدے کا لفظ ہے کہ میرے آگے سجدہ کر رہے ہیں یہ خواب دیکھا انہوں نے، تو باپ نے پہلا کام تو یہ کیا، فرمایا کہ ''لاتقصص رئویاک علی اخوتک،، اپنے بھائیوں سے خواب مت بیان کرو، اس سے علماءِ کرام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو باطنی کمال عطا فرمایا ہو، یا کوئی کمال اور خوبی عطا فرمائی ہو اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کمال اور خوبی کو اگر میں ظاہر کروں تو ظاہر کرنے میں حسد کا اندیشہ ہے، ضرر کا اندیشہ ہے تو

بلاضرورت اپنی نعمتوں اور کمال کو ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، (گلدستہء تفاسیر، ج ۳ ص ۴۲۷) جیسے مثال کے طور پر ایک آدمی نے تجارت کی اور تجارت میں اس کو دس ہزار ڈالر نفع ہوا، اب اس نفع کو اگر اپنے کسی ساتھی پر ظاہر کرتا ہے تو اندیشہ ہے کہ وہ تدبیر کرے گا کہ کسی طریقہ سے اس کے پاس سے ضائع ہو جائے، یا ضائع نہ ہو تو کم از کم پیٹ میں جلن ہی شروع ہو جائے اس کے، تو ایسی صورت میں اس کو چاہئے کہ وہ کتمان کرے اور چھپائے، کیونکہ حدیثِ پاک میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنی ضروریات کی تکمیل مخفی انداز میں کرو (حوالا بالا ص ۴۲۳) اس کا مفہوم یہی ہے کہ جہاں اظہار کرنے کی شکل میں ضرر کا اندیشہ ہو اور فتنوں کا اندیشہ ہو اور محسود بنکر پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔

تمام حدیثوں کو اپنے محل پہ رکھنا ضروری ہے

کیونکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''کل ذی نعمة محسود'' (حوالا بالا) ہر وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نعمتوں سے نوازتا ہے اس پر حسد کیا جاتا ہے، اور اگر ایسی کوئی شکل نہیں ہے تو حدیثِ پاک میں حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نعمت کے ظہور کو پسند بھی فرماتا ہے (جواہر الاحادیث ص ۱۷۴) مثلاً خدا تعالی نے دولت دی ہے تو سڑے ہوئے کپڑے پہننے کے بجائے معقول قسم کے کپڑے پہنئے آپ، ایسا نہیں کہ بالکل بنئے اور مارواڑیوں کی طرح رہے کہ کروڑوں روپئے ہوں تب بھی پتہ ہی نہ چلے کہ سڑی ہوئی دھوتی پہنی ہے غربت کے زمانہ میں بھی اور دولت کے زمانہ میں بھی، ایسی شکل نہیں۔

تو اگر اندیشۂ ضرر نہ ہو تو حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ'' (جواہر الاحادیث ص ۱۷۴، مسند احمد) تو یہ حدیث بھی اپنی جگہ درست ہے، تو تمام حدیثوں کو اس کے محل پہ رکھنا ضروری ہے۔

لاتقصص رؤیاک علی اخوتک

بہر حال، کہنے کا منشاء یہ ہے کہ پہلی بات جو فرمائی وہ یہ کہ ”لاتقصص رؤیاک علی اخوتک “تو”علے اخوتک ،، میں سارے بھائی آگئے بنیامین بھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے وہ بھی داخل ہے، والد نے ان کے سامنے بھی خواب کے اظہار سے روکا کہ ان کے سامنے بھی مت بیان کرنا، ایسا کیوں؟ اس کی وجہ علماءِ کرام نے یہ لکھی ہیں کہ ان کی ذات سے تو ضرر کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، مگر ممکن ہے کہ وہ ناسمجھی اور کم عمری کی وجہ سے بھائیوں پر ظاہر کردیں، اور ظاہر کرنے کے نتیجہ میں ان میں کوئی کیفیت پیدا ہوجائے، (گلدستۂ تفاسیر ج ص ۴۲۲) اور اس کیفیت کی وجہ بھی آپ سن لے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہے، انداز کتنا عجیب، یوں فرمایا کہ ”فیکیدوا لک کیدا ،، ممکن ہے وہ کوئی تدبیر تمہارے خلاف کریں، اور اس کا منشاء شیطان کی عداوت ہے۔

برادرانِ یوسف صحابی ہیں، نبی نہیں

اب یہاں مستقل ایک بحث ہے کہ برادرانِ یوسف پیغمبر تھے یا صحابی تھے؟ تو علماءِ کرام کی ایک بڑی جماعت کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے یہ نبی نہیں ہیں، البتہ صحابی ضرور ہیں کہ وہ پیغمبر کے صحبت یافتہ ہیں، چنانچہ نبی نہ ہونے پر ان چیزوں سے ہی استدلال کیا ہے کہ جو چیزیں ان سے وجود میں آئی ہیں وہ نبوت کے منافی ہیں، البتہ صحابیت سے ایسی چیز ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک تفصیلی چیز ہے جسے انشاء اللہ میں کل ذکر کروں گا، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

آدمی اگر سچ بولنے کا عادی ہے تو اس کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں

ایک کام کی بات خواب کے متعلق یہ بھی ذہن نشین رہے کہ آدمی اگر سچ بولنے کا عادی ہے تو خواب بھی اس کو سچے دِکھتے ہیں، (تعبیر الرؤیا ص۴) اور اگر سچ بولنے کا عادی نہیں ہے تو خواب بھی جھوٹے نظر آتے ہیں، اور یہ بھی ہے کہ اگر آدمی وضو کر کے قبلہ رخ ہو کر کچھ پڑھ پڑھا کر سوئے اس صورت میں بھی اچھے خواب نظر آتے ہیں (حوالا بالا ص ۳۷) اور ایک بات یہ ذہن نشین رہے کہ برے خواب جس کو آدمی برا بولتا ہے اول تو خواب کو برا کہنا ہی صحیح نہیں ہے، لیکن اگر ڈر کے خواب ہے تو حدیث شریف میں ہے کہ بائیں طرف تین دفعہ تھتھکار دے، اور'' اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم،، پڑھ کر کروٹ بدل لے (حصنِ حصین ص۹۴ بحوالہ مسلم) اور اسے کسی سے بیان نہ کرے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اسکا کوئی ضرر نہیں ہوگا۔

ہم لوگوں کے خواب عام طور پر خواب نہیں ہوتے تصورات ہوتے ہیں

اور ہم لوگوں کے جتنے خواب ہیں وہ عام طور پر خواب نہیں ہوتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً کھچڑی شریف کھا کر سوئے اور اوپر سے دو گلاس چار گلاس پانی پیا تو وہ سب گیس کا اثر ہوتا ہے، صحیح خواب عموماً اس زمانہ میں ہوتا ہے جب بہار کا زمانہ ہو، یا صحیح خواب عموماً صبح صادق سے پہلے ہوتا ہے (تعبیر الرؤیا ص۴۳) کہ اس وقت یہ گیس کا سلسلہ اور بخارات کم ہوتے ہیں اور یہ سب گویا بیٹھ چکے ہوتے ہیں اور معدہ خالی ہوتا ہے، اس موقع پر جو ہے عموماً انسانی خواب صحیح ہوتے ہیں، اور تعبیر اس کی جو دی جائے وہ موافق ہوتی ہے، ورنہ یہ جو دو پہر میں کھچڑی کھا کر سوئے ہیں نور کلیا شریف، یا ویسے اور وقت

میں خوب کھا کھا کراور پانچ پانچ گلاس جوس پی کرسوئے عموماً وہ خواب ہی نہیں ہوتے وہ تصور ہوتا ہےایک چیز ذہن میں جمی ہوئی ہے وہی دِکھتی ہے۔

بلّی کے خواب میں چھیچھڑے

ڈابھیل میں ایک شخص میرے پاس آئے اورآ کر کہنے لگے کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے، میں نے کہا کیا دیکھا؟ کہا خواب یہ دیکھا ہے کہ ایک آدمی میرے بارے میں یعنی اُن کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ان کو چھپّن کروڑ کی چوتھائی مل جائے تو وہ مجھے ملے گی، یانہیں؟ وہ مجھ سے پوچھتا ہے،اس بیچارہ کو چھپّن کروڑ کی چوتھائی چاہیئے تھی وہی تصور لیکر سویا ہوگا،توبلّی کے خواب میں چھیچھڑے ہی ہوتے ہیں،تو وہی تصور تھا،تو وہ یہ پوچھتا تھا مجھ سے آکر کہ مجھے ملے گا یانہیں؟ تو میں نے ان سے کہا کہ میں تو آپ کو کیا ججمینٹ دوں کہ ملے گا یانہیں،تو ہم لوگوں کے خواب ویسے ہی ہوتے ہیں کہ جو تصور قائم ہے بس وہی چیز دِکھتی ہے، بہرحال، قصہ شروع ہورہا ہے اوراس میں بڑے علوم ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنِ کریم کو سمجھنے اوراس کے تقاضوں پرعمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں،آمین۔

درس نمبر (۵)

الحمدلله و کفی و سلام علیٰ عباده الذین اصطفی ، امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطان الرجیم، بسم الله الرحمن الرحیم ،

اذقال یوسف لابیه یاابت انی رایت احدعشر کوکبا والشمس والقمر رایتھم لی سجدین☆

قال یبنی لاتقصص رؤیاک علی اخوتک فیکیدوا لک کیدا، ان الشیطن للانسان عدو مبین،(یوسف،۵) صدق الله مولانا العظیم.

نبیٔ کریم ﷺ کو دو چیزیں قبل النبوت عطا فرمائی گئی

بزرگانِ محترم! کل یہ ذکر کیا تھا نبیٔ کریم ﷺ نے بھی نبوت سے قبل چھ ماہ تک مسلسل خواب دیکھے، اور اسکے الفاظ ہے ''مثل فلق الصبح ،، کہ وہ خواب صبح کے مانند شرمندۂ تعبیر ہوئے، یعنی جو بات خواب میں آپ ﷺ دیکھتے تھے خارج میں اس کی تعبیر سامنے آتی تھی، اور اس طرف دوسری چیز یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''حُبِّبُ اِلَیَّ الخلاء '' تنہائی میرے لئے محبوب قرار دی گئی تھی، (کشف الباری شرح بخاری ج ا ص ۳۳۶) اسی لئے غارِ حراء میں پہنچ کر آپ عبادت میں مشغول ہوتے تھے، تو خلوت پسندی اور تنہائی اور اس کے ساتھ خواب کی یہ کیفیت نبیٔ کریم کو قبل النبوۃ مرحمت فرمائی گئی تھی۔

خواب کی تعبیر کیلئے بڑے علوم کی ضرورت ہے

تو قصہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی بچپن میں خواب دیکھا،

اور یہ خواب ترجمانی کررہا تھا اور پتہ دے رہا تھا ان کے تابناک مستقبل کی کہ یہ آئندہ چل کر غیر معمولی شخص ہوں گے خواب میں بڑی باریکیاں ہوتی ہیں اور تعبیر کیلئے بھی بڑی نزاکت کی ضرورت ہے، بڑے گہرے علم کی ضرورت ہے، کتاب اللہ کا علم ہو قرآنِ کریم کا یا جو اس زمانہ میں کتاب ہو، اور حدیثوں کا علم ہو، لغات کا علم ہو، قیافہ کا علم ہو، فراست کا علم ہو، ذکاوت اس کی انتہائی ہو، قلب میں نورانیت ہو، تمام متعلقات پہ غور کریں تب جا کر تعبیر دی جاتی ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی ہے کہ آدمی آنکھ میچ کے جو سمجھ میں آئے وہ کہہ دے اور وہ تعبیر ہو جائے۔

ایک خواب کی بھونڈی تعبیر

جیسے ایک آدمی نے خواب دیکھا، اور ایک شخص سے تعبیر پوچھی کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میرا ایک پیر تو ہے مشرق میں اور ایک پیر مغرب میں، تو اس نے کہا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمہارے دونوں پیر پھٹ جائیں گے اور تم مرو گے اسی طریقہ سے۔
(ملفوظات حکیم الامت ج دہم ص ۱۲۳)

اب یہ کتنی بھونڈی تعبیر ہے، اسی لئے حدیث شریف میں نبیِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ خواب پرندہ کے پیر پر ہوتا ہے، اور جب تعبیر دی جائے تو وہ واقع ہو جاتا ہے، (تعبیر الرؤیا ص ۴) کہ جیسی تعبیر ویسے ہی اس کا وقوع ہو جاتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ تعبیر اصول کے مطابق ہو، اگر بے اصول تعبیر ہے تو ضروری نہیں کہ جیسی تعبیر دی گئی بعینہ وہی ہو جائے یہ ضروری نہیں ہے، تو اس کی تعبیر در حقیقت یہ تھی کہ ایک پیر مشرق میں اور دوسرا مغرب میں گویا شرق وغرب میں آپ کا اثر قائم ہوگا اور آپ کو ایک حیثیت نصیب ہوگی، یہ دراصل اس کی تعبیر تھی، مگر تعبیر دینے والے نے تعبیر صحیح طور پر نہیں دی۔

خواب کی تعبیر دوآدمیوں سے پوچھو

اسی لئے ترمذی شریف کی حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ خواب بیان کیا جائے تو دوآدمیوں سے، یا تو آدمی خواب بیان کرے لبیب سے ، یا خواب بیان کرے حبیب سے،لبیب کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقلمند ہو،صاحبِ علم ہو کہ وہ اپنے علم وعقل کی وجہ سے اورفہم ودانش کی وجہ سے اچھی اور عمدہ تعبیر دے،یا حبیب سے کہ خواب سن کر اسے حسد نہ ہو بلکہ محبت کی وجہ سے اس کواچھے مفہوم کا جامہ پہنائے۔

ابن خلدونؒ کا خواب کی تعبیر کے متعلق ایک ارشاد

اسی لئے علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ سانپ کی تعبیر ویسے مشہور تو یہی ہے کہ دشمن ہے،مگر موقع کی مناسبت سے معبّر اس کوسمجھ سکتا ہے کہ سانپ حیات سے بھی عبارت ہوسکتی ہے اس لئے کہ عربی زبان میں سانپ کو’’حیة،، کہتے ہیں اور’’حیة،، کے اندرحیات کے معنی چھپے ہوئے ہے’’ فاذا ھی حیۃتسعی ‘‘تو جیسا موقع ہواس اعتبار سے تعبیر دی جائے گی،اس لئے کہ اس میں گرمی بھی ہوتی ہے،حرکت بھی ہوتی ہے،اورگرمی اورحرکت یہ حیات کا اثر ہے،مگر عام حالات میں معبرین سانپ کی تعبیر دشمن سے لیتے ہیں جیسے شیر کے باب میں کہ کوئی خواب میں بڑا شیر دیکھے توسمجھو کہ کوئی قوی اورتوانا دشمن ہوگا (تعبیر الرؤیا ص۱۳۴) اوربھی بڑی مناسبات ہوتی ہیں اس کی۔

روحِ ربانی اورروحِ حیوانی کے اثرات

حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا ارشاد ہے کہ جب آدمی سوجاتا ہے تو نیند سے روحِ ربانی نکل جاتی ہے اوروہ نکل کے اوپر عروج کرتی ہے اورروحِ حیوانی بدنِ انسانی

میں باقی رہتی ہے (مقالاتِ حکیم الاسلام ص۴۱۹) روحِ حیوانی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نبضیں اچھلتی رہتی ہیں، حرارت بدن میں باقی رہتی ہے، کھانا ہضم ہوتا رہتا ہے، احساسات باقی رہتے ہیں کہ مچھر، کھٹمل کاٹے تو آدمی کھجلانا شروع کرے، تو یہ روحِ حیوانی کا اثر ہے، اور روحِ ربانی وہ بدن سے عروج کر کے اس عالم کی طرف چلتی ہے اوپر کے عالم کی طرف اور وہاں سے اس بدن پر وہ اثر انداز رہتی ہے، اسکی مثال بھی اس طریقہ سے دی کہ جیسے سورج تو اپنے مقام پر ہے مگر شعائیں اور کرنیں اور لائٹ اس کی زمین پر ہوتی ہے ایسے ہی روح کے اثرات اس جسم کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، اور اتنا زیادہ قوی تعلق ہے اور تعلق میں اتنی پختگی ہے کہ جیسے بجلی کا اپنے بلب سے تعلق ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قوی تعلق ہے کہ وہ عالمِ مثال سے ہو کے گذرتی ہے، اوپر پہنچتی ہے، مگر جہاں ادھر آپنے اسے حرکت دی یا کوئی بات پیش آئی تو فوراً جو ہے بیداری کی شکل ہے وہ اسی آن موجود ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالی کا ایک نظام ہے، تو احساسات کی دنیا اتنی لطیف ہے تو ارواح کا تو کیا پوچھنا۔

اصل ادراک دماغ کرتا ہے

چنانچہ اطباء کا خیال یہ ہے کہ مثلاً کسی آدمی کی انگلی اگر دروازہ میں دب جائے اس دروازہ میں دبنے کے نتیجہ میں جو تکلیف محسوس ہوئی ہے تو وہ حقیقۃً اس کی وجہ سے نہیں بلکہ تمام رگوں کے توسط سے احساسات کی ایک لہر پورے بدن میں ہے، اور اصل ادراک اس کا کرتا ہے دماغ، تو پہلے کلفت محسوس کی ہے دماغ نے اور اس کی برکت سے پھر یہاں پر حس محسوس ہوئی، مگر یہ سب اتنی تیزی کے ساتھ ہوتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چل پاتا، یہی وجہ ہے کہ آدمی کو جب بے ہوش کیا جاتا ہے تو ہوش کا تعلق دماغ سے ہے، بیہوش ہو جانے کے بعد

پھر آپ آپریشن کیجئے، اسے کاٹئے، دبایئے، ماریئے، کچھ بھی کرے پتہ نہیں چلتا، تو معلوم ہوا کہ مرکزِ احساس وہی ہے، اور روح کے معاملات تو اور زیادہ لطیف ہیں، انتہائی عجیب وغریب ہے۔

امر ربی کی ایک بہترین تمثیل سے وضاحت

میں نے گذشتہ ایک واقعہ سنایا تھا، آج پھر سناؤں، اور واقعی حیرت ہو جاتی ہے کہ عجیب وغریب مثال ہے وہ، قرآنِ کریم میں ہے کہ یہود نے مشرکینِ مکہ کو سکھا کر آپ ﷺ کے پاس بھیجا اور انہوں نے آپ ﷺ سے تین سوالات کئے، وہ قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، ایک ذوالقرنین کے باب میں کہ یہ کون بزرگ تھے؟ ایک اصحابِ کہف کے باب میں کہ یہ کون اشخاص تھے؟ اور ایک روح کے باب میں کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ تو حق تعالیٰ کی طرف سے فرمایا گیا کہ ''ویسئلونک عن الروح، قل الروح من امر ربی'' (بنی اسرائیل ،آیت: ۸۵) امرِ رب ہے یہ، بھوپال میں ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی رحمہ اللہ بڑے شخص گذرے ہیں نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ تھے، حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: ہم لوگ جب بھوپال اجتماع میں پہنچتے ہیں تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے ہیں اور وہاں جا کر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہمارے دل سے کچھ جھٹک دیا، تو بڑے قوی النّسبت شخص تھے، بڑی کرامات بھی تھی ان کی، ان کا انتقال بھی اس شان کے ساتھ ہوا کہ گھر میں دروازہ اندر سے بند تھا اس کے بعد پھر کسی طریقہ سے ہوا آئی اور دروازہ کھلا، تو اس پر وہاں قریب میں جو اقرباء تھے ان کو تعجب ہوا، پھر حضرت فرمانے لگے میری روح یہاں سے نکلی ہے اور یہاں پہنچی ہے، اور یہاں سے نکل کر یہاں آئی اور یہاں سے نکل کر یہاں آئی، پھر کہنے لگے کہ یہاں سے نکل کر یہاں پہنچی اب

یہاں آئی ہے اس کے بعد کہا کہ اچھا! اب ہم رخصت ہوتے ہیں السلام علیکم، کلمہ پڑھا اور انتقال ہو گیا ان کا۔ (انمول حدیث ص ۱۵۳/۱۵۴)

میں نے ہمارے قبلہ حکیم فخر الدین صاحب رحمہ اللہ سے پوچھا کہ روح کے باب میں موت کے وقت کے بہت سے واقعات کتابوں میں پڑھے ہیں مگر ایسا واقعہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، وہ وسیع المطالعہ شخص تھے، اوران کا علم بڑا وسیع تھا، فرمایا کہ: افلاطون کے واقعہ میں یہ بات ملتی ہے کہ اس نے بھی اسی قسم کی چیزیں کہی، تو عرض یہ کہ احساسات ہوتے ہیں، تو پیر ننھے میاں صاحبؒ روح کے باب میں یک مثال دیتے تھے کہ قرآن کریم میں اس کے باب میں کہا گیا کہ وہ اللہ تعالی کا امر ہے، امرِ رب ہے وہ، تو امرِ رب کی حقیقت کو سمجھانے کیلیئے ایک مثال دی، فرمایا کہ: اللہ تعالی نے اس کی ایک مثال ہمارے ذہن میں ڈالی اور ایسی مثال ہے کہ اس سے ایسا مسئلہ حل ہوا کہ بڑی بڑی کتابوں میں بھی وہ حل نہیں مل پاتا، وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے ساتھی سے یہ بات کہی کہ دیکھو! ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ایک لاکھ روپیہ کے کیش (نقد) آپ فرض کرے، اور اس کو ایک چھوٹی سی صندوق اور پیٹی میں رکھے اور اس کو لاک کر دے، تالا لگا دے پھر اس کو دوسری پیٹی میں رکھے اسے تیسری میں رکھے اسے چوتھی میں رکھے اسے پانچویں میں رکھے دس پیٹی میں اس کو بند کرے اور سب پہ تالا لگائے اور وہ یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے ساتھی سے پوچھا تالا کھولے بغیر اور توڑے بغیر پیٹی کھولے بغیر اور توڑے بغیر اندر کے وہ ایک لاکھ کے کیش کیسے غائب ہو سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اس کی تو کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ پیٹی بھی نہ کھلے تالا بھی نہ کھلے اور وہ ایک لاکھ کے کیش غائب ہو جائے، تو فرمایا کہ: اللہ تعالی نے ہمارے ذہن میں ایک بات ڈالی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ جو بادشاہِ وقت اور حاکمِ وقت ہے وہ یہ آرڈر اور حکم نافذ کرے کہ اب تک جتنے سکّے

تھے، اور نوٹ تھے، وہ سب کے سب غیر معتبر ہے، اب نئے سکّے شروع کئے جائیں گے، تو بادشاہِ وقت پچھلے سکوں کو غیر معتبر قرار دیئے جانے کا حکم اگر نافذ کرے گا تو وہ ایک لاکھ کیش کی روح جو ہے وہ نکل گئی، اب وہ صرف کاغذرہ گئے اندر، تو امر کی وجہ سے یہاں پر کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنی اور کیش کی جو روح تھی وہ رخصت ہو چکی ہے، تو اگر امرِ الٰہی کے نتیجہ میں انسان کی روح رخصت ہو جاتی ہے تو کونسے تعجب کی بات ہے۔

کل نفس ذائقة الموت

تو قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ''اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدة'' (نساء، آیت:۷۸) کہ تم جہاں بھی ہو موت تمہیں آ پکڑے گی چاہے تم مضبوط اور مستحکم بروج میں ہو، مضبوط مکانوں میں ہو مگر حق تعالیٰ کی طرف سے وہ آنے والی چیز ہے وہ تو آ کر رہے گی، اس کے تو ٹلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

مجھ سے مدرسہ میں ایک طالب علم نے پوچھا کہ موت جب آنی ہے اسی وقت آتی ہے اس سے پہلے نہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ملک الموت پہنچے ہیں ساری گفتگو ہوئی گفتگو ہونے کے بعد پھر انہوں نے طمانچہ کھایا، اسکے بعد گفتگو رہی ساری وہ ساری تفصیلات اور بعد میں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس گئے اور شکایت کی وغیرہ وغیرہ اور وہاں سے کہا گیا کہ ان سے کہو کہ جانور کی پشت پر ہاتھ رکھے اور جتنے بال ہاتھ میں آئیں گے اتنے سال زندگی رہے گی، پوچھا کہ اسکے بعد پھر کیا، تو کہا پھر موت، (بخاری شریف، کتاب الجنائز) تو طالب علم نے پوچھا کہ موت کا وقت تو ان ساری باتوں کے بعد آیا، تو پھر وہ اس سے پہلے کیسے آئے، تو میں نے کہا کہ قرآنِ کریم سے جو یہ بات معلوم

ہوتی ہے کہ موت اپنے وقت سے نہیں ٹلتی ہے وہ بالکل درست ہے، اور وہ موت سے پہلے جو آئے وہ ملک الموت آئے تھے، موت تھوڑی آئی تھی، موت تو جب آنی ہے اسی وقت آئی۔

ایک عالم عالمِ مثال بھی ہے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ روحِ ربانی نیند کی حالت سے گذرتی ہے اور جس چیز سے مناسبت ہوتی ہے گویا اس مقام پہ ٹھہرتی ہے، اسی لئے ایک عالم مستقل عالمِ مثال ہے اور عالمِ مثال میں اس عالم میں جیسی چیزیں موجود ہیں اس کے عکس موجود ہیں، چنانچہ ایک موقعہ پر ایک شخص کسی دور آبادی میں پہنچے اور کسی کنویں میں انہوں نے جھانک کر دیکھا تو اندر سے آواز آئی اس آواز کا حاصل یہ تھا کہ ایک عالم اور بھی ہے اور اس عالم کی حقیقت یہ ہے کہ" آدمهم كآدمنا ،ونوحهم كنوحنا، ومحمد كمحمدنا ﷺ (الخیر الجاری شرح صحیح البخاری، ج۴ص ۵۲) اس عالم کے اندر اس عالم کی طرح آدم بھی ہیں، اور نوح بھی ہیں اور محمد ﷺ بھی ہیں، اور حضرت ادریس علیہ السلام بھی ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ہیں ، یہ سارے حضرات موجود ہیں علامہ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ یہ درحقیقت عالمِ مثال کی ایک چیز ہے کہ جو چیزیں اِس عالم میں ہے وہ عالمِ مثال میں بھی ہے، یہ نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری دنیا باقاعدہ اس طریقہ سے ہو اور وہاں بھی پیغمبروں کا سلسلہ ہو، ویسے دنیا اور عالم اور آبادیاں یہ تو بہت ہیں، میں نے بتایا تھا کہ اسیؔ ہزار تک عالم کا ذکر ہے۔ (طشت جواہر ص ۲۶ بحوالہ سبع سنابل)

موجودہ سائنس تو ستاروں کی دنیا میں ہی ابھی گم ہے

اور آج کی موجودہ ترقی یافتہ سائنس تو ستاروں کی دنیا ہی میں گم ہے کہ کتنی اسکی

مخلوقات کتنی اسکی تعداد کتنے اسکے عوالم اسکی کیا کیا کیفیتیں اسی میں متحیر ہیں اور اسکے اوپر تو بقول اقبال مرحوم کہ:

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تو اوپر کا عالم تو خیر پوچھنا ہی کیا۔

سچے خواب کس کو نظر آتے ہیں؟

تو بات یہ چل رہی تھی کہ خواب میں روحِ ربانی اندر سے نکلتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آدمی قبلہ رو سوئے اور باوضو سوئے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ سوئے تو اس صورت میں خوابات بھی اچھے نظر آتے ہیں، (انبیاء کرام اور صالحین کے خواب ص ۱۴) یہ بھی تجربہ ہے کہ جو سچے اور صالحین اور متقی ہیں تو ان کو خواب بھی اچھے دِکھتے ہیں، اور جن کی زندگیاں رف ہیں اور لوفر قسم کے انسان ہیں تو ان کو دِکھتا بھی ایسا ہی ہے، بدخوابی کی شکل ہوتی ہے کہ کوئی دوڑا رہا ہے، کوئی کُدا رہا ہے، کوئی بھگا رہا ہے، کہیں گڑھے میں گر رہے ہیں، کہیں مصیبت میں مبتلا ہیں، ایسی ہی چیزیں نظر آتی ہیں اَلا بَلا سب، تو غرض یہ کہ روحِ ربانی نیند کی حالت میں بدن سے علیحدہ ہوتی ہے اور روحِ حیوانی برقرار رہتی ہے (مقالاتِ حکیم الاسلام ص ۴۱۹) اور دونوں میں بڑی مناسبات ہیں۔

اگر کسی چیز کو خواب میں دیکھنا ہو تو اس کی ایک تدبیر

یہی وجہ ہے کہ اگر صحیح حالت پر آدمی سویا ہو اور تخیل بھی صحیح ہے تو کتابوں میں ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ اگر کسی شئی کو خواب میں دیکھنا ہو تو سوتے وقت اس کا دھیان باندھے اور اس کا تصور رکھے اور پورے طور پر اس کے خیال میں گم ہو تو بہت ممکن ہے کہ

وہ چیز نیند میں نظر آئے، اور یہ کوئی بعید بھی نہیں، اس لئے کہ خواب کی تین قسموں میں سے ایک قسم تخیلِ نفسانی ہے کہ جو خیالات اندر جمے بسے ہیں اس خیالات کا آدمی ادراک کرلیتا ہے۔

خواب صرف دو شخصوں سے بیان کیا جائے

تو بہرحال، حاصل یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء خواب سے ہورہی ہے کہ انہوں نے خواب دیکھا اور خواب میں دیکھا کہ چاند، سورج اور گیارہ ستارے ان کو سجدہ کررہے ہیں، ظاہر بات ہے کہ چھوٹے تھے، ننھے منھے تھے، مگر صاحبِ صلاحیت تھے، خواب دیکھنے کے بعد اپنے والدِ بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام سے اس کا ذکر فرمایا، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''یابنی'' اے منھے، اے چھوٹے بیٹے یہ پیار کا جملہ ہے، ''لاتقصص رؤیاک علی اخوتک'' اپنے بھائیوں پر اسے مت بیان کرنا، اس سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ہر شخص کے سامنے خواب بیان نہ کیا جائے، اور جیسا کہ میں نے ابھی ترمذی شریف کی حدیث بھی سنائی تھی کہ خواب سنایا جائے یا تو حبیب کو یا لبیب کو، ہر شخص کو سنانے کی ضرورت نہیں ہے، جو صالحین وعارفین ہیں ان کو سنایا جائے، اور جو لوگ کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق قائم کئے ہوئے ہیں وہ اپنے شیوخ ہی کے سامنے اس کا ذکر کرے، تو غرض یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ: اے منھے ''لاتقصص رؤیاک علی اخوتک'' تم اپنے خواب کو مت بیان کرو اپنے بھائیوں پر ’فیکیدوا لک کیداً‘ ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی کید، تمہارے خلاف کوئی چال، تمہارے خلاف کوئی تدبیر کریں گے، اور پھر وجہ ذکر فرمائی کہ بیشک شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔

ایک اہم تنبیہ

یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دنیا کے پہلے معبر ہیں یہ درست نہیں ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ علم عطا فرمایا ''ولنعلمه من تاويل الاحاديث'' خواب کی تعبیر کا علم ہم انہیں سکھائیں گے، تو یہ بات تو اپنی جگہ صحیح ہے، ورنہ حضرت یعقوب علیہ السلام بھی تو تعبیر جانتے تھے اسی لئے خواب سن کر تعبیر سمجھ گئے، اور تعبیر سمجھ کر ہی اپنے ننھے منھے بیٹے کو احتیاط کی تلقین کی، گویا یہ خواب پتہ دے رہا تھا کہ یہ شخص بڑے درجہ کا ہوگا، اس وجہ سے فرمایا کہ: اپنے بھائیوں پر اس خواب کو بیان نہ کرنا کہ کہیں وہ کوئی کید کرے۔

برادرانِ یوسف صحابی تھے، نبی نہیں تھے

اب یہاں ایک بحث ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے نبی ہیں یا نہیں؟ تو اگرچہ بعض علماء اس طرف تشریف لے گئے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے نبی تھے، مگر زیادہ تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ ولی تھے صحابیت کا شرف ان کو نصیب ہوا ہے اور ان سے کچھ غلطیاں بلاشبہ ہوئی ہیں اور بڑی بڑی ہوئیں، مگر بعد میں ان کی توبہ کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے معافی مانگی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں معاف کیا، اور حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی مانگی انہوں نے بھی معاف کیا، اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کچھ آثار ایسے نقل کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کیلئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے خاص طور سے دعا کی اور اُدھر سے بتایا گیا کہ حق تعالیٰ نے قصور معاف کر دیا، اور پیغمبر کی صحبت میں تھے اس لئے صحابیت میں تو کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔

برادرانِ یوسف کی صحابیت پر ایک لطیف نکتہ

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کے باب میں فرمایا کہ ''اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم'' (مشکوۃ شریف ص۵۵۴)' میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جن کی بھی اتباع کروگے ہدایت پاجاؤ گے تو صحابہ کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس طرف بھی وہاں پر ان کو'' کواکب،، سے تعبیر کیا گیا ستاروں سے تعبیر کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ صحابیت کی شان ان میں موجود تھیں، یہ الگ بات ہے کہ ان سے کچھ چیزیں اس قسم کی وجود میں آئیں مگر اسکے بعد پھر توبہ بھی کیں۔

اہل بیت اور صحابہؓ کی مثال

حدیث شریف میں فرمایا نبیٔ کریم ﷺ نے کہ میرے اہل بیت کی مثال تو ایسی ہیں جیسے نوح علیہ السلام کی کشتی اور میرے صحابہ کی مثال ایسی ہیں جیسے آسمان کے ستارے (تفسیرِ عزیزی پارہ ۲۹ ص ۱۲۵/۱۲۶) اور ظاہر ہے کسی کو سفر کرنا ہو اور سمندر سامنے ہو تو اس کے لئے روشنی کی بھی ضرورت ہے اور کشتی کی بھی ضرورت ہے، تو گویا ادھر اشارہ ہے کہ میرے اہل بیت کا اتباع کرو تو یہ کشتیٔ نوح میں داخل ہونے اور اس میں بیٹھنے کے مشابہ ہیں، اور میرے صحابہ کی تقلید کرو تو یہ ایسا ہے کہ ستاروں سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے اور روشنی حاصل کی جارہی ہے۔

بعض احسان فراموشوں کو صحابہ میں کیڑے نکالنے کا ذوق ہوتا ہے

یہاں ایک بات اور بھی ذہن میں رہے کہ صحابہ محفوظ ہوتے ہیں معصوم نہیں ہوتے، عام طور پر صحابہ کی زندگی آپ دیکھیں گے بڑی بے داغ زندگی ہے، مگر اس امت میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں کہ جن کو یہ شوق ہوتا ہے کہ صحابہ میں کیڑے نکالے، ہم دلیلیں

بعد میں دیں گے لیکن ایک بات یہ بتانا چاہتے ہیں آپ کو اور بہت پتہ کی بات ہے بنیادی اور سائیکولوجیک چیز ہے وہ، وہ یہ ہے کہ ایک فطری اور نفسیاتی قاعدہ ہے کہ آدمی کو جس سے محبت ہوتی ہے تو اس کو محبوب کے کمالات ہی نظر آتے ہیں، اور آدمی کو جس سے نفرت ہوتی ہے تو اس کو اس کے عیوب ہی نظر آتے ہیں۔

نگاہِ محبت عیوب پر نہیں پڑتی ہے

اسی لئے ایک بزرگ کے پاس ایک شخص رہے، اور رہنے کے بعد جب جانے لگے اور رخصت ہونے لگے تو کہنے لگے کہ حضرت! مجھ میں جو جو عیب اور کمزوریاں آپ نے دیکھی وہ بتائیے، فرمایا کہ: کسی اور سے پوچھو! تم تو میرے ساتھ محبت کے ساتھ رہے اور میں نے تمہیں محبت کی نگاہ سے دیکھا، تو نگاہِ محبت عیب پر نہیں پڑتی ہے بلکہ عیب کی بھی مناسب توجیہ اور تاویل کر لیتی ہے، جیسے ماں کا لختِ جگر ہوتا ہے تو اس میں ہزار عیب ہوں مگر ماں اپنے ننھے منھے بچے کی کوئی تاویل کرے گی اور کوئی توجیہ کر لے گی، تو محبت کی نگاہیں عیوب کے اندر بھی کمالات ڈھونڈھتی ہیں، اور وہ نگاہ جس میں حسد اور عناد ہو وہ کمالات میں بھی جو ہے عیب کی شکل تلاش کرتی ہیں۔

آپ ﷺ کے شاگردِ اوّلین حضراتِ صحابۂ کرامؓ ہیں

تو اب آپ انداز لگائیے کہ نبیٔ کریم ﷺ کے صحابہ آپ کے سب سے اولین شاگرد وہی ہیں ایک بات تو یہ، دوسری بات یہ کہ دین کو پڑھا بھی ہے اور سمجھا بھی نبیٔ کریم ﷺ سے، تیسری بات یہ کہ ایسی بے مثال قربانیاں انہوں نے پیش کی ہیں کہ ان کی جان پر آبنی تو اسے برداشت کیا، مال پہ آبنی تو اسے برداشت کیا، اور آبرو پر آبنی تو اسے برداشت کیا، اور کتنے ایسے ہیں جنہوں نے وطن سے بے وطن ہو کر اپنی قبریں باہر ملکوں

میں بنوائیں ، اورآسمان کی نگاہیں اس پر گواہ اور شاہد ہیں کہ کتنے سمندروں میں، کتنے خشکیوں میں، بیابانوں میں کہاں کہاں ختم ہوئیں،تو دین کیلئے بے پناہ محنتیں کیں، اورنبئ کریم ﷺ کے اولین شاگرداور تلامذہ حضراتِ صحابہؓ کی ذات ہیں۔

صحابۂ کرام سے اعتماداٹھانا قرآن وحدیث سے اعتماداٹھانا ہے

اب اگر اسکے بعد کسی صحابی سے کوئی بات ہوجائے تو اسے بنیاد بنا کر انہیں بےاعتماد قرار دینا ،تومیں ان لوگوں سے ایک سوال کرتا ہوں کہ جوصحابہ پر جرح کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث شریف کا اعتبار نہیں ہے،تو ہم کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا بھی کیا اعتبار ہے؟ اس لئے کہ قرآنِ کریم آپ کے گھر میں تو نازل ہوانہیں ہے، جبرئیلِ امین آپ کے پاس تو آئے نہیں، نبئ کریم ﷺ سے قرآنِ کریم کو لینے والے صحابہ ہی تھے، جب تم صحابیت کے واسطے کو بیچ میں مخدوش قرار دیتے ہو اسمیں کیڑے نکالتے ہو بےاعتمادی پیدا کرتے ہوتو جس طریقہ سے حدیث شریف نا قابلِ اعتبار ہے حدیث شریف ماننے کے لائق نہیں رہتی، قابلِ تسلیم نہیں ہے،تو قرآنِ کریم بھی قابلِ تسلیم نہیں رہے گا، کیوں کہ انہیں حضرات کی برکت سے ساراذخیرہ امت کو پہنچا ہیں، اور ایک بات ذہن میں رہے کہ دیکھئے! پیغمبر کی جوذات ہے وہ اسوہ اور نمونہ ہیں پوری امت کیلئے جواللہ تعالی کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، کہ قرآنِ کریم اور کتاب کی آیتیں علمی ہوتی ہیں، اور پیغمبر ایک عملی ذات ہیں کہ وہ عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔

بعض چیزیں جوصحابۂ کرام سے گذاری گئی اس کی وجہ

اچھا! کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ پیغمبر پراس کا گذارنا مناسب نہیں ہے، یہ تو ہونہیں سکتا کہ خدانخواستہ پیغمبر چوری کرے اور نبی کا ہاتھ کٹے تا کہ ہاتھ کٹنے کا پریکٹیکلی

اور عملی نمونہ امت کے سامنے آجائے، یہ ہونے سے رہا، یا خدانخواستہ یہ نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر معصوم شراب نوشی کرے اور کوڑے لگے اور دنیا کے سامنے اس کا بھی عملی نمونہ آجائے کہ اس طریقہ سے شراب پر کوڑے لگائے جاتے ہیں، اور یہ معاذ اللہ ہو نہیں سکتا ہے کہ پیغمبر معصوم زنا کرے اور پھر پیغمبر کو کوڑے لگے اگر شادی سے پہلے ہو، اور شادی کے بعد ہو تو رجم ہو اور دنیا کے سامنے عملی نمونہ آئے، یہ ساری چیزیں مقامِ نبوت کے خلاف ہے، پیغمبر معصوم ہوتا ہے اللہ تعالی کی طرف سے پیغمبر کی حفاظت اور عصمت کی جاتی ہے، حتی کہ نبوت سے پہلے بھی پیغمبر کے دل پہ معصیت کا خطرہ نہیں گذرتا، بلکہ ایک جماعت متکلمین کی ادھر گئی ہے کہ نبوت ملنے کے بعد صغیرہ کبیرہ سے تو محفوظ ہوتا ہے، نبوت ملنے سے پہلے کبائر سے اور ایک جماعت صغائر سے بھی محفوظ بتلاتی ہیں، (عصمتِ انبیاء ص ۲۸) اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے اس لئے کہ نبیوں نے اپنی زندگی قوموں کے سامنے نمونہ کے طور پہ پیش کی ہیں "فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ" (یونس، آیت: ۱۶) کہ ایک زمانہ ہم تمہارے درمیان گذار چکے ہیں، اسی لئے آپ نہیں دیکھتے کہ بعض دفعہ کوئی آدمی کسی چیز کا دعویٰ کرتا ہے تو لوگ اس کی پچھلی لائف کو بیان کرتے ہیں کہ صاحب! اس نے پچھلے زمانہ میں یہ یہ گورکھ دھندے کئے تھے، (غلط کام کئے تھے) مگر پیغمبر کی لائف اتنی روشن اور صاف ستھری ہوتی ہے کہ وہ بطورِ دعویٰ کہ اس کو پیش کرتا ہے کہ ہم ایک زمانہ تک تمہارے درمیان میں رہے ہیں، ہم نے نہ جھوٹ بولا، نہ دھوکہ بازی کی، اور نہ کسی قسم کی جعل سازی اور چالبازی کی، کچھ بھی نہیں ان چیزوں سے ہم بچے رہے ہیں تو پیغمبروں کا تو یہ حال ہے، اس لئے پیغمبر معصوم کے مناسب تو یہ چیزیں ہو نہیں سکتی۔

صحابی کی توبہ کا اثر

اور دین کو عملی طور پر لوگوں کے سامنے لانا بھی مطلوب ہے حق تعالیٰ کو، تو اکاّ دکاّ کوئی واقعہ کسی صحابی سے ایسا ہو گیا، مگر اس کے بعد انہوں نے ایسی توبہ کی ہے، حدیث شریف میں حضرتِ ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ آتا ہے ان سے زنا ہو گیا تھا اسکے بعد ان پر رجم ہوا ہے، ان کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ انہوں نے ایسی توبہ کی ہیں کہ اگر وہ پورے مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کی مغفرت کا باعث بن جائے گی، اب آپ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ ان کا ایمان کیسا قوی ہوگا (غیبت کیا ہے؟ ص ۵/۷۴ بحوالہ ابو داؤد شریف)

ایمان ان کے دلوں میں پہاڑوں کی طرح راسخ تھا

اسی لئے کسی صحابی سے کسی نے دوسرے صحابہ کے باب میں پوچھا کہ کیا صحابہ ہنستے بھی تھے؟ فرمایا کہ ہاں! مذاق کرتے تھے، خوش طبعی کرتے تھے مگر ایمان ان کے قلب میں پہاڑوں کی طرح راسخ تھا (حیاۃ الصحابہ ص ۶۰ بحوالہ ابونعیم فی الحلیۃ ج ا ص ۳۱۱) یہ کیفیت تھی، اتنا زبردست ایمان، اسی لئے حدیثِ پاک میں فرمایا گیا کہ میرا صحابی ایک مُد ایسا سمجھ لے جیسا ایک سیر صدقہ کریں اور میری امت کا دوسرا آدمی احد پہاڑ کے برابر صدقہ دیں تو وہ درجہ نہیں پا سکتا (بخاری شریف ۵۱۸/۱، ترمذی شریف ۲۲۵/۲) اس لئے کہ اس کا وہ مقام ہی نہیں ہے۔

مقامِ صحابہ کا اندازہ کریں

اسی لئے عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت عمر بن

عبدالعزیز رحمہ اللہ جو بڑے منصف شخص گذرے ہیں اور عجیب وغریب خلیفہ گذرے ہیں ان کا درجہ بڑھکر ہے یا امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کا درجہ بڑھکر ہے کہ جن کی حضرتِ علی رضی اللہ تعالی عنہ سے جنگ ہوئی ہے، اور صحابہ میں وہ جنگیں کیوں ہوئی، اس میں بھی بڑی حکمتیں ہیں، تو یہ پوچھا کہ کس کا درجہ بڑھ کر ہے، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بیچارے کی کیا حیثیت ہے، امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ آپ ﷺ کے برادرِ نسبتی اور صحابی ہیں وہ جس جنگ میں شریک ہوئے تو گھوڑے کی ٹاپوں سے جو گردوغبار اٹھا ہے اور وہ جما ہے ناک پہ آکر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کے اس غبار کے برابر نہیں ہوسکتے (خطباتِ حکیم الاسلام ج ا ص ۱۶۰) اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وہ آنکھیں کہاں سے لائیں گے جن آنکھوں سے حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ نے نبیِ کریم ﷺ کو دیکھا ہے، اور مجلسِ مبارک میں شریک ہوئے ہیں (حوالا بالا) تو حق یہ ہے کہ ان حضرات کا بہت بڑا درجہ ہے، تو مجھے یہ بتانا ہے کہ ’’احد عشر کو کبا‘‘ میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی صحابیت کا پتہ چلتا ہے، یقینی طور پر اور قطعی طور پر نبوت کا علم نہیں ہے، اگرچہ بعض حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ وہ نبی تھے، مگر راجح قول اور تحقیقی بات یہی ہے کہ وہ صحابیت کے مقام پر فائز تھے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک نصیحت

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب باپ سے ذکر کیا باپ نے فرمایا کہ بھائیوں سے اسے بیان نہ کرنا ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی کید کریں اور تدبیر کریں، یہ منشاء نہیں تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کا کہ جو بات ہونے والی ہے انکی تدبیر سے ٹل

جائے، یہ نہیں ہے، ضرر کا اندیشہ ہے تو باپ از راہِ شفقت اپنی اولاد کو بچانا چاہتا ہے اور باپ کو حق بھی ہوتا ہے، اور وہ بڑے بھی تھے، پیغمبر بھی تھے، پھر پیغمبر جتنا انسان کی معرفت رکھتا ہے اور اس کے مزاج کو سمجھتا ہے بھلا کون سمجھے گا، تو پہلے سے پیش بندی کی اور وجہ بھی یہ بیان فرمائی کہ ''ان الشیطان للانسان عدو مبین'' شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے وہ سب کیلئے کوشش کرتا ہے تو ممکن ہے کوئی بات پیش آجائے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بڑوں کی بات بڑی ہوتی ہے، بعد میں کچھ ایسی ہی شکلیں سامنے آئی، چھوٹے بھائی جو بنیامن تھے ان کا تذکرہ جو ہے مستقل نہیں کیا گیا بلکہ یہ فرمایا اپنے بھائیوں پر خواب بیان نہ کرو، تو دوسرے جو دس بھائی تھے انکے باب میں تو اندیشہ تھا کہ ان سے کوئی ضرر پہنچے اور یہ چھوٹے ہیں وہ ضرر پہنچانے سے رہے مگر اپنے بچپنے کی وجہ سے اپنے چھوٹے پن کی وجہ سے اپنی کم سمجھی کی وجہ سے ہوسکتا ہے منہ سے نکل جائے اور دوسرے بھائیوں کو خبر ہو اور نتیجۃً پھر ضرر کی شکل سامنے آئے اس لئے ان سے بھی بیان کرنے سے روکا۔

دو حدیثوں میں تطبیق کی صورت

اس سے یہ بھی معلوم ہوا جیسا کہ صاحب روح المعانیؒ نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اپنی حاجتیں جب پوری کرو تو کتمان سے کام لو اور چھپانے سے کام لو، اللہ تعالیٰ نے آپ کو نعمت سے نوازا ہے تو اس میں دو پہلو ہے، اگر کسی قسم کے ضرر اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو نعمت کو ظاہر کرنا پسندیدہ ہے، حدیث شریف میں فرمایا آپ ﷺ نے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا چاہتے ہیں (جواہر الاحادیث، حدیث نمبر ۱۱۹۴) جیسے مثلاً اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے اور مالدار ہے اب وہ کپڑے ایسے پہنتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تین سو تیرہ فقیر اس کے خاندان میں گذرے ہیں بعد میں یہ تشریف

لائے ہیں، تو اس طرح سے رہنے کی کیا ضرورت ہے، اگر اللہ تعالی نے دیا ہے تو اپنی پوشاک، اپنی حیثیت، ایسی رکھو کہ دوسروں پر ظہور ہو اور دوسروں کو بھی نوازو اور خود بھی قرینے سے رہو، تو حق تعالیٰ جب نعمت دیتے ہیں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ بندے پر نعمت کا اثر دیکھا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ظہور ہو، مگر حدیث شریف میں یہ بھی فرمایا گیا ''کل ذی نعمة محسود '' (تفسیر ابن کثیر) کہ ہر صاحبِ نعمت پر حسد ہوتا ہے، اس لئے اپنی نعمتوں کے باب میں یہ بھی اہتمام ہونا چاہئے کہ کہیں حسد کا شکار ہو کر ضرر میں نہ پڑ جائے، جیسے مثال کے طور پر آپ کو ایک شخص نے ایک لاکھ روپیہ بطورِ انعام مرحمت فرمائے، اب یہ اللہ تعالی کی ایک نعمت ہے مگر اس کو آپ لے کر پھرتے پھریں اور گاتے پھریں تو ہوسکتا ہے کہ حسد ہو، جھگڑے ہو، لوٹ کھسوٹ ہو، فتنہ پیدا ہو تو ہر محل میں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ اس کو ظاہر کریں، مواقع سمجھنے کی بات ہے کہ کہاں جو ہے فتنہ اور ضرر کا اندیشہ ہے اور کہاں نہیں ہے، تو غرض یہ کہ فرمایا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی کید کریں اور کوئی چال چلے اس لئے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔

تین گناہوں سے خاص طور سے بچیں

ایک بات ذہن میں رہے کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی تین گناہوں سے خاص طور سے بچے، ایک حسد سے بچے، دوسرے کبر و تکبر سے بچے، اور تیسرے حرص سے بچے، اور آپ دیکھئے، عجیب بات ہے کہ آسمان میں سب سے پہلا گناہ جو ہوا ہے وہ کبر کا ہوا، ابلیس نے تکبر سے کام لیا تو وہ مردود ہوگیا، جنت میں سب سے پہلے جو بات ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے وہ خواہش کی بنا پر ہے کہ دانہ کھانے کی خواہش پیدا ہوئی ان کے دل میں، اب اس میں اللہ تعالی کی ہزاروں حکمتیں ہیں کہ اس

عالم میں آئیں گے خلافت کا نظام چلے گا وغیرہ وغیرہ مگر اس کے نتیجہ میں ہوا یہ کہ جنت چھوٹی، اور اس طرف دنیا میں قابیل کو اپنے بھائی ہابیل پر حسد ہوا ہے، قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کثرت سے پیدا ہونا شروع ہوئی ایک صبح کا حمل ہوتا تھا اور ایک شام کا حمل، تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ ہر حمل سے ایک بچہ اور ایک بچی پیدا ہوتی تھی، تو جب پیٹ بدل جائے اور حمل بدل جائے تو وہ گویا نسب بدلنے کے قائم مقام تھا شروع میں، مثلاً صبح ایک لڑکا لڑکی پیدا ہوئے اور شام میں یا دوسرے دن پھر ایک لڑکا لڑکی پیدا ہوئے، تو آج کا لڑکا کل کی لڑکی سے، اور آج کی لڑکی کل کے لڑکے سے نکاح کرتے تھے، اب ہوا یہ کہ ایک بیٹا تھا قابیل اس کی بہن زیادہ خوبصورت تھی، اور ایک بیٹا تھا ہابیل اس کی بہن زیادہ خوبصورت نہیں تھی، تو حضرت آدم علیہ السلام نے ضابطہ بیان فرمایا کہ قابیل کی شادی ہابیل کی بہن سے ہوگی، اور ہابیل کی شادی قابیل کی بہن سے ہوگی، مگر قابیل نے یہ بات کہی کہ میری بہن حسین ہے میں اس کے ساتھ شادی کروں گا (گلدستۂ تفاسیر ج۲ص۷۷) تو ظاہر بات ہے کہ قوموں میں رواج ہو، ہو، باقی یہ کہ شریعت میں اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے، تو حضرت آدم علیہ السلام نے منع فرمایا مگر اس نے ضد کی اور ہابیل سے اسے حسد پیدا ہوا اور اس کے نتیجہ میں بات آگے بڑھی جس کی تفصیل ہے کتابوں میں۔ خلاصہ یہ کہ اس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا، اس میں متشابہات لگ جاتی ہے اس لئے اس کو یاد رکھنے کے لئے یہ ذہن میں رہے کہ قاتل میں بڑا قاف ہے اور قابیل میں بھی بڑا قاف ہے، تو ایک مقام پہ تکبر ہوا جس میں ابلیس مردود ہوا، حضرت آدم علیہ السلام سے ایک بات ہوگئی بہت احتیاط کے لفظ بولنا چاہئے، بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ "آدم سے ہوئی نادانی جنت کا چھوٹا دانہ پانی" یہ مہمل اشعار ہے، اس میں بڑی احتیاط ہونا چاہئے، پیغمبر کے معاملات میں اللہ تعالی کی عجیب عجیب حکمتیں ہوتی ہیں۔

حسنات الابرار سیئات للمقربین

اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کا جب ذکر ہوتو بہت احتیاط ہونی چاہئے، دیکھو، ایک جگہ قرآنِ کریم میں فرمایا کہ ’’وعصیٰ آدم ربه فغویٰ‘‘(طه ،آیت: ۱۲۱) آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی، ایک جگہ تو یہ فرمایا، دوسری جگہ فرمایا’’ فنسی آدم ولم نجد له عزماً ‘‘ (طه ،آیت:۱۱۵) کہ آدم علیہ السلام بھول گئے، تو اِدھر یہ بھی اور ادھر وہ بھی، تو وہ حقیقۃً بھول تھی مگر ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ حق تعالیٰ اس کو عصیان سے تعبیر کررہے ہیں، تھا تو وہ نسیان مگر اس کو نافرمانی سے تعبیر کیا بڑے مقام کی وجہ سے، کہ بڑوں کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوجاتی ہیں، ’’مقرباں رابیش بود حیرانی‘‘ تو تین گناہ سے خاص طور سے بچا جائیں، ایک حسد سے، دوسرا حرص سے، تیسرا تکبر سے۔

حسد بھی عجیب بلا ہے

اور حسد بھی عجیب بلا ہے رشتہ داروں میں بھی ہوجاتی ہے، اس وقت آپ خود دنیا میں دیکھ لیجئے کہ رشتہ داروں کو رشتہ داروں سے حسد ہوجاتا ہے، بلکہ جگر مرحوم نے تو بڑی عجیب بات کہی کہ رشتہ داری کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ بہت دن ہوجائے اور ملاقات نہ ہوتو پھر خط آتا ہے کہ تم بھول گئے، تم کو محبت نہیں رہی، تو محبت کا ایک دھواں اٹھتا ہے، اور جہاں ملنے لگے تو پھر گرانی ہے، شکوہ ہے، شکایت ہے، پھر رنجشیں ہیں۔

تو وہ لکھتے ہیں کہ ؎

عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتہ دار
الگ رہیں تو دھواں دے اور ملے تو جلنے لگے

یہ لکڑی جب الگ ہوجاتی ہے تو محبت کا دھواں اٹھتا ہے اور ملنے کی شکل میں جلنا شروع ہوجاتی ہے۔

رشتہ داری میں تو شکوہ ہے ہی

تو رشتہ داری میں تو شکوہ ہے ہی صحیح، آپ یہاں سے اگر ہندوستان تشریف لے جائیں اور پچاس ہزار کا مال لے جائیں رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کیلیئے، وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ حضرت انگلینڈ سے خوب کما کر آئے ہیں، اور اس کے بعد آپ تقسیم کر کے واپس آئیں گے تو بعض رشتہ دار یہی کہیں گے کہ مجھے کیا دیا تم نے؟ سمجھ میں آتا ہے آپ لوگوں کے، بعض یہی کہیں گے کہ ہمارے لئے کیا کیا تم نے اور ہمیں کیا دیا تم نے ۔ تو یہ شکل ہے۔

تو شکوی شکایت انسانی مزاج ہے، تو آدمی سب کو کیسے راضی رکھ سکتا ہے، تو بہر حال، یہ ضمنی بات تھی۔

میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ حسد ایسی بری بلا ہے کہ پرایوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور اپنوں کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے، رشتہ دار اور اعزاء واقرباء کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے، اور اب رہا یہ کہ حسد کہتے کس کو ہیں؟ اور اس کے احکام کیا ہیں؟ اسکی تفصیلات انشاء اللہ پھر کسی وقت کریں گے، دعا کیجئے اللہ پاک تمام مکارہ سے حفاظت فرمائیں، اور اپنی مرضیات پہ چلائیں ۔ آمین۔

درس نمبر ﴿۶﴾

بعد از خطبہ

اذقال یوسف لابیه یاابت انی رایت احدعشر کو کبا و الشمس والقمر رایتهم لی سجدین☆قال یبنی لاتقصص رؤیاک علی اخوتک فیکیدوا لک کیدا، ان الشیطن للانسان عدو مبین☆ (یوسف،آیت:۴/۵)

حضرت یعقوب علیہ السلام کی حضرت یوسف علیہ السلام کو نصیحت

محترم حضرات! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے خواب کو بھائیوں پر ظاہر کرنے سے منع فرمایا چونکہ تعبیر سمجھ گئے تھے، چاہے فراست سے اور ذوق سے تعبیر سمجھے ہو، یا وحیِ مبین کے ذریعہ سے سمجھے ہو یہ بھی امکان ہے، اور بھائی بھی مرتبۂ صحابیت پر تھے اس لئے وہ اگر سمجھ لیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لئے انہیں خواب بیان کرنے سے منع فرمایا، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ پھر وہ شیطان کے ورغلانے سے کوئی کید، کوئی چال، کوئی حیلہ کریں جس سے ضرر کا اندیشہ ہے، اور فرمایا کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔

متقی آدمی کا خواب عموماً سچا ہوتا ہے

کل خواب پر گفتگو چل رہی تھی، اور اس میں بھی عجیب عجیب مناسبات ہوتی ہیں جس کا تذکرہ کتابوں میں کیا گیا ہے، اب آپ انداز لگائیے کہ آدمی کی نورانیت، تقوی، اور صلاح کی وجہ سے جو خواب ہوتا ہے وہ عموماً سچا ہوتا ہے۔

کتابوں میں ایک خواب کا تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالی

عنہ نے خواب دیکھا، اور یہ زمانہ ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی خلافت کا، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے یہ خواب دیکھا کہ مسجد نبوی میں آپ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی، اور نماز پڑھانے کے بعد قبلہ کی جانب جو دیوار ہے اس کو ٹیک لگا کر بیٹھے، اور آپ ﷺ کے سامنے کھجور کا ایک ٹوکرا رکھا گیا، اور آپ ﷺ نے جتنے مصلی تھے سب کو ایک ایک کھجور تقسیم فرمانا شروع کی، اور اسی میں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی باری آئی تو ان کو بھی ایک کھجور دی، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے خواب میں وہ کھجور کھائی، وہ نہایت لذیذ، خوش ذائقہ اور مزے دار تھی، اور کیوں نہ ہو کہ وہ آپ ﷺ کے ہاتھوں سے ملی تھی، تو کھجور کھا کر خواب ہی میں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کو یہ خیال آیا کہ کاش مجھے دوسری کھجور بھی مل جاتی، مگر ملی نہیں، خیال آیا اور اسکے بعد پھر آنکھ کھل گئی، حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی خلافت کا دور ہے، فجر کی نماز پڑھنے کیلئے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ مسجد تشریف لے گئے، وہاں کیا دیکھا کہ نماز سے فراغت پر بالکل اسی طرح بعینہ جس طرح خواب میں آپ ﷺ کو دیکھا تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ بھی دیوار کو ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے سامنے کھجور کا ایک ٹوکرا پیش کیا گیا، اور دیکھتے ہیں کہ جس طرح خواب میں حضور ﷺ نے مصلیوں کو ایک ایک کھجور تقسیم کی تھی حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ بھی تقسیم فرمارہے ہیں، اور جس طریقہ سے اوروں کو دی حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کو بھی پیش فرمائی، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے کھائی تو وہ کھجور نہایت پرلذیذ اور انتہائی خوش ذائقہ تھی، تو یہ خیال پیدا ہوا کہ کاش! مجھے دوسری دیتے دوسری کھجور ملتی مجھے، یہ خیال آنا تھا کہ فوراً حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ: اے علی! اگر رات خواب میں حضور ﷺ تمہیں دوسری کھجور دیتے تو میں بھی تمہیں دوسری کھجور دیتا اب آپ اندازہ لگائیے قلب کی صفائیت نورانیت اور فراست کا کہ کیسی کیفیت تھی کہ جس

کے نتیجہ میں انہوں نے اس حقیقت کو واضح فرمایا۔

خواب کی تعبیر یہ بڑا لطیف فن ہے

تو بہر حال! یہ بڑا لطیف فن ہے، اور صادق آدمی اگر خواب دیکھتا ہے تو خواب بھی سچا ہوتا ہے، اور اس کی تعبیرات بھی سامنے آتی ہیں، اور ویسی چیزیں ہوتی ہے لٹر کافیہ کہ معدہ بھرا ہوا ہے نور کلیے سے، اور چائے سے، اور پانی سے، تو پھر وہ آدمی ایسے ہی خواب دیکھتا ہے کہ کوئی اسے مار رہا ہے، کوئی دوڑا رہا ہے، کوئی بھگا رہا ہے کوئی کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے، کہیں گڑھے میں گرتا ہے، پھر بعد میں اٹھتا ہے تو آدمی سمجھتا ہے کہ اچھا ہوا جان چھوٹی، ورنہ ہماری تو آ بنی تھی، تو یہ شکل ہے، تو غرض یہ کہ اس میں عجیب عجیب مناسبات ہوتی ہیں۔

ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میری اہلیہ کی شرمگاہ پر دو مینڈھے چل رہے ہیں، خواب کا بھی کیا جوڑ ہے کہ بیوی کو دیکھا کہ اسکی شرمگاہ پر دو مینڈھے چل رہے ہیں اور آپس میں سینگ سے گویا لڑ رہے ہیں، اب خواب دیکھنے کے بعد اس کی تعبیر معبر سے پوچھی، تو تعبیر یہ سامنے آئی کہ تمہاری بیوی اپنی شرمگاہ کے بال کی صفائی بجائے دوا استعمال کرنے کے قینچی کے ذریعہ سے کرتی ہے، تو وہ قینچی سینگ سے تعبیر ہوئی ۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا مقام غیروں کی نظر میں

جیسا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بارے میں غالبًا حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے خواب میں دیکھا کہ کتابوں کی ایک الماری ہے، اور اس الماری میں سے ایک پیلا سانپ نکلا اور اسے جوتے سے منہ پہ مارا گیا اور وہ ختم ہوگیا، یہ خواب دیکھا گیا، اس کے بعد حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی، تو انہوں نے تعبیر دی کہ

سانپ تو دشمن ہے اور الماری چونکہ کتابوں کی ہے تو کوئی اہل کتاب دشمن ہے کہ وہ کتاب سے تعلق رکھنے والا ہے، اور وہ زرد اور پیلا اور یلو اس وجہ سے ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ وہ انگریز اور نصرانی دشمن ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں ایک رسم ہوتی ہے جس میں یہ ہوتا ہے کہ زرد پانی میں بچہ کا ہاتھ ڈبا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب اس نے یہ رنگ قبول کرلیا نصرانی، اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا کہ ''صبغة الله''، جتنے رنگ ہیں اس میں سب سے بہتر اللہ تعالی کا رنگ ہے،'' ومن احسن من الله صبغة'' (بقرة، آیت: ۱۳۸) اور اللہ تعالی سے بہتر رنگ کس کا ہوگا؟ اسی لئے اس کی عبارت بھی یہی ہے کہ ''الزمُ صبغة اللهٔ'' اللہ تعالی کے رنگ کو لازم پکڑو، اس لئے کہ یہ روح پر جاری ہوتا ہے اور اثر کرتا ہے، تو یہ تعبیر دی، اور اسے کچل دیا گیا گویا منہ کی کھائے گا وہ، (ملفوظاتِ فقیہ الامت ج ۱ ص ۵۷) ایسا ہی ہوا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا جب انگریز پادریوں سے مناظرہ ہوا تو ان کے حواس گم ہوگئے، اور شکست کھائی انہوں نے، بلکہ وہ اس بات کے قائل ہوئے ہے کہ اگر کسی کا بیان سن کر اسلام قبول کیا جاسکتا ہو اور مذہب تبدیل کیا جاسکتا ہو تو اس آدمی کا بیان ایسا ہے کہ اسکو سن کر مذہب تبدیل کر دینے کو جی چاہتا ہے، بہرحال، یہ ایک لطیف فن ہے۔

دو چیزوں کا ٹکراؤ ہی ترقی کا سبب بنتا ہے

تو فرمایا کہ: شیطان انسان کا دشمن ہے، تو ایک تو ہے شیطان کا وجود اور پھر وہ کھلم کھلا دشمن ہے، یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ کلی طور پر تسلیم کرنی پڑتی ہے، حق تعالیٰ نے ایک عالم نور کا پیدا فرمایا ہے اور اس سے بڑھ کر ایک مرکزی شخصیت انبیاء کرام علیہم السلام کی اور ملائکہ کی ہیں وہ نورانی مخلوق ہوتی ہیں، حق

تعالیٰ شانہ نے ظلمت اور تاریکی پیدا فرمائی اور اس مرکز سے زیادہ تعلق شیاطین کا ہے، جیسے ہر شئ کا مرکز ہوتا ہے، پانی کا مرکز سمندر ہے، اسی طرح ہواؤں کا مرکز ہے، آگ کا مرکز ہے، مٹی کا ایک مرکز ہے تراب ۔ اسی طریقہ سے خیر اور شر کے لئے ایک مرکز ہے، (فتح الملہم) یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مہرِ نبوت آپ ﷺ کی پشت اور پیٹھ پر لگائی گئی، گویا اندر کی سعادت ابھر کر باہر آ گئی، (تاریخ و جنات وشیاطین ص۱۷۴) پشت پر مہر نبوت ایسی تھی جیسے کبوتری کے انڈے ہوتے ہے (ترجمان السنۃ) چھوٹی اور ابھری ہوئی اور اس پر لکھا ہوا تھا'' محمد رسول الله ''تو نیچے تھا 'محمد'، اس کے اوپر تھا 'رسول'، اور اس کے اوپر تھا لفظِ 'الله'، (شمائل کبری) اور یہاں (حضرت نے حاضرین کو اس جگہ کی طرف اشارہ کر کے بتلایا) آپ ﷺ کے شانوں کے درمیان وہ موجود تھی پیچھے (تاریخ جنات و شیاطین ص۱۷۴) تو سعادت اندر سے ابھر کر باہر آ گئی، اور آپ ﷺ کے برعکس دجال جس میں دجل وفریب ہوگا اور خبثِ باطن ہوگا اس کی پیشانی پر تین حروف لکھے ہوں گے پہلا حرف کاف، پھر فاء ہوگا، پھر راء ہوگا، (علامات قیامت ص۱۴۷ بحوالہ ابن ماجہ) اس میں اشارہ ہوگا کفر کی طرف کہ یہ پکا کافر ہے اور بہت بڑا کافر ہے، اور فتنہ میں مبتلا کرنے والا ہے، تو اس کی شقاوت اور بدنصیبی ابھر کر باہر آ گئی، تو سعادتِ نبویہ پیچھے ابھری اور یہ اشارہ ہے تقویت وتائیدِ الٰہی کی طرف، اور اس کے شقاوت ابھرے گی جسے مؤمن پڑھ لیں گے کہ اس کی پیشانی پر 'ک 'ف، اور 'ر، لکھا ہے، گویا یہ کافر ہے، اور اس کی چال اور دھوکہ میں نہیں آئیں گے، تو شر کا مرکز یہ چیزیں ہیں کہ شیطان درحقیقت مرکزی حیثیت رکھتا ہے شر میں اور خرابی میں، اور اللہ تعالی نے اس عالم میں ٹکراؤ کی شکل رکھی ہے تا کہ ترقی وجود میں آجائے، اب آپ دیکھئے، اگر خیر وشر کا اور ملکیت وشیطانیت کا ٹکراؤ وتصادم نہ ہو تو ترقی نہیں ہوسکتی، اسی لئے آپ پانی کو لے لے کہ سمندر اپنے مقام پر ہے اس میں کوئی

ترقی نہیں ہے، مٹی کو آپ لے لے وہ اپنے مقام پر ہے اس میں کوئی ترقی نہیں، مگر پانی اور مٹی کو ملا کر آپ گارا بنائیں گے تو اس سے برتن بننا شروع ہوں گے، اس سے اینٹیں بننا شروع ہوگی، اس سے مٹکے بننا شروع ہوں گے، تو دو چیزوں کے ملنے کے بعد تیسری چیز وجود میں آئے گی اور ترقیات کی شکلیں ظاہر ہونا شروع ہوجائے گی، تو پانی اپنی ذات سے ترقی نہیں کرتا، اور اسی طریقہ سے مٹی کی بھی یہی کیفیت ہے، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ ملائکہ خیرِ محض ہے کوئی ترقی ان کی ہوئی نہیں وہ جس حال میں ہے اسی حال میں رہے، اور شیاطین جو ہے وہ شرِّ محض ہے، ہاں جب ملکیت اور شیطانیت ان دونوں کا ٹکراؤ اور تصادم ہوگا تو ٹکرانے سے نئی چیز سامنے آتی ہے، جیسے آپ دیکھیں گے کہ ایک جاہل آدمی ہے اس نے ایک سوال کیا اور عالم اس کو جواب دیتا ہے، تو جہل اور علم جب ٹکراتے ہیں تو تیسری چیز سامنے آتی ہے اور نئی نئی باتیں اور نئے نئے اسرار کھلتے ہیں اور نئے نئے حقائق سامنے آتے ہیں، دو پہلوان جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو نئے نئے داؤ پیچ کھلتے ہیں اور سامنے آتے ہیں، تو غرض یہ کہ ٹکراؤ کے نتیجہ میں تیسری چیز برآمد ہوتی ہے اور ظاہر ہوتی ہے۔

شیاطین کا وجود ہے، اور نظر بھی آتے ہیں

تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے، تو اول تو شیطان کو دیکھا کس نے؟ اور پھر اس کے بعد اس کی دشمنی اور دشمنی بھی کھلم کھلا، تو حق یہ ہے کہ شیطان کا وجود ہے اور نظر بھی آتا ہے شیطان، اور اس زمانہ میں تو چلتے پھرتے شیطان بہت ہیں، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا کہ ''شیاطین الانس والجن'' (انعام، آیت: ۱۱۲) معلوم ہوا کہ جن میں تو ہوتے ہی ہیں شیطان، مگر

انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں ”الذی یوسوس فی صدور الناس ☆من الجنة والناس ☆ (سورۂ ناس، آیت نمبر ۵/۶) کہ لوگوں میں سے اور جنوں میں سے جو شیاطین ہوتے ہیں وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں، وسوسہ ڈالتے ہیں، اور وسوسہ اندازی اور بہکانا اتنا بڑا مسئلہ ہے اور اتنی اہم بات ہے کہ میں کہا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے علوم کے سمندروں پر مشتمل جو کتاب ہے قرآنِ کریم اس کو ختم ہی اس مضمون پر کیا ہے، معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑا مضمون ہے جس میں پناہ چاہی گئی ہے رب العلمین سے، اس قسم کے شر سے کہ جو سینے کے اندر وسوسہ اندازی کرتا ہے، تو بہرحال شیطان کا وجود ہے اور وہ تسلیم بھی کیا جاتا ہے، ویسے اس دنیا میں اس کے پارٹنرس آپ کو بہت مل جائیں گے، چنانچہ کسی نے ابلیس کو دیکھا کہ وہ سویا ہوا ہے اور سر پہ ہاتھ رکھ کر لیٹا ہے آرام سے بالکل، کسی نے کہا تم اور آرام، تم نے تو کانٹراک لیا ہے بنی آدم کو گمراہ کرنے کا اور پھر تمہارے لئے آرام کا کیا سوال؟ اس نے کہا بلاشبہ میں نے یہ عہد کیا ہے کہ میں بنی آدم کو گمراہ کروں گا، مگر اب میرے چیلے اور شاگرد کافی پیدا ہو گئے ہیں، میں نے محنت کی اس محنت کے نتیجہ میں شاگردوں کی اور چیلوں کی کثرت ہے، تو اب مجھے آرام کا موقعہ مل جاتا ہے۔ (مجالس حکیم الاسلام ج ۱ ص ۲۷۷)

شیطان کے چیلے

پوچھا تمہارے چیلے کون؟ کہا سینما کے جتنے ایکٹرس ہیں وہ ہمارے چیلے ہیں، اخلاق کو خراب کرنے والی ناول لکھنے والے وہ ہمارے چیلے ہیں، فحش اور عریانیت کا درس دینے والے وہ ہمارے چیلے ہیں، خیر سے ہٹا کر بدی کی طرف لے جانے والے وہ سب ہمارے مرید و شاگرد ہیں، تو محنت کی اسلئے کافی بڑا حلقہ ہے جو محنت کر رہا ہے علاقوں میں

اور ملکوں میں اس وجہ سے ہم کو کچھ سکون و راحت ملی، ورنہ ہم کو تو ہر وقت مصروف رہنا پڑتا تھا، تو شیاطین کے بھی بہت چیلے ہیں۔

ابلیس کو کونسی بات زیادہ خوش کرتی ہے

بلکہ حدیث شریف میں ہے کہ ابلیس شام کے وقت اپنا تخت زمین پر بچھاتا ہے اور اپنی فوج کو روانہ کرتا ہے کہ جاؤ بنی آدم میں جا کر کام کرو محنت کرو، اور پانی پر تخت اس لئے بچھاتا ہے کہ کم بخت متکبر ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالی کے باب میں ہے ''وکان عرشہ علی الماء'' کہ اللہ تعالی کا عرش پانی پر ہے، تو یہ بھی اپنی شان بتلانے کیلئے اپنا تخت سمندر کے پانی پر بچھاتا ہے، اور اپنی جماعتوں کو اور اپنے چیلو چپاٹوں کو بھیجتا ہے کہ کام کریں، وہ آنے کے بعد اپنی خدمات بیان کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے میں نے بدنگاہی کروائی، کوئی کہتا ہے میں نے غیبت کروائی، کوئی کہتا ہے میں نے چوری کروائی، کوئی کچھ، کوئی کچھ، وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ایک آتا ہے اور آنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی میں لڑائی لگائی، زوجین میں لڑائی لگوائی، یہاں تک کہ طلاق ہوگئی، تو اس سے کہتا ہے کہ ہاں! تم نے کوئی کام انجام دیا اور وہ تخت سے اٹھتا ہے کھڑا ہوتا ہے اور اسے سینہ سے لگاتا ہے اور بوسہ دیتا ہے کہ ہاں! یہ کچھ کام ہوا ویری گڈ تعریف کرتا ہے مبارکبادی دیتا ہے یہ گویا شکل ہے۔ (مسند احمد، مشکوۃ)

اب یہاں ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سارے کاموں میں اس کو وہ کیوں ترجیح دیتا ہے، یہ ایک سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ انسان شیطان کا دشمن ہے، اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دشمن میں جب لڑائی ہوتی ہے تو یہ سب سے بڑی خوشی کی بات ہوتی ہے، تو شیطان سوچتا ہے کہ یہ میرے دشمن ہیں اور ان میں جب لڑائی

ہوتو یہ بڑی خوشی کی بات ہے، اوراس میں بھی خاص طور سے جب میاں بیوی کی لڑائی ہو اور وہ طلاق کا سبب بن جائے، تو اسکے نتیجہ میں ہوگا یہ کہ یہ جو سلسلہ تھا کہ اس سے کوئی نسل ہوتی وہ سلسلہ باقی نہیں ہوگا، بیوی کو دوسرا شوہر ملے وہ نیا سلسلہ ہوگا، شوہر کو دوسری بیوی ملے وہ نیا سلسلہ ہوگا، باقی یہ تو اس نے توڑ کرواہی دیا کہ اس طریقہ سے دونوں کے ملنے کے نتیجہ میں اولاد کا سلسلہ ہوتا تو اب یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، تو دشمن میں پھوٹ پڑ جائے، دشمن میں لڑائی ہو جائے، دشمن میں توڑ ہو جائے اور نسل کا سلسلہ ان کا منقطع ہو جائے یہ اس کے لئے خوشی کی بات ہے، اس لئے اسے بڑی مسرت ہوتی ہے، اوراس کو سینہ سے لگاتا ہے، تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں جو لوگ عداوت پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں ان کا شیطان سے زیادہ کانٹیک ہیں شیطان سے زیادہ تعلق ہے۔

آلِ رسول ﷺ کی عزت کرنے کا صلہ

تو خیر، میں کہہ رہا تھا کہ ایک خیر کا مرکز ہے، اورایک شر کا مرکز ہے دوسری ایک بات یہ ہے کہ ریسلنگ میں جاندار کشتی اس وقت ہوتی ہے جب دونوں طرف جذبہ ہولڑنے کا، حضرت جنیدؒ کے باب میں کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ اپنے وقت کہ کسی نواب کے بہت بڑے پہلوان سمجھے جاتے تھے اور جو ان کے مقابلہ میں آتا تھا وہ اس کو پچھاڑ دیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص آئے جسمانی اور مالی دونوں اعتبار سے ان کی کمزور پوزیشن تھی اور آکر یہ کہا کہ میں جنید سے لڑائی کرنا چاہتا ہوں کشتی کرنا چاہتا ہوں، لوگوں نے کہا کہ جنید سے تم کشتی کروں گے؟ ان کے سامنے تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے، تم تو مچھر کی طرح ہوا میں اڑ جاؤ گے، کہنے لگے کہ مجھے انہیں سے لڑنا ہے۔

خیر، بہرحال وقت مقرر ہوا اور اس کا اعلان کر دیا گیا اور کشتی طے پائی، اب

کشتی جب ہونے والی تھی اس سے پہلے بڑے میاں نے جنید کے کان میں یہ بات کہی کہ آپ بہت بڑے پہلوان ہے مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں سید زادہ ہوں، نبیٔ کریم ﷺ کے خاندان سے میرا تعلق ہے، بس اتنا سننا تھا کہ حضرتِ جنید جو ہے انہوں نے یہ طے کرلیا کہ آج اس کی عزت برقرار رہے گی اور میں شکست کھا جاؤں گا، اب کشتی کچھ ایسی ویسی لڑی جس کو بے جان کہنا چاہئے اور اس کو چت کرنے کا موقعہ دیا، اور اس نے چت کرنا چاہا تو فوراً چت ہوگئے چاروں شانے، لوگوں میں بڑا شور مچ گیا کہ یہ کیسی کشتی؟ لوگوں نے کہا کہ دوبارہ کشتی ہونی چاہئے، پھر دوبارہ کشتی ہوئی ویسے جو ہے پچھڑتے تو الگ بات تھی، لیکن یہاں تو وہ جنید کو پچھاڑ نہیں رہے تھے وہ تو جان بوجھ کر خود پچھڑ رہے تھے، پھر وہی شکل ہوئی، تیسری مرتبہ پھر کشتی ہوئی تو پھر ویسا ہی معاملہ ہوا، خیر، اس بڑے میاں کا بڑا اعزاز واکرام ہوا اور ان کو بڑا انعام ملا اور لوگوں میں بڑا چرچا ہوا کہ جنید جیسے پہلوان کو اس نے پچھاڑا، حضرت جنید نے یہ ذلت برداشت کی، حاکم نے پوچھا کہ جنید صحیح صحیح بات بتاؤ کہ واقعہ کیا ہے، جنید نے کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ اس نے میرے کان میں یہ بات کہی تھی کہ میں آلِ رسول ہوں نبیٔ کریم ﷺ کے خاندان سے ہوں، لہٰذا میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ نبیٔ کریم ﷺ کے خاندان کے افراد کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے کہ اس کو پچھاڑا جائے، اپنی ذلت برداشت کرلی مگر حضور ﷺ کے خاندان کے فرد کے ساتھ یہ معاملہ میں نہیں کرسکتا، وہ تو سید زادہ ہیں، رات کو حضرت جنید نے خواب میں دیکھا کہ جو ابھی حضرت جنید نہیں تھے پہلوان تھے رات کو آپ ﷺ کو خواب میں دیکھا فرمارہے ہیں کہ اے جنید! تم نے ہمارے خاندان کے آدمی کی تکریم کی، ہم تمہارا اکرام کریں گے اور تمہیں عزت نصیب ہوگی (تالیفات مرغوب ص۳۳۷ بحوالہ کشف المحجوب) اور پھر ایسی عزت نصیب ہوئی ہے کہ ساری چیزوں کو چھوڑ کر خدا تعالی کی طرف

متوجہ ہوئے اور سید الطائفہ کہلاتے ہیں۔

ایک آہ کا اثر

تذکرۃ العطاؔر میں میں نے تقریباً تیس سال پہلے دیکھا تھا بلکہ اس سے بھی پہلے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ ان کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد سے صبح تک یادِ حق میں مشغول رہتے تھے، ایک مرتبہ بادشاہ نے آزمائش کی خاطر ان کے پاس ایک حسین وجمیل لونڈی اورلڑکی بھیجی تا کہ ان کے تقویٰ کی آزمائش کرے، اور دیکھے کہ ان کی شان کیا ہے، جب وہ پہنچی تو یہ بڑے درجہ کے شخص تھے صاحبِ نسبت، صاحبِ مقام، صاحبِ ذکر، سید الطائفہ کہلاتے ہیں وہ بہت باجمال اور حسین تھی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی، منشاء تھا کہ دل اس کی طرف مائل ہوجائے، حضرت نے دیکھا معلوم ہوا کہ سامنے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اس کے بعد نظر نیچی کر لی اور ایک آہ بھری، اب اس آہ کا ایسا اثر ہوا اسکے قلب پر کہ وہ برداشت نہ کرسکی پٹھک کے وہیں گری اور اس کا انتقال ہوگیا، وہ تو جلے بھنے تھے برسوں کے، اس لئے ان کا تو مقام ہی ایسا تھا، بہت اونچے درجہ کے شخص تھے۔

میدانِ دنیا میں جا کر کشتی کرو

تو میں ذکر کر رہا تھا کہ اس عالم میں شر اور خیر کا ٹکراؤ رکھا ہے بلکہ علامہ عثمانیؒ نے لکھا ہے اور بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ یہ دنیا بھی درحقیقت کشتی اور ریسلنگ کا گراؤنڈ ہے اس لئے کہ دیکھئے! ابلیس کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدے کا حکم دیا تو اس نے سجدہ نہیں کیا اور یہی سبب بنا اس کے مردود بننے کا، مگر ایک درجہ میں حضرت آدم علیہ السلام کا وجود بھی سبب تھا سببِ بعید کہ وہ نہ ہوتے تو حکم نہ ہوتا، اور حکم نہ ہوتا تو انکار کا اور مردود ہونے کا سوال نہیں تھا، تو ابلیس کے دل میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے دشمنی

اور عداوت بیٹھ گئی کہ یہی سبب بنے ہے میرے مردود ہونے اور یہاں سے نکالے جانے کا، حالانکہ حقیقۃً جو سبب ہے وہ اس کا سجدہ نہ کرنا ہے، تو اس کے دل میں تو عداوت بیٹھ گئی، اور حضرت آدم علیہ السلام بیچارے خالی الذہن تھے انکے ذہن میں کوئی بات نہیں تھی مگر جب ابلیس نے بہلایا پھسلایا اور کوشش کی تو اصلی سبب تو جنت کے چھوٹنے کا وہ دانہ استعمال کرنا ہے جس کے کھانے کو اللہ تعالی نے منع کیا تھا، مگر ایک درجہ میں اس کا وجود بھی تو سبب بنا کہ اس نے قسمیں کھائیں، اور پتہ نہیں کیا کیا چیزیں کہیں کہ یہ ہمیشگی کا درخت ہے اسے آپ کھالے وغیرہ، تو غرض یہ کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکلے ہیں تو ان کے دل میں بھی ابلیس کی طرف سے عداوت بیٹھ گئی، تو ابلیس کے دل میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے عداوت، اور حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں ابلیس کی طرف سے عداوت بیٹھ گئی، جب دونوں ایک دوسرے کے دشمن اور مخالف ہو گئے تو اللہ میاں نے دنیا کے گراؤنڈ پر بھیجا کہ جاؤ وہاں پر تمہاری ذریت اور اس کی ذریت کشتی کرتی رہیں، اور وہاں لڑتی رہیں، اور جو غالب آجائے گا اگر ابلیس غالب ہے تو اس کا اصلی مقام نار ہے جہنم ہے، تو وہ جس پر غالب آئے گا اس کو وہ اپنے ساتھ نیچے لے جائے گا، اور اولادِ آدم میں جو اس پر غالب آجائے گا اور اس پر غلبہ پالے گا تو وہ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا اصلی مقام جنت تھا اس وجہ سے وہ جنت میں آئے گا، اور حق تعالیٰ شانہ اسے نوازیں گے، تو غرض یہ کہ جو شیطان پہ غالب اس کے لئے جنت ہے اور شیطان جس پر غالب آجائے اس کے لئے جہنم ہے، تو یہ کشتی کا گراؤنڈ اور میدان ہے اور اس عالم میں انسان کی ہمیشہ شیطان سے ٹھیرتی رہتی ہے، (فتح الملہم) وہ تو رمضان شریف میں اللہ میاں نے بڑا کرم کیا کہ بیچارے بغیر کھائے پئے دشمن کا کیسے مقابلہ کریں گے، اس لئے اس کو تو پہلے سے بند کردیا جتنے سرکش شیاطین ہیں ان تمام کو نظر بند

کر دیا کہ ان کو یہاں سے ہٹاؤ، اور انسان کا نفس جو سرکش تھا تو اس کی سرکشی، بدمعاشی ختم کرنے کیلئے دانہ پانی بند، تو وہ دشمن بھی غائب اور یہ دشمن بھی ڈھیلا تا کہ جی لگا کر قرآن شریف پڑھے، تراویح میں جی لگائے، روزہ میں جی لگائے، تقویٰ کا اہتمام کرے، تو غرض یہ کہ یہ کوشش ہونی چاہئے، تو یہ سارے انتظامات حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے کئے گئے ہیں، تو یہ ریسلنگ کا مقام ہے اور تقابل کی دنیا ہے۔

شیطان ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے

اب یہاں پر آپ دیکھئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جو ہیں وہ بہر حال پیغمبر کی اولاد ہیں، مگر یہ کہ شیطان ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ حق تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، اور اگر کبھی مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ عجیب وغریب توبہ بھی کرتے ہیں، تو یہاں یہی شکل ہوئی کہ ان کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے حسد پیدا کروایا، اور ان کا یہ ذہن بنایا کہ یوسف کو باپ اتنا چاہتے ہیں اور ہم ایک جماعت ہے، ہماری ایک حیثیت ہے، ہم بڑے ہیں ان کی ہیلپ، مدد، اور نصرت وتعاون کر سکتے ہیں، ان ساری چیزوں کے باجود پھر کیفیت یہ ہے کہ ہماری طرف وہ توجہ نہیں، تو بہر حال وہ ایک سلسلہ ہے جس کا آگے تذکرہ آئے گا، تو حاصل یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔

ملک افضل ہے یا بشر؟

اب وہ سوال کہ جب شیطان کو دیکھا ہی نہیں، تو اس کی دشمنی اسے کیسے دکھائی دے گی، بھائی کوئی آدمی دکھائی دے وہ موصوف ہوتا ہے اور صفت اسکی وہ اور زیادہ پوشیدہ ہوتی ہے، تو ہر شئ کا ظاہر ہونا اس کے اعتبار سے ہوتا ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ

بات ظاہر ہے تو بات آنکھوں سے تھوڑی دِکھتی ہے، کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ ظاہر ہے، تو یہ تھوڑی مطلب ہے ظاہر ہونے کا کہ آنکھوں سے نظر آتا ہو، مطلب یہ ہے کہ سمجھنے میں بالکل موٹا اور ظاہر ہے، جیسے ہمیشہ جو ہے ''ہمیشہ،، کا لفظ اپنے معنی میں ہوتا ہے، مثال کے طور پر آپ کے یہاں کوئی شخص رمضان میں آئے، تو آپ کہیں گے کہ فلاں صاحب ''ہمیشہ،، ہمارے یہاں آتے ہیں، حالانکہ بے چارے سال میں ایک دفعہ آئے ہیں، مگر آپ ہمیشہ کا لفظ کہتے ہیں، تو ہر شئی میں ہمیشہ کا لحاظ اس کے مناسب ہوگا، مثال کے طور پر پرانے زمانہ کے بوڑھے سردی میں میتھی کا لڈو کھاتے تھے، تو کہیں گے کہ فلاں جو ہے وہ ہمیشہ میتھی کا لڈو کھاتا ہے، وہ گرمی میں تھوڑی کھاتا ہے، وہ سردی میں کھائے گا، مگر ہمیشہ کا لفظ اس موقعہ پہ کہتے ہیں، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ ہر شئی جو ہے اسکے اعتبار سے اس پر ہمیشہ کا اطلاق ہوتا ہے، تو یہ کہنا کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سا آدمی سوچے اور عقل سے کام لے تو اسے سمجھ میں آجائے گا کہ شیطان انسان کا دشمن ہے، یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو کشمکش میں رکھا ہے، اگر یہ کشمکش نہ ہو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، اسی لئے کتابوں میں ایک مسئلہ چھڑ گیا ہے کہ فرشتوں کی عبادت بڑھ کر ہے یا انسانوں کی عبادت بڑھ کر ہے، فرشتوں کا درجہ بڑھ کر ہے یا انسانوں کا درجہ بڑھ کر ہے، انیسویں پارے میں سورۂ نمل میں امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے جانبین کے دلائل کو پیش کر کے جو بحث کی ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، بہر حال، اس میں ایک چیز یہ بھی ذکر کی ہے کہ انسانوں کی عبادت میں رکاوٹیں بہت زیادہ ہیں، اور فرشتوں کی عبادت میں رکاوٹ ہے ہی نہیں، اب آپ نے یہاں سے گھر جا کر مصلی پہ نماز شروع کی، تو ادھر سے چھوٹا سا بچہ آیا کہ باجی (ابا) اس نے مجھے مارا اب آپ ادھر متوجہ ہے، تھوڑی دیر ہوئی تو وہ ہوم منسٹر خفا ہو کر کہ چلی آرہی ہے یہ چاہئے اور

فلاں چیز کی ضرورت ہے، تو کہیں بچے لڑ رہے ہیں، کہیں بیوی خفا ہو رہی ہے، کہیں بھائی کا کوئی مسئلہ ہے، کہیں پڑوس کا مسئلہ ہے، کہیں کچھ بگڑ گیا ہے، ٹیوب لائٹ کا مسئلہ ہے کہیں گرم پانی کا مسئلہ ہے، دنیا بھر کے لفڑے گویا اس عالم میں لگے ہوئے ہیں کہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ تو ہے ہی صحیح، تو ان رکاوٹوں اور جھمیلوں سے ہٹ کر اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہونا اور شیطان کا تقابل یہ آسان کام نہیں ہے۔

توفیقِ الٰہی طلب پر ملتی ہے

اللہ تعالیٰ کی توفیق اگر نہیں ہوتی تو آپ نے بھی خود دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ بالکل فرصت علی خاں ہوتے ہیں کوئی کام نہیں اور ماشاء اللہ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں کاٹا جائے تو پندرہ من گوشت نکلے اور دس من میں تو کلام نہیں ہے، مسجد کے پڑوس میں رہتے ہیں، مسجد انتہائی خوبصورت کھانے پینے کا گھر میں سارا بندوبست، کوئی کام نہیں، کوئی فکر نہیں کوئی مشغولی نہیں، لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کبھی بھولے سے بھی مسجد میں نہیں جاتے، تو یہ توفیق نہ ہونے کی بات ہے، شیطان کا غلبہ ہے، اور آپ دیکھتے ہیں کہ برف باری ہوری ہے، سردی ہے، گھر میں اکڑے ہوئے ہیں اور سردی محسوس ہو رہی ہے، پھر بھی خدا تعالی کی توفیق ہو تو پہنچتے ہیں، تو یہ توفیق اور فضل ہے جو ملکوتیت لے آتی ہے، ورنہ آدمی اگر ذرا ڈھیل کرے تو کون پوچھنے آنے والا ہے، کون دیکھنے آنے والا ہے اگر آپ فجر کی نماز میں نہ آئے، یا کسی بھی نماز میں نہ آئے تو کون آپ کا ہاتھ پکڑنے والا ہے، تو حق یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہی ہے ایک قسم کا کہ، نہیں، آدمی سوچتا ہے کہ حق تعالیٰ کو جواب دینا ہے آخرت سامنے ہے اجر وثواب ہے، ورنہ وسوسہ آتے ہیں، کاہلی آتی ہے، سستی ہوتی ہے مگر ہمت کر کے آدمی چل دیتا ہے، تو حق یہ ہے کہ جب آدمی کوشش

کرتا ہے تو توفیق بھی اس کا ہاتھ پکڑتی ہے، ورنہ اگر ادھر سے توفیق نہ ہو تو آدمی ایک دفعہ بھی سبحان اللہ نہیں کہہ سکتا، مگر ادھر سے توفیق ہو جاتی ہے تو ساری مشکلات دور، آدمی اس کا مکلّف اور پابند ہے کہ کچھ تو زور لگائے، کچھ تو حرکت کرے، کچھ تو چلے، حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی طرف ایک بالشت چلتا ہے تو اللہ میاں اس کی طرف ایک ہاتھ آتے ہے، یا بندہ تھوڑا بڑھتا ہے تو وہ زیادہ بڑھتے ہیں، بندہ چلتا ہے تو وہ دوڑتے ہیں، (بخاری و مسلم، ترغیب ج۴ص۱۰۳) سب کا حاصل یہ ہے کہ اس کی رحمت بہت متوجہ ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے ایک باپ بچہ کو اپنے سامنے کھڑا کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ بیٹا ادھر آ، اور وہ چلنا نہیں جانتا اور باپ بھی جانتا ہے کہ یہ چل کر آ نہیں سکتا مگر ذرا سا ایک دو قدم اس نے آگے بڑھائے اور وہ گرنے لگے گا تو باپ دوڑ کر اس کو پکڑ لے گا، تو بندہ بھی جب کوشش کر کے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اللہ میاں دیکھتے ہیں کہ گڑ بڑ ہے تو اس کی رحمت خود انسان کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے اور اس کا کام بننے لگتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ چلے، طلب کے ساتھ چلے، یہ نہیں کہ چند دن چل کر بالکل نفس کو ڈھیل چھوڑ دے، اور نفس کو آزاد چھوڑ دے، تو نفس و شیطان تو بربادی کی طرف لے جانے والے ہیں، وہ تو پھر ایسا حال کریں گے کہ کسی خیر کی طرف طبیعت نہیں چلے گی۔

نیکی نیکی کو اور بدی بدی کو کھینچتی ہے

اور یہ ذہن میں رہے کہ جہاں ایک برائی ہوئی تو اس کی نحوست سے دوسری ہوگی، دوسری سے تیسری ہوگی، اور تیسری سے چوتھی ہوگی، ایک برائی دوسری برائی کی طرف لاتی ہے جس طریقہ سے ایک نیکی آپ نے کی تو اسکی وجہ سے دوسری کی توفیق

ہوگی، دوسری سے تیسری اس طرح ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اس عالم میں۔

وہ ایک سفیر صاحب تھے وہ کہنے لگے کہ ایک دفعہ سبحان اللہ کہنے کے بعد دوسری دفعہ سبحان اللہ کہنے کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلی دفعہ جو سبحان اللہ کہا ہے وہ مقبول ہو گیا، تو وہ کہنے لگے کہ گذشتہ سال جنہوں نے رسید پھڑوائی تھی اگر دوبارہ وہ آج رسید پھڑوائیں گے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا گذشتہ سال کا چندہ مقبول ہو گیا، جیسے ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی توفیق، ایک دفعہ سبحان اللہ کہنے کے بعد دوسری دفعہ سبحان اللہ کی توفیق، تو معلوم ہوا کہ پہلا عمل مقبول ہو گیا ہے، تو اگر دوبارہ رسید پھڑوائی جائے گی تو اس صورت میں ہم سمجھیں گے کہ پچھلا چندہ اللہ میاں کے ہاں مقبول ہو گیا ہے لہٰذا دوسرے کی توفیق ہوئی، تو خیر، یہ تو مذاق کی بات ہے۔

سکونِ قلب کا ایک ہی وظیفہ ہے

بہر حال کہنے کا منشاء یہ ہے کہ توفیق کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، آپ تجربہ کر لے ذرا سی غفلت ہوئی پھر بڑھے گی، پھر بڑھے گی، پھر بڑھے گی، پھر بڑھے گی، ہوتے ہوتے پھر آدمی بہت بڑے بڑے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے، اور قلب سے توفیق چلی جاتی ہے تو بے نور ہو جاتا ہے، اور بے نور ہوتا ہے تو بے لطف ہو جاتا ہے، ہزاروں انسانوں کو آپ دیکھئے وہ کہتے ہیں کچھ اچھا نہیں لگتا، کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا، کچھ سکون نہیں، کچھ چین نہیں تو سب لوچے کر رکھے ہیں (گڑبڑی کر رکھی ہے) تو پھر جی کو کیا اچھا لگے گا، ساری زندگی جو ہے رف کر لی ہے تو دل کو کیسے خوشی ہوگی، اس لئے کہ دل کی خوشی، دل کی قوت، دل کا اطمینان اور فرحت وہ اللہ تعالی کی یاد سے وابستہ ہے، استغفار سے وابستہ ہے، تلاوتِ قرآن سے وابستہ ہے، ذکر سے وابستہ ہے، غریبوں کی خدمت سے،

تقویٰ سے، حقوق کی ادائیگی سے اور اللہ تعالی کی یاد سے وابستہ ہے، تو دینداری یہ سبب بنتی ہے قلب کی بشاشت کا، آپ دیکھ لیجئے جو لوگ متقی ہیں ان میں آپ بشاشت دیکھیں گے، ان کی زندگی میں آپ تازگی دیکھیں گے، ورنہ ہم نے دنیا کے مختلف ملکوں میں سفر کر کے بڑے بڑے مینٹرل ہیٹرل دیکھیں، میں نے دیکھا بڑے بڑے کروڑ پتی ہیں مگر بیٹھے ہیں باسی کڑی کی طرح منہ کر کے، بالکل پریشان ہے حالانکہ کروڑ پتی ہے مگر چین نصیب نہیں، اور ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ دال روٹی کھاتے ہیں، بھاجی روٹی کھاتے ہیں، غرض یہ کہ معمولی سا کھانا کھاتے ہے، معمولی کپڑے پہنتے ہے، مگر دل کا خدا تعالی سے جوڑ ہے تو ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ

بستره ٹاٹ کا دو پاٹ کی کمبل کی کلاہ
تاجِ خسرو ہے یہی تختِ سلیماں ہے یہی

وہ سمجھتے ہیں کہ یہی تاجِ خسرو ہے، اور یہی تختِ سلیمانی ہے، اس لئے کہ خدا تعالی سے جوڑ ہو گیا ہے، وہ صحیح معنی میں بادشاہت ہے، بے تاج کے بادشاہ جس کو کہتے ہے، آپ بھی اگر بے تاج کی بادشاہت کرنا چاہیں تو خدا تعالی سے تعلق پیدا کر لیجئے، پھر آپ بے تاج کے بادشاہ ہیں، پھر جہاں آپ گئے وہاں آپ ہی آپ ہیں، دیکھو! ایک آدمی کار سے چلتا ہے اور سامنے جو ہے پانی آ گیا، سامنے دریا آ گیا، ندی آ گئی، کوئی چیز آ گئی اب اس کی کار تو وہاں ٹھپ ہو گئی، اور ادھر جانے کیلئے کچھ ہے نہیں، لیکن خدا تعالی سے تعلق ہے تو حق تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے، وہاں اس کے لئے وہ کوئی شکل پیدا فرما دیں گے، تو دنیا کی چیزیں منقطع ہو جائے گی مگر تعلق مع اللہ کی برکتیں منقطع نہیں ہوگی، وہ تو ملک الموت سے بھی منقطع نہیں ہوگی، وہ تو قبر میں جا کر بھی منقطع نہیں ہوگی، مگر آدمی کی اپنی کمزوری ہے اگر یہ طے کر لے کہ مجھے خدا تعالی سے جوڑ پیدا کرنا ہے، اور اللہ تعالی

سے تعلق قائم کرنا ہے چاہے کچھ ہو جائے، پھر آپ دیکھئے! برکت آتی ہے یا نہیں، غیب سے اگر شکلیں پیدا نہ ہوں تو پھر جو مجرم کی سزا ہوگی وہ ابرار احمد کی سزا ہوگی، آپ تھوک دینا ہمارے منہ پہ آکر کہ تم نے غلط بات کہی تھی، خدا تعالی سے آپ تعلق پیدا کرلے پھر دیکھئے کیا ملتا ہے۔

جانچ ہوتی ہے انہیں کی جن پہ ہوتا ہے کرم

لیکن یہ یاد رہے کہ پہلے ہی دن سے منّ وسلویٰ نازل نہیں ہوگا، آپ سمجھیں کہ دوسرے ہی دن سے مٹھائیوں کے ٹوکرے شروع ہوجائیں گے، اور جیب میں ہاتھ ڈالے تو پانچ پاؤنڈ کی بجائے پانچ سو ہوجائیں گے، بلکہ ممکن ہے وہ پانچ بھی چلے جائے، اللہ تعالی کی طرف سے حالات آئیں گے، آزمائشیں آئے گی، اور بہت معمولی ہوگی، بڑے لوگوں کی بڑی آزمائشیں ہوتی ہیں، ہم لوگوں کی کیا آزمائشیں، تھوڑے کچھ حالات آئیں گے، ذرا سے جمے، دیکھئے! مٹکا خریدنا ہوتو آپ جو ہے ٹھن ٹھن بجا کر دیکھتے ہیں جانچتے ہیں، پھر خریدتے ہیں، شاعر نے کہا ہے ؎

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے انہیں کی جن پہ ہوتا ہے کرم

تو آپ مٹکے کو بجا کر دیکھتے ہیں جب دیکھا کہ ہاں ٹھیک ہے اسے خرید لیا اور پھر اس میں پانی بھر دیا جاتا ہیں، ابھی تک خالی تھا پھر وہ مٹکا بھر دیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ کارآمد مٹکا ہے، تو اللہ تعالی کی طرف سے ذرا سا دیکھا جاتا ہے، ذرا سا تقویٰ اختیار کیا، پھر اس کے بعد دیکھئے کیسی برکت ہوتی ہیں، ایک صاحب کہتے تھے کہ میں نے ایک حرام کا پہلو چھوڑا تو میں اپنی آنکھوں سے کھلم کھلا برکت دیکھتا ہوں، اور آپ تجربہ کرلیجئے کہ

بس خدا تعالی کو راضی کرنے کیلئے کوئی قدم اٹھایئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے، کچھ دن صحیح آپ کر کے دیکھئے، کچھ حالات، کچھ تشویش، وقتی پریشانی ہوگی، اور بعد میں آپ سمجھیں گے کہ یہ سو فیصد کامیاب راستہ ہے اطمینان کا اور طمانینت کا راستہ ہے اور وہ ہر وقت ہے، لہٰذا حالات کا مقابلہ کرنے میں سب سے بڑا حال یہ ہے کہ نفس وشیطان کا مقابلہ کیا جائے، جس کی دشمنی کا تذکرہ چل رہا ہے کہ ''ان الشیطٰن للانسان عدو مبین''

ترکِ گناہ سبب ہے حلاوتِ ایمانی کا

اب آپ دیکھئے پانی حلال تھا صبح سے آپ نے اس کو چھوڑ رکھا ہے، کھانا حلال تھا چھوڑ رکھا ہے، اب آپ باہر نکلے اور دیکھا کہ کوئی لیڈی ہے کوئی عورت ہے اور انتہائی بن ٹھن کے جا رہی ہے اور برہنہ بدن ہے اس کا اور جوان ہے خوبصورت ہے اب وہ فٹ پاتھ پر گذر رہی ہے، اور ادھر روزہ رکھ کر آپ ادھر سے گذرتے ہیں تھوڑی دیر اس کو ملاحظہ فرماتے ہیں پھر گذرتے ہے پھر ملاحظہ فرماتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ بورو پاڑی چھے، بوز وردار چھے، (بہت خوبصورت ہے) اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ حلال پانی آپ نے نہیں پیا، حلال کھانا نہیں کھایا، اس لئے کہ آپ روزہ سے ہے، تو اس دیکھنے کی وجہ سے روزے کا جو نور آیا ہوگا وہ رخصت ہو جائے گا، اب وہاں آپ کو مقابلہ کرنا ہے، جی چاہتا ہے کہ دیکھوں، یہ پریکٹیکل چیزیں کہہ رہا ہوں میں، جی چاہتا ہے کہ دیکھوں اور اپنی آنکھیں سینکھوں، مگر کل قیامت میں پتہ چلے گا جب سیسہ پگھلا کے آنکھوں میں ڈالا جائے گا، جب پکڑ ہوگی، اور اگر آج ہی آپ نے بندش کر لی اس کو نہیں دیکھا، تو آپ تجربہ کر لیجئے کہ آپ کی نمازوں میں حلاوت بڑھتی ہے کہ نہیں، آپ کے ایمان میں مٹھاس بڑھتی ہے کہ نہیں، دیکھنا اسکی وجہ سے آپ کی عبادت

میں حلاوت پیدا ہو جائے گی، اس لئے کہ آپ نے خدا تعالی کی نسبت پر ایک مزیدار چیز کو چھوڑ دیا، تو خدا تعالی اس سے زیادہ مزہ آپ کے ان کاموں میں پیدا کر دے گا، پھر آپ دعا کرنا چاہیں گے تو طبیعت چاہے گی کہ بس مانگتے ہی رہوں، پھر آپ پڑھنے بیٹھیں گے تو جی چاہے گا کہ بس پڑھتے ہی رہوں، اس لئے کہ آپ نے ادھر کی کڑواہٹ جو ہے برداشت کی ہے تو خدا تعالی ادھر مٹھاس دیدیں گے، یہ حدیث شریف کا مفہوم ہے یہ کوئی شاعری نہیں ہے۔

خطیب الامت رحمہ اللہ کی صاف گوئی

حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ: آزمائش کے لئے تین دن تقوی اختیار کر کے دیکھو، پھر دیکھو قلب کو کیا ملتا ہے، یہ کوئی ہماری زندگیاں ہے بالکل باسی کڑی کی طرح، میں یہ مضمون صرف آپ لوگوں کے سامنے نہیں سنا رہا ہوں، میں نے دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں بڑے بڑے لوگوں کے سامنے سینہ ٹھوک کر یہ بات کہی ہے، اور ان کو یہ بتایا ہے کہ سب سے بڑی شاہی یہ ہے کہ آدمی خدا تعالی سے تعلق پیدا کر لے، یہ بھول ہے کہ آدمی دولت کے چکّر میں رہ کر یہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑا بادشاہ ہے، کچھ بھی نہیں ہے، بادشاہ وہ ہے جس کا خدا تعالی اور رسول ﷺ سے تعلق جڑ جائے، سارے بادشاہوں کے بادشاہ سے جوڑ پیدا کر لو پھر فقیری میں شاہی کرو، پھر بڑے بڑے کروڑ پتی ہاتھ دُھلانے کو فخر سمجھیں گے، یہ یاد رہے، ہم تو کچھ نہیں ہے، مگر الحمد للہ، ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے دنیا کے مختلف ملکوں میں کہ کسی سے کوئی غرض اور لالچ نہیں رکھی، اور خدا تعالی سے مانگنے کا اہتمام کیا، ہم اپنی زندگی میں آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ الحمد للہ! غیب سے شکلیں پیدا ہوتی ہیں، کوئی ضرورت اٹکتی نہیں ہے (باقی نہیں رہتی ہے) یوں ہمارے پاس کچھ نہیں

ہے اور سب کچھ ہے بس اس کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا تعالی کے آگے ہاتھ پھیلائیں خدا تعالی سے تعلق رکھیں، بڑے بڑے کروڑ پتیوں نے ہم کو آزمایا ہے، ویسے لوگ اخلاص سے بھی ہدیہ پیش کرتے ہیں اور ہم قبول بھی کر لیتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس پر نظر ہو، اس پر بنیاد ہو، یہ نہیں ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے، نظر رکھنا، لالچ رکھنا، طمع رکھنا، اس کو اپنا حاجت روا سمجھنا یہ بہت بری چیز ہے، بہت خطرناک چیز ہے، اور ویسے اس عالم میں تو آدمی ایک ایک دانہ کا محتاج ہے۔

استغناء کا مطلب

ایک مزیدار بات سنا کر بات ختم کرتا ہوں، میں نے زامبیا میں یہ بات کہی کہ استغناء بڑی چیز ہے، استغناء کا مطلب سمجھتے ہیں آپ لوگ! کہ آدمی غیر کی طرف نظر نہ رکھے، پھر میں نے ان کو سمجھایا، میں نے کہا دیکھو! تم لوگ سوچتے ہوں گے کہ یہ مولوی آدمی ہندوستان سے آتا ہے اور ایسی بات کرتا ہے، تو اس کا مطلب سمجھ لو، آپ نے ٹکٹ بھیجا ہم ہوائی جہاز سے آئے، یہاں آکر ہم کھانا بھی کھاتے ہیں، پانی بھی پیتے ہیں، بستر پر سوتے ہیں، کمرے میں رہتے ہے، آپ کی کاروں میں گھومتے ہیں، پھر استغناء کا کیا مطلب؟ تو کوئی یہ کہے کہ صاحب یہ کھاتے بھی ہیں، پیتے بھی ہیں، ہمارے یہاں رہتے بھی ہے، کار میں گھومتے بھی ہیں، اور پھر استغناء کا کیا مطلب؟ میں نے کہا استغناء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات اگر ہم حق سمجھیں گے تو آپ سے سینہ ٹھوک کر کہیں گے، یہ نہیں کہ شاید آپ ناراض ہو جائے تو کیا ہوگا، دوسری دفعہ مرکر اٹھے تو کبھی بھی آج تک جو ہے کسی کو لکھا نہیں کہ ہم کو دوبارہ بلاؤ، اس پر نظر نہیں، میں نے کہا یہ مطلب ہے استغناء کا، ورنہ آدمی اس عالم میں دانہ دانہ کا محتاج ہے، ایک گھونٹ پانی نہ ملے تو آدمی جو ہے وہ

ختم ہوسکتا ہے، آدمی کی کیا حقیقت ہے، بس !اس کے سامنے یہ ہے کہ میں اپنے رب سے معاملہ رکھوں، ورنہ اس عالم میں تو نبیوں نے کھایا ہے، نبیوں نے پیا ہے پیغمبروں کو بھوک لگی، استغناء کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ نہ سمجھیں کہ آپ ہمارے حاجت روا ہے، سیٹھ صاحب ناراض ہوجائیں گے تو کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالی پہ نظر قائم کرلو پھر تمہارا بوس ہے کہ تمہارا جوب ہے کہ جو کچھ ہے سب مسئلے حل ہو جائیں گے، بس خدا تعالی سے تعلق پیدا کرلو۔

خطیب الامت رحمہ اللہ نے چار کھنڈ کے سفر میں کیا دیکھا

ہم نے امریکہ، کینیڈا، پناما وغیرہ مختلف ملکوں میں دیکھا کہ جنہوں نے دین کا اہتمام کیا ان کی زندگیوں کو میں نے اچھا دیکھا، فرانس کے علاقوں میں، افریقہ کے علاقوں میں، میڈلیسٹ کے علاقوں میں، پاکستان، ہندوستان، جہاں جہاں ہم نے سفر کیئے ہم نے جن کی زندگیوں میں تقویٰ اور دین دیکھا ان کو خوش پایا، دنیا کے چار کھنڈ کا میں نے سفر کیا ہے، صرف آسٹریلیا کو چھوڑ کر کہ وہاں جانہیں سکا، دعوت تو ادھر کی بھی تھی، تو غرض یہ کہ میں نے دنیا کے چار کھنڈ کا سفر کیا اور یہ دیکھا کہ جن کی زندگیوں میں تقویٰ ہے وہ خوشحال ہے، اور جہاں تقویٰ نہیں ہے تو بڑے بڑے ارب پتی ہم نے دیکھے ہیں مگر ان کو سکون نصیب نہیں ہے، پریشانی کا شکار ہے، بےلطفی کا شکار ہے، اس لئے شیطان سے عداوت ہم کو بھی مول لینی ہے جیسی اس نے ہم سے مول لے رکھی ہے، اور پھر دیکھو زندگیوں میں کیسا مزہ آتا ہے۔

سچ ہے کسی پہ بے مرے جینے کو کچھ مزہ نہیں

یہ جو ہم لوگوں کی ڈھیلی ڈھیلی زندگی ہے کیا لطف ہے زندگی میں ہاں! اللہ تعالی سے جوڑ پیدا کرلو اس کے بعد تمہیں بھی اپنے پر ناز ہوگا، وہ ناز غرور والا نہیں ہوگا، یہ ہوگا

کہ ہم بھی اپنا رب رکھتے ہیں ہم کو بھی اپنے اللہ تعالی سے تعلق ہے، یہ ہے، بزرگوں نے تو لکھا ہے کہ بچہ کو جتنا ماں باپ سے تعلق ہے اتنا بھی اگر ہم کو رب سے تعلق ہو جائے تو کام بن جائے، آپ نہیں دیکھتے، کسی بچہ کو چھیڑ و تو وہ کہتا ہے کہ اماں کو بول دوں گا، ابّا کو بول دوں گا اور زیادہ ہو جائے تو کہتا ہے کہ بلالاؤں گا، یہی ہوتا ہے نا، اس کو گویا اتنا اعتماد ہے، کوئی بات ہو تو کہے گا ابّا کو کہہ دوں گا، زیادہ ہوا تو بلالاؤں گا، یعنی اس کی طاقت وہ ہے، تو بس ہم کو بھی یہ ہونا چاہئے کہ جب کوئی مسئلہ ہو خدا تعالی سے کہہ دیں گے، اور جب یہ ہو گیا تو اللہ میاں بھی دیکھتے ہیں کہ یہ میرا بندہ مجھ ہی سے کہتا ہے اور اس کے معاملات حل فرمانا شروع کر دیتے ہیں، پھر غیب سے شکلیں پیدا ہوتی ہیں، آپ ٹرائی اور تجربہ کر کے دیکھ لیجئے، یہ سو فیصد کامیاب نسخہ ہے، آج کے اس گئے گذرے حالات میں بھی جنہوں نے تقویٰ کا اہتمام کیا ہے خدا تعالی نے ان کیلئے غیبی شکلیں پیدا کر دی ہے، آپ مالیات میں تقویٰ اختیار کیجئے اللہ تعالیٰ مال میں برکت دیں گے، غیب سے ضرورتیں پوری ہوگی، اور نہیں تو ہائے، ہائے، آنے دو "ھل من مزید، ھل من مزید، ، مگر وہ رٹ پوری نہیں ہوگی، بہر حال شیطان جو پیچھے لگا ہے وہ راہ مارتا ہے، یہ سب اسی پر بات تھی کہ شیطان اور نفس جو ہے وہ چلنے نہیں دیتا، باقی جانتے سب ہیں کہ یہ ٹھیک ہے، یہ غلط ہے، مگر نفس وشیطان چلنے نہیں دیتے۔

غیبت سے بچیں

دیکھو! ابھی لوگ مسجد سے باہر نکلیں گے اور کسی کا تذکرہ ہوگا کہ غیبت شروع ہو جائے گی، میں نے دیکھا رمضان میں عشاء بعد بہت سے لوگ مجلس کرتے ہیں تو اس میں غیبتیں ہوتی ہیں، اب غیبت اتنا بڑا گناہ ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے

ایک آدمی نے کہا کہ حضرت! مجھ سے گناہ ہوگیا میرے لئے دعا کیجئے، کہا ہیں! پھر پوچھا کیا گناہ ہوگیا؟ کہا زنا ہوگیا، کہا توبہ توبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے، پھر کہا کہ تم نے جب کہا تھا کہ گناہ ہوگیا تو میں سمجھا شاید غیبت ہوگئی ہوگی، (خطباتِ منورج ا ص ۵۲۵ ،غیبت کیا ہے؟) اور ہمارا حال یہ ہے کہ غیبت تو ہم صبح سے شام تک کرتے ہیں، تو زبان پہ کنٹرول ہو، نگاہ پہ کنٹرول، ساری چیزوں میں احتیاط کی کوشش کریں بچتے رہیں ڈرتے رہیں، پھر دیکھئے کیسی برکت ہوتی ہے پھر دیکھئے نمازوں سے کیسے نور پیدا ہوتا ہے، مگر ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ ابھی مسجد سے باہر نکلیں گے اور عورتیں گذریں گی تو اس کو دیکھنا شروع کردیں گے، اور بعض لوگ تو اس کو خدا تعالی کی قدرت کا نظّارہ بولتے ہیں، یہ بڑی بری بات ہے، بڑی غفلت کی بات ہے اللہ میاں دیکھ رہے ہیں کہ اس کی نگاہ کہاں جارہی ہے، تو تقویٰ اختیار کرے، شیطان تو پیچھے لگا رہتا ہے، ’’ان الشیطن للانسان عدو مبین ‘‘ بیشک شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے، کیوں بھائی احتیاط کریں گے نا! کبھی بری نظر نہیں اٹھائیں گے، یہ طے ہے نا! یہ طے کرلو کہ چاہے دنیا جہان کی حسینہ سامنے آجائے نظر نیچی کریں گے، اور اللہ میاں جب دیکھیں گے کہ میرا بندہ میرے خوف سے یہ عمل کررہا ہے تو اس کی عبادتوں میں حلاوت پیدا فرمادیں گے، ورنہ آدمی دیکھے تو اس کو کون پوچھنے والا ہے، لیکن آدمی یہ سوچے کہ نہیں وہ ذات تو مجھے دیکھ رہی ہے، پھر دیکھیں کہ اس پر کیا ملتا ہے، تو اللہ پاک ہمیں تقویٰ نصیب فرمائیں، نظر کا تقویٰ، زبان کا تقویٰ ، پیٹ کا تقویٰ، شرمگاہ کا تقوی، شیطان جو ہے اس نے ہم کو برباد کررکھا ہے اور وہ ہمارا کھلم کھلا دشمن ہے، دعا کیجئے اللہ تعالی اس سے حفاظت فرمائیں۔ آمین۔

درس نمبر (۷)

نبی اور امتی کا فرق

محترم حضرات ! حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی بات چل رہی تھی، یہاں ایک بات یاد رکھے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، علماءِ کرام نے لکھا ہے کہ امتی سو جائیں تو نیند ناقض وضوء ہے، (تعلیم الاسلام ص۵۰) اور پیغمبر سو جائیں تو پیغمبر کا نیند سے وضوء نہیں ٹوٹتا، (ابوداؤد شریف، حدیث نمبر۲۰۲، تعلیم الاسلام ص۹۷) یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے، پھر نیند سے بڑھ کر موت کا حال ہے، نیند میں ایک حال اور بھی ہے کہ امت کا کوئی آدمی خواب دیکھے تو وہ شرعی دلیل نہیں بنتا (عالمگیری) کہ آج اگر ہم میں سے کوئی دیکھ لے کہ اپنے لڑکے کو نیند میں ذبح کر رہا ہے تو نیند سے اٹھ کر بیٹے کو ذبح کرنا جائز نہیں چاہے چالیس ہزار دفعہ وہ یہ خواب دیکھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا، ابتداء میں تردد رہا، مگر وہی خواب آپ کے لئے حجتِ شرعی تھا، عالمگیری میں مستقل فقہی جزئیہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں تو اس کے لئے اپنے لڑکے کا ذبح کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ پیغمبر کا خواب دلیلِ شرعی ہے، اور ہمارا خواب دلیلِ شرعی نہیں بنتا، ہمارے یہاں برِصغیر میں ایک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے لڑکے کو ذبح کر رہا ہوں تو عقلمند نے نیند سے اٹھ کر اپنے بیٹے کو ذبح کر دیا یہ خیال کر کے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خواب مجھے بھی آیا ہے، تو۔

کارِ پاکاں را قیاس خود مگیر
گرچہ باشد نوشتن شیر و شیر
شیر آں باشد کہ مردم را خورد
و شیر آں باشد کہ مرد می خورد

کہ شیر اور شِیر کی کتابت ایک ہوتی ہے مگر شیر وہ جانور ہے جو انسان کوکھاتا ہے، اور شِیر دودھ کو کہتے ہیں جسے آدمی ہضم کرجاتا ہے، صورۃً دونوں ایک ہے مگر حقیقت دونوں کی مختلف ہے، پھر پیغمبر کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر وہ دنیا سے چلا جائے تو بیوی نکاح سے نہیں نکلتی تو موت تک پر اثر ہے، اور عام آدمی مرجائے تو بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے، (احکام میت ص ۱۳۴) اور پیغمبر کا انتقال ہوجائے تو اس کے بعد بھی حیات کی کیفیت ان پر اتنی قوی ہوتی ہے کہ بیوی نکاح سے نہیں نکل پاتی (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۵ ص ۴۸) یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کی بیویوں سے غیروں کو نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، نبیؐ کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو تشریف لے جانے کے بعد بھی آپ کی حیات کا یہ اثر ہے کہ آپ کی ازواج سے کسی کیلئے نکاح جائز نہیں ہے (حوالا بالا) یہ اسی حیات کا اثر ہے، اور ''النوم اخو الموت،، (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۴ ص ۵۶) کہ نیند جو ہے وہ موت کا مقدمہ ہے، پھر یہ کہ انتقال ہوجائے تو مال وراثت میں تقسیم ہوجاتا ہے (القرآن) اور پیغمبر کی حیات اتنی قوی ہے فرمایا ''لانَـرِثُ وَلَا نُـوْرَثُ'' (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۵ ص ۴۸) کہ ہمارے لئے وراثت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور امتی کا معاملہ ایسا نہیں ہے، اور جہاں موت کے بعد پھر حیات کی ایک خاص کیفیت ہے تو وہ شکل دوسروں کو نصیب نہیں ہے۔

آپ ﷺ کی موت کی بھی خصوصیت ہے

اسی لئے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: موت کے باب میں بھی

آپ ﷺ کے سلسلے میں فرمایا گیا کہ ’’ انک میت و انھم میتون ‘‘(زمر، آیت: ۳۰)تو موت کی بھی خصوصیت، اور ایسی مثال دی کہ جیسے ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمقمہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کر دیں تو اسکی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اسکی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہو گئیں۔ وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔ باقی یہ کہ روشنی موجود ہے غائب نہیں ہوئی، (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۵ ص ۴۷)تو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے ،فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کے جسدِ اطہر میں جو حیات تھی وہ ایک لمحہ کیلئے گویا آپ سے الگ کی گئی اور پھر اس کی کیفیت آپ کے حق میں ایسی ہے جیسے کہ بڑے بلب پر ایک مٹکا رکھ دیا جائے ،تو ساری حیات سمٹ کر قلب میں آ گئی ،تو جو حیات سارے اعضاء میں اس طرح جاری ساری تھی کہ مسجدِ نبوی، مدینہ منورہ اور اس کے علاوہ مکہ مکرمہ میں جس بدن کے ساتھ آپ تشریف لے جاتے تھے اور اس کے جو آثار تھے وہ حیات سمٹ کر قلبِ اطہر میں پہنچ گئی اور جب قلبِ اطہر میں پہنچی ہے وہ حیات تو ظاہر ہے کہ اس کی قوتِ ادراک اور زیادہ بڑھ جائے گی، یہاں ایک بات اور بھی ذہن نشیں رہے حدیث شریف میں فرمایا نبیٔ کریم ﷺ نے کہ میرا امتی جب مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ میری روح کو لوٹاتے ہیں اور میں اس کا جواب دیتا ہوں (درود شریف کے فضائل وآداب ص ۸۰) تو سوال یہ ہے کہ روح کے لوٹانے سے کیا مطلب! اگر روح باقی ہے تو لوٹانے کا کیا مفہوم، اور اگر روح باقی نہیں ہے تو حیات کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ اصل میں روح لوٹانے سے مراد یہ ہے کہ تجلیّاتِ حق میں نبی کریم ﷺ کی روحِ پاک مستغرق رہتی ہے ادھر متوجہ رہتی ہے اور جب کوئی امتی سلام پڑھتا ہے یا پیش کرتا ہے تو جواب دینے کیلئے ادھر سے اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے، یہ ہے درحقیقت روح کا لوٹانا، مگر پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا میں کوئی گھڑی ایسی نہیں

ہے کہ کوئی نہ کوئی سلام نہ پڑھتا ہو یقیناً کوئی مشرق میں پڑھ رہا ہوگا کوئی مغرب میں پڑھ رہا ہوگا، کوئی شمال میں پڑھ رہا ہوگا، کوئی جنوب میں پڑھ رہا ہوگا، تو کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں حضور ﷺ پر کوئی سلام نہ پڑھتا ہو، تو پھر اس کے جوابات دیئے ہیں آبِ حیات میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اور وہ اتنی دقیق ہے کہ اردو کا رسالہ ہے مگر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ جو شیخ الاسلام پاکستان تھے وہ فرماتے ہیں کہ: سترہ دفعہ میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے مگر اب بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جس کو میں حل نہیں کر سکا ہوں۔

ہر امتی کے دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کا ایک کنکشن ہے

مگر اس کا ایک مفہوم جو اپنے بعض اکابر سے سنا ہے وہ عرض کر دیتا ہوں ممکن ہے پلّے پڑ جائے پڑ جائے، اور نہ پڑے تو مجھے معاف فرمایئے، اور یہ مضمون خدا جانے کہاں سے چھڑ گیا۔

میں یہ ذکر رہا تھا کہ اسکی حقیقت یہ ہے کہ گویا ہر امتی کے قلب سے حضور ﷺ کے قلب تک ایک نورانی کنکشن ہے تار کا جیسے بجلی کے تار کا رابطہ ہوتا ہے اسی طرح ہر امتی کے قلب سے وہ رابطہ قائم ہے، شرابی ہو، کبابی ہو، بدکار ہو، گنہگار ہو، شرط یہ ہے کہ قلب میں ایمان ہونا چاہیئے، یہ الگ بات ہے کہ متقی کا کنکشن زیادہ قوی ہے اور روشنی زیادہ پہنچتی ہے، اور جو گنہگار ہے اس سے گناہوں کی وجہ سے کنکشن کمزور ہے کہ گناہوں کی وجہ سے بیچ میں کاٹ اور زنگ آ گئی ہے تو مدھم روشنی پہنچ رہی ہے، اسی لئے شیخ عبد العزیز دبّاغ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ابریز میں لکھا ہے کہ اگر یہ رابطہ کٹ جائے تو کٹتے ہی فوراً آدمی ایمان سے محروم ہو جائے گا اور فوراً اس کے باطن میں کفر کی ظلمت چھا جائے گی،

(فضل الباری شرح اردو ج اص ۴۱۰) اس لئے ہر آن پناہ مانگیں کہ یہ رابطہ منقطع نہ ہونے پائے، اور حق تعالیٰ باقی رکھے تاکہ دنیا سے جائے تو ایمان کے ساتھ سلامتی سے جائے، اسی لئے امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہر مؤمن کے دنیا کی چیزوں سے کچھ علاقے ہوتے ہیں، کرسی سے، بیوی سے، بچوں سے، مال سے، دکان سے دوستوں سے لیکن موت سے پہلے ایک بزرگ فرماتے تھے کہ میں نے نظرِ کشفی سے دیکھا کہ موت سے پہلے جتنے یہ تار ہیں سب کے سب سے اس کا کنکشن کٹ جاتا ہے، صرف ایک رابطہ اندرونِ قلب میں ہے اور اس کا تعلق نبی کریم ﷺ کے قلبِ اطہر سے ہے وہ اگر منقطع ہو جائے تو پھر ایمان آدمی کا رخصت ہو جاتا ہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ 'اللھم حبب الموت الی من یعلم انی رسولک'' (جواہر الاحادیث، حدیث نمبر ۹۶۰، کنز ۳۷۶۷) کہ اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو اور مجھ سے محبت رکھتا ہو، اور موت سے پہلے ہر مؤمن پر ادھر کی توجہ عموماً ہو جایا کرتی ہے کہ اس کو کچھ احساس ہو جاتا ہے، اور تجربہ بھی یہی ہے کہ عام لوگوں کو بھی یہ بات عموماً اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی برکت سے نصیب فرماتے ہیں کہ عموماً احساس ہو جاتا ہے، کبھی دبا رہتا ہے کبھی لفظوں سے ظاہر ہو جاتا ہے ورنہ عام طور پر احساس ہو جاتا ہے، خیر، یہ تو ضمنی چیز تھی۔

آپ ﷺ کی حیات و ممات سب میں اختصاص کی شان موجود ہے

میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ حضور ﷺ کی حیات و ممات سب میں اختصاص کی شان موجود ہے، جب یہ ایک حقیقت ہے تو وحی کے باب میں شیطانی تصرفات نہیں ہو سکتے (تاریخ وجنات وشیاطین ص ۳۵۸) اور اس میں پیغمبر کا اپنا ارادہ بھی شریک نہیں ہے جیسے نیند میں

آدمی کاارادہ کام نہیں کرتا ہے اسی لئے نیند میں غصہ ہوکر کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو واقع ہونا دشوار ہے (مکمل مسائل طلاق ص۸۲ بحوالہ شامی ج ۲) اور نیند میں کسی نے کسی کیلئے چیک دیدیا تو کسی کا حق اسپر ثابت نہیں ہوگا، تو نیند ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں احکام لاگو نہیں ہوتے ہیں مگر ہاں! سویا ہے ایسی جگہ جہاں سے گرنے کا قوی اندیشہ ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ نیچے بچہ سویا ہے اور خود پانچ دس من کی لاش ہے اور پھر کروٹ لے کے گرا ہے تو اس صورت میں کچھ فقہی احکام اس پر لاگو ہوں گے، جس کی تفصیلات کتبِ فقہیہ میں موجود ہیں، تو میں یہ ذکر کررہا تھا کہ پورے طور پر نبی کی حفاظت ہوتی ہے نبی کے ارادے کی، نبی کے خیالات کی ، اور شیاطین کے تصرفات کی سب طرف سے حفاظت اور بندش ہوتی ہے، تو علم میں حفاظت کی یہ شان ہے، اور عمل کے باب میں اتنی قوت کے ساتھ فیضان ہوتا ہے توفیق کا کہ طبیعت چل ہی نہیں پاتی کسی معصیت کی طرف اور کسی گناہ کی طرف بلکہ اگر کوشش بھی کرے تو شاید اس کا تحقق اس کی ذات سے ممکن نہ ہو، اس درجہ حق تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر کے حق میں حفاظت ہوتی ہے، تو یہ تو رہا مقامِ معصومیت جو حق تعالیٰ نبیوں کو عطا فرماتے ہیں۔

محفوظ کسے کہتے ہیں؟

مگر صحابیت کا جو مقام ہے یہ معصومیت کا مقام نہیں محفوظیت کا مقام ہے، (اسوۂ صحابہ ص ۳۸) اور محفوظ کہتے کسے ہیں اسے بھی آپ ذہنوں میں محفوظ فرمالیں، محفوظ کی حقیقت یہ ہے کہ جس کی عام زندگی تقویٰ اور تقدس کے انوار سے معمور ہو اور اتباعِ شریعت کی برکات سے وہ منور ہو کبھی طبعی طور پر اس سے کوئی فروگذاشت ہوجائے جس میں واقعۃً حقیقۃً صغائر کا کبھی اور کبھی کبائر کا بھی وقوع ہوسکتا ہے، (حوالا بالا) یہی فرق ہے معصومیت اور محفوظیت کے اندر کہ عام زندگی تقویٰ طہارت کی ہے، خشیت اور معرفت

باللہ کی ہے اور وہ صغائر سے بھی بچتا ہے اور کبائر سے بھی مگر کبھی اس کا امکان ہے کہ صغیرہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبیرہ بھی ہو جائے مگر دوام یا ہمیشگی یا اسپر غفلت یہ متصور نہیں ہے، اب آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صحابہ کے حالات پر اگر آپ نظر ڈالیں تو اکّے دُکّے واقعات آپ کو مل جائیں گے ایسے کہ کسی صحابی سے زنا ہوا، ایک آدھ واقعہ ایسا بھی مل جائے گا کہ شراب نوشی ہوئی، ایک آدھ واقعہ ایسا بھی مل جائے گا کہ سرقہ کا تحقق ہوا، اب ان واقعات کو لیکر جن لوگوں نے دل کھول کر اور طبیعت کو کھول کر اپنے اندر کے جذبات صحابیت کے باب میں عقیدت کے ظاہر کئے ہیں، یعنی جو عظمت ذہن میں ہے وہ کھلی ہے کہ جسکے نتیجہ میں اپنی ذات میں جو نقص تھا یا کمزوری تھی وہ تو تھی، لیکن امت کا ذہن باضابطہ بنانے کی کوشش کی ہیں کہ صحابیت کو معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر نہ سمجھا جائے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے ذہن جنہوں نے بنائے ہیں سب سے پہلا سوال ان اشخاص سے یہ ہوتا ہے کہ اگر صحابیت سے اعتماد اٹھالیا جائے تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ حدیث شریف کو تو جانے دیجئے اور حدیث پر بحث کرنے والے ایک طرف ان عقلمندوں سے بحث نہیں ہے، ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآنِ کریم جو آپ کے محراب میں سنایا جارہا ہے اگر ایک شخص کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے کہ یہ وہ قرآنِ کریم ہے ہی نہیں جو جنابِ نبیٔ کریم ﷺ پر نازل ہوا تو آپ کیا دلیل پیش کریں گے؟ اس لئے کہ متعلمین اولین، اور تلامذۂ اولین، اور شاگردِ اولین آپ ﷺ کے وہ صحابہ ہیں، اور قرآنِ کریم بھی صحابہ کی برکت سے امت تک پہنچا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کو گالی دینے کی نحوست

یہی وجہ ہے کہ وہ طبقہ جو صحابہ کو گالی دیتا ہے ان میں کوئی حافظ نہیں ہوتا، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ نے بمبئی میں یہ اعلان کیا تھا کہ جو لوگ حضراتِ

صحابۂ کرام کواور خلفاءِ راشدین کو گالی دیتے ہیں ان میں کوئی حافظ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اساتذہ کو گالی دینے والا علم سے محروم ہوجاتا ہے، تو ایک شخص نے جو اُس مسلک سے تعلق رکھتا تھا جن میں صحابۂ کرام کو گالی دی جاتی ہے ایک حنفی لڑکے کو بہت بڑی رقم دی اور کہا کہ جمعہ کے روز ممبر پر چڑھ کر یہ اعلان کرنا کہ میں فلاں مسلک سے تعلق رکھتا ہوں جس میں صحابۂ کرام کو گالی دی جاتی ہے اسکے باوجود میں حافظِ قرآن ہوں، اس نے یہی اعلان کیا اور تھا بچہ اور آپ یہ جانتے ہیں کہ بچے حقیقت واضح کردیتے ہیں، کہ ان سے یہ کہو کہ باہر جاکر یہ کہو کہ باجی (ابا) گھر میں نہیں ہے، تو وہ باہر جاکر یوں ہی کہے گا کہ ابا نے یہ کہا کہ ابا گھر میں نہیں ہے، تو وہاں تو کوئی حقیقت چھپتی ہے ہی نہیں، خیر، وہ جب بیٹھا اور اس سے کہا گیا کہ پڑھو قرآن جب بات نکلی ہے تو میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ کا تھوڑا سا تعارف کردوں ،آپ بہت بڑے مناظر اور متکلم گذرے ہیں ہندوستان کی سرزمین سے لیکر ایران تک انکی عظمتوں کے شہرے تھے اور بڑے بڑے مجتہدینِ شیعہ اور دوسرے مختلف فرقوں کے لوگ ان سے بحث کرتے تھے، اور وہ باتیں جو ان کی کتابوں میں انہیں نہیں ملتی تھی مولانا کو وہ باتیں مستحضر تھیں، تو ہوا یہ کہ اس نے یہ اعلان کیا کہ میں حافظِ قرآن ہوں، مولانا نے فرمایا کہ پڑھو، اب جب اس نے پڑھنا شروع کیا تو اللہ تعالی کی شان کے اس کی سورۂ فاتحہ بھی نہیں چل سکی، سورۂ فاتحہ میں ہی زبان اٹک گئی، ایسے ہی ایک واقعہ کا تذکرہ مفتی محمود صاحب کے ملفوظات میں بھی ہے (ملفوظاتِ فقیہ الامت، قسط اول ص۶۳) اور تھا تو بچہ ہی اس نے یہ کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ سب حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں حنفی ہوں، اور میرا ایمان قرآنِ کریم پر ہے، صحابہ پر ہے، ان کی عظمت میرے دل میں ہے، مجھے پیسوں کا لالچ فلاں فلاں لوگوں نے دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ یہ اعلان کردینا کہ میرا تعلق ان سے ہے، تو حق یہ ہے کہ مجھے طمع اور لالچ

دلائی گئی باقی نہ وہ میرا مذہب ہے، نہ مسلک ہے، صحابہ کی عظمت میرے ذہن میں ہے، اور میں اپنے اس عمل سے توبہ کرتا ہوں، مولانا نے فرمایا کہ اب پڑھو قرآنِ کریم، اب جو پڑھا تو وہی فرفر (جلدی جلدی) پڑھنا شروع کر دیا نہ رکنے کا سوال نہ اٹکنے کا سوال۔

تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

صحابہ کو دیکھ کر اندازہ ہوگا کمالاتِ نبوت کا

تو میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ جب متعلمین اولین شخصیت ان کی ہیں، اور اس کو آپ ایسے سمجھ لیں جیسے یہ سورج ہے اس کو ہم آپ دیکھتے ہیں، سورج تک ہماری نگاہیں جو پہنچتی ہیں تو یہ اتنا موٹا مسئلہ ہے کہ سائنسِ جدید کا کہ ایک مبتدی بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ بیچ میں خلا اور فضا لاکھوں کروڑوں میل کی مسافت ہے، بہت طویل مسافت ہے، اور نوری ساز انہوں نے قائم کئے ہیں، اس کا میٹر الگ قائم کیا ہے، اسکی مسافتیں الگ قائم کی ہیں اور اس پر بھی بحث کی ہے کہ روشنی کتنے سیکنڈ میں کتنی مسافت طے کرتی ہے، تو اس سورج تک جب آپ کی نگاہیں پہنچتی ہے تو یہ تھوڑا ہی ہے کہ سورج آپ کی آنکھوں سے لگا ہوا اور آنکھیں سورج سے ملی ہوئی ہے، بیچ میں ایک بہت طویل فضاء ہے، مگر وہ فضا جو سورج کے اطراف میں ہے اور آپ کے اور سورج کے درمیان ہے اس فضا پر جب آپ نظر ڈالتے ہیں تو وہ اتنی صاف شفّاف اور روشن ہے کہ اس میں نظر ڈالو تو سورج دِکھائی دیتا ہے اور سورج کو دیکھو تو وہ بیچ میں مانع نہیں بنتی بلکہ وہ معاون بنتی ہے اس ذات تک پہنچنے کیلئے، اور آج کے اس دور نے تو ان مسائل کو بہت آسان کر دیا ہے، فلسفۂ قدیم تو اس بات کا قائل تھا کہ آنکھوں کی بینائی اور انسان کی گویائی اور سماعت کا تعلق ہوا پر ہے، اور اس پر یہ چیزیں چلتی ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

ہوامیں جو کہربائی چیزیں ہیں انہیں چیزوں کو بنیاد بنا کر آج ٹائپ کی شکلیں سائنس قائم کررہی ہیں، تو اس سے پتہ چلتا ہے ان کے ان نظریات کا کہ انہوں نے کتنی باریک نظری سے کام لیا، چنانچہ فلسفۂ قدیم میں ہم نے ان چیزوں کو پڑھا بھی ہے، تو مجھے یہ بتانا ہے کہ اتنے سارے خلا کے باوجود بیچ کی فضا سورج کی ترجمانی کرتی ہیں، اب ہم آپ سے کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ تو ہے آفتاب روحانیت کا سن (سورج) ہے علم ومعرفت کا، اور یہ صحابہ بیچ کی فضاء ہے، تو یہ اتنے صاف شفاف اور بے داغ ہیں کہ جب آپ ان میں نظر ڈالیں تو ذاتِ اقدس کے کمالات ان میں جلوہ گر ہوں گے اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوگا کمالاتِ نبوت کا۔

ہر صحابی دلیل تھا کمالاتِ نبوت کی

اسی لئے یہی مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ جن کا ابھی ذکر آیا فرماتے تھے کہ: حضور ﷺ نے چار لاکھ صحابہ ایک روایت کے اعتبار سے (انسانی فریضہ ص ۱۱) اور ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ ایک اور مشہور روایت کے اعتبار سے (المسک الذکی ج ۱ ص ۴۴) جو چھوڑے ہیں، تو یہ ایک لاکھ ۲۴ ہزار صحابہ حضور نے نہیں چھوڑے، ایک لاکھ ۲۴ ہزار صحابہ کیا تھے یہ دلائلِ نبوت تھے کہ ہر صحابی پروف اور دلیلِ نبوت ہیں کہ جس صحابی کو دیکھ لو تو اس کی زندگی کمالاتِ نبوت کی دلیل پیش کررہی ہیں کہ ان کے جھروکوں سے آپ دیکھ لیں کہ ذاتِ اقدس کے کمالات یہ ہیں۔

دیکھنے والی آنکھیں ہیں، چشمہ نہیں

جیسے ایک شخص نے کہا تھا کہ مجھ پر حق تعالیٰ کی تجلی ہوئی اور میں نے اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، تو اس کے باب میں شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ نے

وضاحت فرمائی کہ دیکھئے! یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض دفعہ کسی نورِ حق کا احساس اور ادراک قلب کو ہوتا ہے مگر وہ ادراک ہوتا ہے آنکھوں کے راستے سے، اس کو آپ ایسے سمجھ لے جیسے مثلاً آپ یہاں کھڑے ہو جائے اور ایک آدمی فلاں کار کے قریب کھڑا ہے، تو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اسے آنکھوں سے دیکھا، اور یوں بھی ارشاد فرما سکتے ہیں کہ میں نے اسے کھڑکی سے دیکھا، تو ظاہر بات ہے کہ کھڑکی اپنی ذات سے مدرک نہیں ہے کہ اس سے رؤیت ہو، وہ تو آپ کی بینائی کیلئے ذریعہ اور واسطہ بنی ہے، کھڑکی سے تھوڑی دیکھا جاتا ہے، جیسے چشمہ آنکھ پر ہے چشمہ مدرک نہیں ہے، بلکہ وہ ادراک کا سبب بنتا ہے، (مجالس حکیم الاسلام ج اص ۳۴۱) اسی لئے بینائی رخصت ہو جائے تو چھپن (۵۶) چشمے لگا لو تب بھی کچھ نظر نہیں آئے گا، تو معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ ہے، چشمہ دیکھنے والا نہیں ہے۔

کان کا ایک فائدہ ایسا بھی

یہاں ایک لطیفہ بھی سن لے، ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ اللہ میاں نے دو کان بنائے ہیں اس میں کیا حکمت اور فائدہ ہے؟ کہنے لگے اس کا ایک فائدہ تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی اس سے سنتا ہے، اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس پر چشمے کی ڈنڈی اٹکا سکے، میں نے کہا سبحان اللہ، کیا خوب فائدہ بیان کیا، تو خیر، ایسے بھی فوائد لوگ بیان کرتے ہیں، تو یہ ذہن میں رہے کہ ایک ہے بینائی سے دیکھنا اور ایک شکل ہے کھڑکی سے دیکھنا، تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں آنکھوں سے دیکھا، اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کھڑکی سے دیکھا، مگر کھڑکی اپنی ذات سے رؤیت نہیں کر سکتی کہ اس سے آدمی دیکھ سکے تو بینائی اور ادراک درحقیقت قلب کی صفت ہے، اسی لئے ہارڈ فیل ہو جائے تو بینائی سالم ہے،

آنکھیں موجود ہے مگر آپ ہزار کوشش کریں وہ دیکھنے سے رہا، پھاڑ پھاڑ کے اس کی آنکھ میں آپ تشریف فرما ہو جائیں تب بھی وہ دیکھنے سے رہا، معلوم ہوا کہ مدرک اور رؤیت کا تعلق کسی اور شئی سے ہے۔

صحابیت وہ صاف و شفاف فضاء ہے جس سے نبوت کے آفتاب کی ذات نظر آتی ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ صحابیت وہ شفاف فضا ہے جس سے نبوت کے آفتاب کی ذات نظر آتی ہیں یعنی نبی کریم ﷺ (خطبات حکیم الاسلام ج ۳ ص ۳۴۹) اس سے ایک مسئلہ یہ بھی نکلا کہ آپ کیچڑ لے اور اس کو اچھال کر یہ چاہے کہ بیچ کی فضا کو مکدّر کر دیں، گندگی لے اور اس پر ڈالیں کہ بیچ کی فضا خراب اور کثیف ہو جائے، تو جب تک آپ زور لگائیں گے وہ وہاں تک پہنچے گی اسکے بعد پھر فضا روشن اور صاف ہے، (خطبات حکیم الاسلام ج ۲ ص ۳۰۴/۳۰۵) تو اگر آج کوئی شخص اپنی زبان اور قلم سے صحابیت کی اس بیچ کی فضا کو مکدر اور خراب کرنا چاہے اور چاہے کہ کسی کے کان اور ذہن پر اس کا اثر پڑ جائے، مگر صحابیت پر اس کا اثر کبھی بھی نہیں پڑ سکتا، اس لئے کہ وہ جس مقبولیت کے ساتھ اپنی قبروں میں جا چکے ہیں دنیا جہان کی طاقتیں اور صلاحیتیں اس مقبولیت کو ختم نہیں کر سکتی، قرآنِ کریم ان کے بارے میں فرما چکا ہے کہ "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" (توبۃ، آیت: ۱۰۰) اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ اللہ تعالی سے راضی ہیں۔

احسان فراموش بداخلاق سمجھا تا ہے

پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی ہے کہ ہم آپ دنیا میں احسان فراموشی کو بہت برا سمجھتے ہیں، اور احسان مندی کو اچھا سمجھتے ہیں، آپ کسی کے ساتھ

سلوک کریں اور معمولی سلوک کریں اور وہ اس پر آپ کو تھینک یو کہے، آپ کا شکریہ ادا کرے، آپ کو محسن جانے، تو آپ کہیں گے کہ یہ معقول اور سمجھدار آدمی ہے، اور اگر آپ کے احسان کے بعد وہ نہ آپ کی طرف توجہ کریں، نہ اعتناء کریں، بلکہ آپ کے ساتھ بدسلوکی کرے، تو آپ کہیں گے بداخلاق اور گرے ہوئے کیریکٹر کا آدمی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی علم وسائنس کے فلسفہ کی ضرورت نہیں ہے ایک دیہاتی بھی اس کو سمجھ لیتا ہے، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں جانور بھی سمجھتا ہے، اس لئے کہ جانور بھی قیاس کرتا ہے، آپ کتے کو آج روٹی ڈالدیں وہ کھا کر چلا جائے گا، دوسرے دن پھر ڈالے تو وہ اِن دو دن پر تیسرے روز کو قیاس کرے گا، معلوم ہوا کہ قیاس اور استدلال کی صفت تو جانور میں بھی قدرت نے رکھی ہے، بلکہ لکھا ہے کہ کتے میں احسان مندی کی جو صفتیں ہیں اگر انسان میں وہ آجائیں تو انسان ولی بن جائے کہ وہ ایک ٹکڑا روٹی پا کر چوبیس (۲۴) گھنٹے اپنے آقا کا در نہیں چھوڑتا ہے اور ہم چوبیس (۲۴) گھنٹے کھانے کے بعد خدا تعالی کے گھر کی طرف رخ نہ کریں، تو کتاّ ہم سے اس معاملہ میں اچھا ہے۔

صحابہ کا احسان ہر امتی کی گردن پر ہے

تو منشا یہ ہے کلام کا کہ یہ آپ جانتے ہیں کہ احسان مندی بڑی چیز ہے، صحابیت ہی کے طفیل سے ہم کو قرآنِ کریم بھی ملا ہے اور حدیث شریف بھی ملی ہیں، اور حدیث وقرآن کس شان کے ساتھ ملی ہیں یہ ایک تفصیلی موضوع ہے، اور یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کے طفیل ہمارا ایمان بنا ہوا ہے، اور ایمان کے طفیل کروڑوں اربوں کھربوں سال کی لامحدود زندگی کی نعمتیں آدمی حاصل کرے گا، اور مصیبتوں سے نجات ملے گی، تو جن کا احسان امت کی گردن پر۔ اور جن کے باب میں لکھا ہے خصوصاً

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ نے کہ پوری امت پہ اللہ تعالی نے نظر فرمائی اور نظر فرمانے کے بعد دیکھا تو جتنے جوہر قابل تھے اور سب سے زیادہ صلاحیت رکھنے والے تھے ان تمام کو اپنے نبیٔ اقدس ﷺ کی خدمت کیلئے منتخب کرلیا (ترجمان السنۃ، فتاوی رحیمیہ ج۳ص۱۰۰) ایسا نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے یہ صحابہ معمولی تھے یہ پوری امت کا خلاصہ ہیں، اسی لئے حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش! ہم صحابی ہوتے، فرمایا یہ تمنا دشوار ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں ہوتے تو منافق ہوتے کیونکہ صحابہ نے جو قربانیاں دی ہیں وہ قربانیوں کا ہم آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔

محسن کا احسان نہ ماننا ''شر'' ''آفت'' ہے

آج تو ہمارا حال یہ ہے کہ ذرا سی بات مزاج کے خلاف ہو تو اسلام پر اعتراض کرنے لئے تیار ہوجاتے ہیں، دین پر اعتراض کرنے کیلئے تیار ہوجاتے ہیں اور پھر صحابیت کے لئے یہ جذبہ، انہوں نے تو اپنا سب کچھ فنا کردیا تھا اور نثار کردیا تھا، تو ان کا احسان امت کی گردن پر اتنا ہے کہ اس سے امت عہدہ برآں نہیں ہوسکتی، اور محسن کا احسان ماننا یہ شرافت کی بات ہے، اور نہ ماننا یہ ''شر'' ''آفت'' کی بات ہے، شرافت کی بات نہیں ہے، جب یہ ایک حقیقت ہے تو اب آپ اندازہ لگایئے کہ صحابیت کا احسان امت کی گردن پر کتنا بڑا ہے، آپ اگر ان کو سوچیں تو عظمت سے گردن جھک جائے گی، اور نگاہیں شرم سے پست ہوجائے گی، اور اس عظیم محسن مخلوق کے بارے میں اگر آج ہم یہ کہیں کہ ان میں فلاں نقص تھا اور فلاں خامی تھی اور فلاں عیب تھا اور وہ قابلِ اعتبار و اعتماد نہیں ہے تو ہم سارے دلائل و پروف سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتے ہیں

کہ احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں ملے گی، کہنے والا کون ہے ہمیں اس سے بحث نہیں ہے، مگر صحابیت کی عظمتوں سے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں، اگر آج ہم ان پر حرف لائے اپنے قلم کے ذریعہ سے، یا بیان کے ذریعہ سے، یا کسی انداز کے ذریعہ سے تو گویا ہم اپنے عمل سے دنیائے علم ومعرفت میں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہم احسان فراموش ہیں۔

جو صحابہ کا نہیں وہ آپ ﷺ کا بھی نہیں ہوسکتا

اور جو صحابیت کا احسان فراموش ہو وہ آپ ﷺ کا کبھی نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ جو صحابہ کا نہیں ہے وہ آپ ﷺ کا نہیں ہے، جو صحابہ کا نہیں ہے وہ خدا اور رسول سے بھی صحیح تعلق قائم کرنے والا نہیں سمجھا جائے گا، یہاں تک لکھا ہے عارفین نے کہ اہلِ قلوب سے بدعقیدگی کے نتیجہ میں سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے، (فتاوی رشیدیہ) تو بھلا وہ حضرات جنہوں نے زندگیاں کھپا دیں، تو ایک تو ان کی محسنانہ شان ہے، اور دوسری دین کے لئے ان کی خادمانہ شان ہے، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ صحابہ کی، محبت، عظمت، اور عقیدت، نصیب فرمائیں، آمین۔

درس نمبر (۸)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

قال یبنی لاتقصص رؤیاک علی اخوتک فیکیدوا لک کیدا،

ان الشیطن للانسان عدو مبین(یوسف،آیت:۵) **صدق الله العظیم.**

صحابی کسے کہتے ہیں؟

بزرگانِ محترم! گذشتہ کل اس آیت پر گفتگو ہورہی تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندِ ارجمند حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بات بیان فرمائی کہ اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا کہ وہ تمہارے لئے کوئی تدبیر کرے کہ جس سے کوئی ضرر پہنچ جائے تمہیں، بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، یہاں ہم نے ایک بات کہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جو گیارہ بھائی ہیں وہ تمام صحابی ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صحبت میں رہے ہیں، اور نبی کا صحبت یافتہ اگر ایمان کے ساتھ ہے تو وہ صحابی کہلاتا ہے (اسوۂ صحابہ ص ۱۹/۲۰) اور ایک قید علماء نے یہ بھی لگائی ہے کہ ایمان کے ساتھ حضور ﷺ کی زیارت ہوئی ہو اور مرتے دم تک ایمان پر قائم رہا ہو، اور اگر ایمان چھوڑ کر مرتد ہوگیا ہو تو وہ صحابی نہیں ہے، یا اگر مثلاً نابینا ہے تو صحبتِ اقدس میں حاضری بھی کافی ہے جیسے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ وہ نابینا تھے انہوں نے حضور ﷺ کو اپنی ظاہر کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی صحابی ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جتنے تھے وہ سب صحابی تھے، نبی نہیں تھے یہی زیادہ راجح بات ہے، آگے فرمایا کہ شاید وہ تمہارے لئے کوئی چال اور کوئی تدبیر کرے اور تمہیں

ضرر پہنچائے، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

شیطان انسان کو نظر نہیں آتا تو پھر وہ اس کا کھلا ہوا دشمن کیسے ہے؟

یہاں کچھ بحثیں ہیں، ان میں پہلی بات یہ ذہن نشین رہے کہ قرآنِ کریم نے کئی مقام پر یہ بات کہی ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیطان نظر ہی نہیں آتا، جب شیطان کا وجود نظر نہیں آتا جو موصوف ہے تو اس کی دشمنی کا نظر آنا تو اور دور کی بات ہے، تو پھر کھلا دشمن کیسے ہوا؟ پھر قرآنِ کریم نے یہ کیسے فرمایا کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شئی کا کھلا پن اسی کے اعتبار سے ہوتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ جو چیز کھلی ہو، واضح ہو، روشن ہو، وہ ظاہر کی آنکھوں ہی سے نظر آئے، جیسے مثال کے طور پر ایک بات ہے اور بات کا سمجھنا انسان کے دل و دماغ سے تعلق رکھتا ہے پھر بھی بولتے ہیں کہ یہ بہت کھلی ہوئی بات ہے، بہت صاف بات ہے، تو بات تو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ تو دل سے سمجھی جاتی ہے اور دماغ سے پکڑی جاتی ہے گرفت کی جاتی ہے، اور اسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ بہت صاف بات ہے، اس میں سمجھنا ہی کیا ہے، ایسا کہتے ہیں نا گجراتی میں، تو بات آنکھوں سے نہیں دِکھتی اس کو تو آدمی کان سے سنتا ہے اور دل و دماغ سے سمجھتا ہے، یا مثلاً کوئی مسئلہ ہے اس کی کوئی صورت ہے تو وہاں یہ کہتے ہیں کہ مسئلہ کی صورت بہت واضح ہے بہت صاف ہے، یا مثال کے طور پر انسان کے ذہن میں کوئی مضمون ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ مضمون بہت صاف ہے، بہت واضح ہے، تو ہر شئی کا صاف ہونا اسی کے اعتبار سے ہے، جیسے ہمیشگی اسی کے اعتبار سے ہے مثلاً آپ کہے کہ فلاں حافظ صاحب جو ہے وہ ہمیشہ ہمارے یہاں آتے ہیں، تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ رمضان میں آتے ہیں، حالانکہ سال بھر نہیں آتے، شوال سے لیکر شعبان تک نہیں آتے، لیکن آپ کہیں گے کہ فلاں حافظ صاحب ہمارے یہاں ہمیشہ آتے ہیں، تو یہ ہیشگی چونکہ ’’حافظ،، کا لفظ آپ نے کہا تو اس اعتبار سے سامنے والا سمجھے گا کہ یہ ہیشگی سالانہ والی ہیشگی ہے، یا جیسے آپ کہے کہ سورج ہمیشہ طلوع ہوتا ہے، تو ہمیشہ طلوع ہونے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ظہر کے وقت بھی طلوع ہوتا ہے، اور جو ہے عصر کے وقت بھی طلوع ہوتا ہے، اور مغرب کے وقت بھی طلوع ہوتا ہے، صبح اس کا ٹائم ہے لیکن روزانہ صبح چونکہ طلوع ہوتا ہے اس لئے کہتے ہیں کہ ہمیشہ طلوع ہوتا ہے، چاند انسان کو دکھائی دیتا ہے، تو کہتے ہیں کہ بھائی یہ چاند تو ہمیشہ اسی طرح دِکھائی دیتا ہے، ہمیشہ کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ وہ ستائیسویں کو بھی دکھائی دیتا ہو یا اٹھائیسویں کو بھی دکھائی دیتا ہو، تو ہر شئ کی ہیشگی اس کے مناسب، ہر شئ کا صاف اور واضح ہونا اس کے مناسب، تو شیطان کی چالیں، اس کی مکّاری، اس کی بدمعاشی، اس کا انسانوں کو بہکانا، انسانوں کو بری بری راہ سُجانا، برائی کی طرف لے جانا یہ ایسا صاف ہے کہ اگر آدمی ذراسی سمجھ رکھتا ہو، اور ذراسی فہم رکھتا ہو، اور ذراسی عقل رکھتا ہو تو وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، تو حق تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے اور ظاہر کی آنکھوں سے آدمی دیکھے بلکہ آدمی اس بات کو سمجھتا ہے کہ اس سے اس کی دشمنی ہے۔

پیغمبر کی زندگی انسانوں کیلئے ایک نمونہ ہے

تو پیغمبر کی زندگی ایک نمونہ ہے، مگر کیا پیغمبر ایسا کرسکتا ہے کہ وہ چوری کریں خدا

نخواستہ اور پیغمبر کا ہاتھ کٹے اور امت کیلئے نمونہ بنے، ایسا ہوسکتا ہے؟ یہ بات پیغمبر کی اور نبی کی شانِ نبوت کے خلاف ہے، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ پیغمبر شراب کا پیالہ منھ کو لگائے معاذ اللہ، اور پیغمبر کو درّے لگائے جائیں کوڑے لگائے جائیں اور امت کیلئے نمونہ بنے معاذ اللہ، ایسا نہیں ہوسکتا، کیا یہ ممکن ہے کہ نبی کسی کے ساتھ زنا کرے معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، اور پھر نبی کو سنگسار کیا جائے اور امت کیلئے نمونہ بنے، ایسا ہوسکتا ہے؟ تو چوری کرنا، زنا کرنا، شراب پینا، ایسے کسی گناہ کا وجود یہ نبی کی نبوت اور پیغمبر کی پیغمبری اور رسول کی شانِ رسالت کے خلاف بات ہے بالکل، سمجھ رہے ہیں آپ میری بات، یہ اصولی بات ہے، اسے آپ سمجھو گے تو اپنے ساتھ ایک روشنی رکھو گے، اپنے ساتھ دین کی فہم رکھو گے، اور کچھ پتہ چلے گا کہ واقعی کچھ اصولی بات سنی ہے، ایران تران کے قصے آپ کو نہیں سنائے جا رہے ہیں، لیکن ہے بات بہت اصولی اور کام کی، تو پیغمبران کاموں کو اگر کرتا ہے اور پھر نمونہ بنے تو یہ پیغمبر کی پیغمبری کے خلاف بات ہے، اللہ تعالی کی شانِ غیرت کے خلاف ہے کہ اس کا محبوب پیغمبر ایسی کوئی حرکت کرے، اور پھر وہ عملی نمونہ بنے۔

کچھ واقعات صحابہ پر اس لئے گذارے گئے تا کہ وہ امت کیلئے نمونہ بنے

جب آپ اس بات کو سمجھ گئے، تو اِکّے دُکّے واقعات صحابہ میں ایسے گذار دیئے جاتے ہیں کبھی کہ کسی سے یہ ہوگیا یہ ہوگیا یہ ہوگیا تا کہ وہ امت کے حق میں نمونہ بنے، اور وہ چیز پیغمبر پہ گذاری نہیں جاسکتی، کیسی عجیب حکمت لکھی ہے کہ یہ امت کے افراد پر تو

گذاری جاسکتی ہے صحابیت اس کا تحمل رکھتی ہے وہ بھی عام حالات میں، بتایئے کہ ایک صحابی سے زنا ہوا، مگر صحیح احادیث میں موجود ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایسی توبہ کی ہے کہ مدینہ پہ تقسیم کردی جائے تو وہ سب کی نجات کیلئے کافی ہے، (ابوداؤد) کیسا قوی ایمان ہوگا، تو صحابیت سے اگر کوئی ایسی چیز سرزد ہوجائے تو ان کا ایمان اوران کے اندر کی قوت اتنی قوی ہوتی ہے کہ توبہ بھی ویسی ہی کرتے ہیں۔

صحابہ کے دلوں میں ایمان پہاڑ سے زیادہ جما ہوا تھا

اسی لئے ایک صحابی سے کسی نے پوچھا کہ کیا صحابہ ہنستے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ جی ہاں! ہنستے تھے، آپس میں خوش مزاجی بھی کرتے تھے، مگر ایمان ان کے دلوں میں پہاڑوں سے زیادہ جما ہوا تھا (حیاۃ الصحابۃ ج ا ص ۶۰ بحوالہ ابونعیم فی الحلیۃ ج ا ص ۳۱۱)۔

صحابیت سے اعتماد اٹھالینا قرآنِ کریم سے اعتماد اٹھالینا ہے

توکبھی ان کی زندگی میں اگر کوئی ایسی چیز پیش آجائے اس کو بنیاد بنا کر صحابیت کی شخصیت پر جرح کرنا اوران سے اعتماد اٹھانا ہم سمجھتے ہیں دوسرے لفظوں میں قرآنِ کریم سے اعتماد اٹھانا ہے، حدیث شریف کے ذخیرہ سے اعتماد اٹھانا ہے، چونکہ صحابیت سے اگر کسی شخص نے اعتماد اٹھایا تو ہم کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی محفوظیت کی آپ کے پاس کیا گارنٹی ہے؟ بتایئے! کوئی ثابت کرے کہ قرآنِ کریم کے محفوظ ہونے کی کیا گارنٹی ہے؟ پیغمبر کے اولین شاگرد سے اگر جو ہے اعتماد اٹھ جائے گا اوراس میں یہ احتمالات پیدا ہونے لگ جائیں گے کہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے صحیح لکھا ہو یا غلط لکھا ہو، صحیح محفوظ کیا ہو یا غلط، تو جہاں حدیث شریف کے ذخیرہ سے اگر کوئی اعتماد اٹھانے والا اعتماد اٹھاتا ہے، بھروسہ اٹھانے والا بھروسہ اٹھاتا ہے، وہیں قرآنِ کریم سے بھی اعتماد اور بھروسہ اٹھ

جا تا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حدیث شریف سے تو اعتماد اٹھ جائے اور قرآنِ کریم پہ اعتماد قائم رہے۔

حدیث شریف کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا ہے

آپ کہیں قرآنِ کریم کی حفاظت کا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ حدیث شریف کی حفاظت کا بھی اللہ میاں نے وعدہ کیا ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وانزلنا الیک الذکر'' (نحل، آیت: ۴۴) ہم نے قرآنِ کریم آپ کی طرف نازل کیا ہے ''لتبین للناس'' تاکہ لوگوں کیلئے آپ بیان کریں، اور لوگ قیامت تک قرآنِ کریم کے مفہوم کے محتاج ہیں، لہٰذا پیغمبر کے بیان کے بھی محتاج ہیں، قرآنِ کریم کی آیت حدیث شریف کے دوام کا بھی پتہ دے رہی ہے کہ جس طرح قرآنِ کریم محفوظ ہے اسی طرح حدیث شریف کی محفوظیت کی شان بھی باقی رہے گی، فرق اتنا ہے کہ وہ قطعی ہے او یہ غیر قطعی ہے، وہ تلاوت کیا جاتا ہے، اسکی تلاوت اس طرح سے نہیں ہے، اس کے ایک ایک حرف میں ثواب ہے اس میں نہیں ہے وہ نماز میں پڑھا جائے گا یہ نہیں پڑھا جائے گا، باقی دونوں کے اندر گفتگو اس اعتبار سے نہیں ہوسکتی۔

برادرانِ یوسف پر ہمیں تنقید کرنے کا حق نہیں ہے

تو میں یہ ذکر کرنا چاہتا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کچھ باتیں ایسی ہوئیں کہ ان کو ایذا پہنچی، ان سے حسد ہوا، ان کو گھر سے بے گھر کیا، والد سے الگ کیا، یہ سب گناہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے خود انہیں معاف کردیا، ایک، حضرت یعقوب علیہ السلام

نے ان کو معاف فرما دیا، دو، اور حق تعالیٰ نے بھی انہیں معاف فرما دیا، اس لئے کہ قرآنِ کریم کے جو وعدے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی توبہ پر خدا تعالی معاف فرماتے ہیں اور انہوں نے سچی پکی توبہ کی ہیں، چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بکثرت استغفار کرتے تھے اور را اپنے اس فعل پر روتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ بے چین ہوکر انہوں نے اپنے ابا جان سے کہا کہ ہم نہیں جان پاتے کہ ہمارا گناہ معاف ہوا یا نہیں؟ آپ نے معاف کر دیا، بھائی یوسف نے معاف کر دیا، اللہ تعالی نے معاف کیا، یا نہیں، چین نہیں آتا اس سلسلہ میں، تو آپ ہمارے لئے اس معاملہ میں اتنی دعا فرمائیں کہ ہمیں یہ اطمینان ہو جائے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام آگے کھڑے ہوئے پیچھے یوسف علیہ السلام اور بھائی لوگ اور پھر انہوں نے دعائیں کیں، اور اتنی دعائیں کیں کہ خدا تعالی کی طرف سے وحی آئی ہے کہ آپ کے صاحبزادوں سے جو گناہ ہوا ہے سب معاف کر دیا گیا، لہٰذا آج ہم کو یہ حق نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں جو باتیں ہوئی ہیں اس پر ان پر طعن کرے۔

باپ کو چاہئے کہ بیٹے کے حق میں جو بات مناسب ہو وہ بتلاتا رہے

تو میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تدبیر بتائی، اس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ باپ کو چاہئے کہ بیٹے کے حق میں جو بات مناسب ہو وہ اسے بتاتا رہے، دیکھو! یہاں باپ نے یہ مناسب سمجھا کہ بیٹا اپنا راز اپنے بھائیوں پر ظاہر نہ کرے تو اس سے انہیں آگاہ کیا، تو اس آیت سے یہ نکلا کہ جو چیزیں بچے کے حق میں مناسب ہو باپ کا دینی فریضہ ہے کہ بچوں کو سنائیں

اسے بتائیں، کہے کہ فلاں سے ملنا ٹھیک نہیں، فلاں کی صحبت ٹھیک نہیں، فلاں جگہ بیٹھنا ٹھیک نہیں، فلاں سے معاملہ کرنا ٹھیک نہیں۔

آج والدِ بزرگوار کیلئے دل سے دعا نکلتی ہے

ہم کو خوب یاد ہے ہمارے والد بزرگوار جب ہم گھر سے باہر نکلتے تھے اور آنگن میں کھیلتے تب تو جان بخشی ہوتی، اور اگر آنگن سے باہر چلے گئے تو وہ زور سے پکارتے تھے اس وقت ہم لوگوں بڑا غصہ آتا تھا کہ یہ بڑے میاں مر جائیں تو اچھا ہو، کیونکہ ہم تو چھوٹے تھے، سمجھ ہی کیا تھی اس وقت، لیکن آج ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، اور ان کی قبر میں ان کی روح کو آج ہماری طرف سے خوشی ہوتی ہوگی، تو وہ یہ کہتے تھے کہ گھر سے باہر کے ماحول کی کوئی گارنٹی نہیں کہ بچہ گالی سیکھ کر آئے، بے ادبی سیکھکر آئے، کوئی بری عادت سیکھ کر آئے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فَرَّمِن المطر وقام تحت المیزاب

اور اب تو ایسا دور آ چکا ہے کہ آدمی گھر کے باہر کے ماحول کا کیا رونا روئیں، اب تو باہر بھی رونا اور اندر بھی رونا، اندر باہر سب فاسد ہو چکا ہے، بتایئے! امان ہے؟ نہیں ہے، گھر کے باہر بھی فساد اور گھر کے اندر بھی فساد، انگلینڈ میں ایک صاحب کہنے لگے کہ مولانا صاحب! یہ ٹی وی گھر میں اس لئے رکھا ہے کہ باہر کا ماحول جو ہے وہ اچھا نہیں ہے میں نے کہا سبحان اللہ! واہ واہ! بڑا اچھا علاج تجویز کیا، باہر کا ماحول چونکہ اچھا نہیں ہے اس لئے گھر میں ٹی وی لے آئے یہ تو ایسا ہی ہوا'' فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ، وَقَامَ تَحْتَ الْمِیْزَابِ، هَدَمَ مِصْراً، وَبَنیٰ قَصْراً ''، کہ شہر کو ویران کر کے ایک مکان بنایا، اور پانی سے بھاگا اور پرنالہ کے نیچے ٹھہرا جیسی بات ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں شیطانی چالوں سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائیں

بہرحال، اس آیت میں یہ کہا گیا کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ خیر خواہی کی، اس کے بعد اس خواب کے آثار انشاء اللہ ظاہر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں شیطانی چالوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور نفس کے مکارِہ سے حفاظت فرمائیں، اور قرآنِ کریم کے تقاضوں کو صحیح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

درس نمبر (۹)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم

وکذلک یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمته علیک وعلیٰ آل یعقوب کما اتمها علیٰ ابویک من قبل ابراھیم واسحق ، ان ربک علیم حکیم ☆ لقد کان فی یوسف واخوته اٰیٰت للسائلین(یوسف،آیت:۵/۷)☆ **صدق الله مولانا العظیم**

ان الشیطن للانسان عدو مبین

گذشتہ آیت میں ابلیس کے بارے میں اور شیطان کے باب میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے، اب آگے ایک نئے مضمون کا آغاز ہے، مگر پچھلے مضمون سے متعلق ایک دو بات اور سن لے جو کام کی ہے، قرآنِ کریم میں شیطان کے باب میں ہے ''وزین لھم الشیطناعمالھم'' (نمل،آیت:۲۴) شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ بنی آدم کے سامنے ان کے کاموں کو اوران کے اعمال کو بہت خوبصورت بنا کر اور بہت اچھا بنا کر پیش کرتا ہے، برا عمل ہو تو اس میں اچھائی کا کوئی پہلو نکالتا ہے، معصیت اور خرابی ہو تو اس میں کوئی خوبی بتاتا ہے، یہ ابلیس کا کام ہے، حتی کہ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر وہ نیک باتوں کی طرف متوجہ کرے تو اس میں بھی کوئی کید ہوگا اور کوئی مکّاری ہوگی، بعض دفعہ نفس کا حال بھی یہی ہوتا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ ایک شخص تھے وہ ایک دیوار کے نیچے سور ہے تھے ایک بڑے میاں نے آکران کو جگایا کہ جلدی اٹھو دیوار گرنا چاہتی ہے، وہ گھبرا کر اٹھے

اور تھوڑی دور پہنچے تھے کہ دیوار گری، انہوں نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تم نے میری خیر خواہی اور ہمدردی کی، اس نے کہا تمہیں اس سے کیا بحث ہے دیوار گرنے والی تھی وہ گر گئی اور تمہاری جان بچ گئی، کافی ہے، تو اس نے کہا کہ نہیں آپ کو بتلانا ہوگا کہ آپ کون ہے آپ نے بڑا اکرم فرمایا، بڑا احسان فرمایا عنایت ہے آپ کی شکر گذار ہوں میں آپ کا کہ آپ کی وجہ سے جان بچی، اس نے کہا میں ابلیس ہوں، کہا کہ ہیں! ابلیس ہو تم، بنی آدم کے کھلے دشمن، بنی آدم کے ایمان کے دشمن، بنی آدم کے جان و مال کے دشمن، تم کو یہ خیر خواہی اور ہمدردی کب سے سوجھی، اور کب سے تمہاری زندگی میں تبدیلی پیدا ہوگئی کہ تم اتنی ہمدردی کرنے لگے، اس نے کہا کہ بس ایسے ہی خیال آگیا، اس نے کہا کہ نہیں، نہیں، کوئی بات ہوگی تمہیں وہ بات ضرور بتلانی ہوگی، ابلیس نے کہا کہ اصل میں آپ کے جو پیغمبر ہے انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی ہیں کہ صاحبِ ھدم یعنی کوئی آدمی کہیں لیٹا ہو یا بیٹھا ہوا اور اوپر سے چھت گر پڑے، دیوار گر جائے، پتھر گر جائے کوئی چیز گر پڑے اور وہ ختم ہو جائے تو ایسا شخص شہید ہے، (فتاوی اشرفیہ ج ۲ ص ۲۶) اور شہیدوں کو اللہ میاں کے یہاں بہت بڑا رتبہ اور درجہ ملے گا تو دیوار گرنے کی تیاری میں تھی میں نے سوچا کہ مفت میں آپ کو شہادت ملے، اور آپ ہیں میرے دشمن، تو میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ شہادت سے آپ بہرہ ور ہو، اور شہادت آپ کو نصیب ہو، اس لئے میں نے آپ کو جگا دیا ہے، تو اب آپ دیکھئے کہ ابلیس اور شیطان نے خیر خواہی کی صورۃً، اور نیت تھی بدخواہی کی، اور اس اعتبار سے بدخواہی کہ آخرت کے اعتبار سے وہ شہید ہوتے، احکام میں چاہے شہیدِ دنیوی نہ سہی، مگر شہیدِ اخروی تھے، ان کو درجات ملنے والے تھے، ابلیس نے جو خیر خواہی کی اس کا عنوان اور ہیڈنگ تو بہت اچھا تھا اور اس کی پشت پر اور اس کے نتیجہ میں بنی آدم کا ضرر ہے، یا مثلاً ایک بزرگ تھے اپنے مکان میں

سورہے تھے ان کو جگایا بعضوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کی جانب اس کی نسبت کی ہے، بہر حال، ایک بزرگ تھے ان کے پاس پہنچا اور ان کو نماز کیلئے جگایا، انہوں نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا کہ اس کمرے میں تشریف آوری کیسے ہوئی اندر سے تو کڑی لگی ہوئی ہے۔اور کڑی کھلی نہیں آپ کیسے تشریف لائے؟ اور کون ہے آپ؟ اور ایسی ہمدردی فرما رہے ہیں، اس نے پہلوتہی کی اور اسنے یہ چاہا کہ اپنی حقیقت کو اور آنے کی وجہ کو بیان نہ کرے، مگر اس بزرگ نے اصرار کیا اور کہا کہ جب تک بیان نہیں کروگے میں تم کو چھوڑوں گا نہیں، اس نے کہا میں ابلیس ہوں دشمنِ خدا اور دشمنِ مؤمنین، کہا اچھا! تم ابلیس ہو، تو ابلیس کا نماز سے کیا جوڑ کہ نماز کیلئے تم نے جگایا، اس پر اس نے کہا کہ دراصل بات یہ ہوئی کہ ایکمرتبہ آپ کی نماز فوت ہو چکی تھی اس پر آپ بہت رنجیدہ ہوئے، بہت غمگین ہوئے، آنسو بہت بہائے آپ نے، آپ کو بے پناہ صدمہ ہوا، بہت دلگیر اور دل گرفتہ ہوئے، اللہ تعالیٰ کو آپ کا یہ غم بہت پسند آیا، تو فرشتوں کو یہ حکم دیا کہ نماز کا جواجر ہے وہ ملے اور مزید عطا فرمائیں، اور زیادہ ثواب دیا جائے، تو وہ ملائکہ کا یہ اجر لکھنا کسی طرح مجھ پر منکشف ہوگیا، تو میں نے نہیں چاہا کہ نماز قضا کروا کر آپ کی خیر خواہی اور آپ کی ہمدردی کروں، میں نے چاہا کہ نماز پر جتنا ثواب ملتا ہے اتنا ہی ملے اس سے زیادہ نہ ملے، ورنہ پھر روئیں گے دھوئیں گے اور بہت صدمہ کریں گے تو اجر زیادہ ملے گا، (خطباتِ حکیم الاسلام، ج ۳، ص ۴۴۰، شیاطین سے حفاظت ص ۱۰۰) تو واقعتاً وہ خیر خواہی کا عنوان اختیار کرتا ہے مگر اس کے نیچے اور اس کی پشت پر بدخواہی ہوتی ہے، اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا نبیٔ کریم ﷺ نے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ابلیس یہاں (حضرت نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کرکے حاضرین کو بتلایا) ٹھونگے مارتا ہے اس طرح سے جس کو گجراتی میں گدے (کچوکے) مارنا بولتے ہیں، (شیاطین سے حفاظت ص ۱۴ بحوالہ بخاری و مسلم)

البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں ہے کہ وہ اس سے محفوظ رہیں، اور ویسے حضرت نبیٔ کریم ﷺ کے باب میں بھی یہی امید ہے کہ آپ محفوظ رہے ہیں، چونکہ آپ ﷺ سے ابلیس کے باب میں پوچھا گیا اس سے پہلے آپ یہ سن لے حدیث شریف میں ہے کہ انسانوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اس کو شر کی طرف لے چلتا ہے، تو نبیٔ کریم ﷺ سے صحابۂ کرام نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ! آپ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا ہاں! ولکنہ اسلم، لیکن وہ مسلمان ہو گیا ہے یا "وَلٰکِنَّنِیْ اُسْلَمُ"، کہ میں اس سے محفوظ رکھا جاتا ہوں، (مسند دارمی، کتاب الرقاق) دو قرأتیں ہیں اس حدیث شریف کی، تو خیر، حدیث شریف میں ہے کہ یہاں وہ ٹھونگیں لگاتا ہے اور وہ اس طرح درحقیقت پورے انسانی بدن میں اپنے اثرات کو پھیلانا اور پہنچانا چاہتا ہے، اس کی ایسی مثال ہے جیسے یہاں (ہاتھ) میں انجکشن دیدیا جائے تو ساری باڈی میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے، تو وہ گویا اپنے اثرات ڈالنا چاہتا ہے، اور حدیث شریف میں فرمایا آپ ﷺ نے کہ "ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم" (تلبیس ابلیس ص ۴۳) خون کے دوڑنے کی جگہوں میں شیطان دوڑتا ہے اور دور کرتا ہے یعنی اس کو تصرف کی اتنی قوت دی گئی ہے تا کہ وہ زور لگائے اور کسی طریقہ سے انسان کو بہکائے اور بنی آدم کی آزمائش ثابت ہو، اور حدیث شریف میں یہ بھی ارشاد فرمایا نبیٔ کریم ﷺ نے کہ قلب کی داہنی جانب ایک فرشتہ ہے جو نیک باتوں کی تلقین کرتا رہتا ہے، اور بائیں جانب شیطان ہے، تو خیر کی طرف فرشتہ بلاتا ہے، اور شر کی طرف شیطان بلاتا ہے، (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۵ ص ۱۳۵) اور باہر بھی دونوں قسم کے لوگ ہیں اچھائی کی طرف بلانے والے اور برائی کی طرف بلانے والے، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ ابلیس کو ایک قسم کا تصرف دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بنی آدم کو ورغلاتا ہے اور بنی آدم کو بہکاتا ہے۔

ابلیس کے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے بھاگنے کی وجہ

یہاں ایک بات سن لے وہ بڑی عجیب ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں موجود ہے کہ وہ جس گلی سے گذرتے ہیں ابلیس اس گلی سے نہیں گذرتا، (مسلم شریف ج۲ص۲۷۶) یہ بات حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں نہیں فرمائی گئی، حالانکہ رتبہ اور درجہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کا بڑا ہے، اور اسی طریقہ سے حدیث شریف میں یہ بھی ہے کہ جب اذان دی جاتی ہے تو شیطان بھاگتا ہے اور تقریباً روحہ مقام تک جو مدینہ سے چھتیس (۳۶) میل دور ہے اتنی دور تک وہ بھاگتا ہے اور اس کے بعد پھر لوٹ آتا ہے، (مشکوۃ شریف ص۶۶ بحوالہ بخاری شریف) کب؟ جب نماز شروع ہوجاتی ہے نمازی کو بہکاتا ہے اور کہتا ہے کہ اُذکر کذا ،اذکر کذا ،فلاں فلاں شئ یاد کرو، تو ہر بھولی بِسری چیز کو یاد دلاتا ہے اور بہت سی چیزیں یاد آ بھی جاتی ہے، اسی لئے مثل مشہور ہے کہ جو بات یاد نہ آتی ہو یا تو بیت الخلاء میں یاد آئے گی، یا نماز میں یاد آئے گی، تو بیت الخلاء میں گندی جگہ ہونے کی وجہ سے شیطان سے مناسبت ہے، اور یہ اعلیٰ حالت ہے تو اس سے بہکانے کی وجہ سے، تو شیطان کی سعی اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ نماز سے نمازی کا دھیان ہٹانا چاہتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا درجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ سے بڑھ کر ہے؟ اور یہ موٹی سی بات ہے کہ ان سے بڑھ کر نہیں ہے، اسی طرح اذان کا درجہ نماز سے بڑھ کر نہیں ہے، (اسلام کا نظام مساجد ص۹۰) پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے بھاگتا ہے حضرت ابوبکرؓ سے نہیں، اور اذان سے بھاگتا ہے نماز سے نہیں، بلکہ نماز جب شروع ہوتی ہے تو اس وقت جو ہے وہ آکر بہکاتا ہے، اس کا جواب بعض کتبِ تفاسیر میں عرصہ پہلے میری نظر سے

گذرا تھا، حاصل اس جواب کا یہی ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی شہر میں کچھ گنڈے رہتے ہو، اوباش، بدمعاش دادا قسم کے لوگ جن کا کام ڈکیٹی، چوری، اٹھا پھٹک، مار پیٹ، اور غلط قسم کے کام انجام دینا ہے اور اسی میں ان کی زندگی صرف ہوتی ہے، تو ایسے گنڈے اور ایسے اوباش بادشاہِ وقت سے اور وزیرِ اعظم سے اتنے نہیں ڈرتے جتنے اپنے ضلعہ کے فوجدار سے یا اپنے یہاں کے پولیس افسر سے وہ ڈرتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ڈنڈا ہم پر برسے گا کیوں کہ وہ اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، تو فوجدار سے ڈرنا یا پولیس افسر سے ان کا ڈرتے رہنا یا، ڈی، ایس، پی، سے ان کا ڈرتے رہنا اور بادشاہ یا وزیر سے ان کا خائف نہ ہونا، یہ اس کا پتہ نہیں دیتا کہ بادشاہ اور وزیرِ اعظم کا رتبہ ان سے بڑھ کر نہ ہو، درجہ اور جلالتِ شان تو ان ہی کی بڑھ کر ہیں، مگر چونکہ ان کا معاملہ ان سے پڑتا ہے یا شاید انہوں نے ان کو بھگت لیا ہے، دیکھا ہے، اس وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں، (اسلام کا نظام مساجد ص۹۰) تو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے باب میں کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کی تین دفعہ ابلیس سے کشتی ہوئی اور تینوں مرتبہ ابلیس کو پچھاڑا اور پچھاڑنے کے بعد کندھے پکڑ کر ہلایا اسے اور کہا کہ اسی طر یقہ سے جن اور ابلیس بودے ہوتے ہیں (المعجم الکبیر ۳۸۱/۹، مجمع الزوائد ۷۱/۹) گویا اس کی بڑی ذلت وخواری ہوئی، تو یہ گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی خصوصیت قرار دی گئی ہے، باقی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کا مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ بڑھ کر نہ ہو، یا اذان سے نماز کا درجہ بڑھ کر نہ ہو، تو عظمت اور رتبہ تو نماز ہی کا بڑھ کر ہے اذان سے، حتیٰ کہ حنفیہ کے یہاں تو یہ مسئلہ ہے کہ اذان جماعت خانہ میں نہیں دی جائے گی، (مسائلِ اذان ص۵۴) معلوم ہوا کہ عبادت ہے اور عبادتِ غیر مقصودہ کی کیفیت ہے، اور نماز جو ہے وہ عبادتِ مقصودہ ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے نمازیں

تو پڑھائی ہیں، مگر اذان دینا اس میں گفتگو ہے، خود نبی کریم ﷺ نے اذان دی ہے یا نہیں اس میں بحث ہے، صرف ایک روایت ایسی آتی ہے صحاحِ ستہ میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اذان دی، اور اس میں بھی بعض محدثین نے توجیہ کی ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اُمــــر الاذان، آپ ﷺ نے اذان کا امر فرمایا ہے (اسلام کا نظام مساجد ص ۹۵ بحوالہ شرح سفر السعادت ۴۰۴) تو معلوم ہوا کہ نماز کا رتبہ اذان سے بڑھ کر اور اذان سے اعلیٰ ہے، اور صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فائق ہے، اس لئے وہ ساری چیزیں اپنی جگہ برتر ہیں، البتہ ایک جہتِ خاص کے اعتبار سے ان چیزوں کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہیں۔

ابلیس کی اذان کی آواز سن کر بھاگنے کی وجہ

حدیث شریف میں ہے کہ ابلیس جب اللہ اکبر کی آواز سنتا ہے تو وہ بھاگتا ہے اور بھاگتا بھی کیسے ہے ریح خارج کرتے ہوئے، ہوا چھوڑتے ہوئے، اور اس کے بھی گویا دو منشاء ہیں، ایک وجہ تو یہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت سے اس کی ریح خارج ہو جاتی ہے اس کی ہوا نکل جاتی ہے، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ اتنا بدنیت اور اتنا خبیث طینت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ زور سے ریح خارج کی جائے تا کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کی آواز سننے میں نہ آئے، (ترجمان الحدیث ص ۲۵ بحوالہ مسلم) جیسے آپ نے دیکھا ہوگا ہندوستان میں کہ لوگ سنیما دیکھ کر آتے ہیں اور گلیوں سے گذرتے ہیں اور ان کو جب ڈر لگتا ہے تو وہ کچھ گنگناتے ہوئے اور کچھ پڑھتے ہوئے چلتے ہیں، چونکہ پڑھنے میں اور گنگنانے میں خود کا ذہن خود کی آواز کی طرف متوجہ ہے، اور خاموش رہے تو جہاں کہیں کوئی آواز ہوئی تو فوراً ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے، تو یہ ایک فطرت ہوتی ہے

آدمی کی کہ خود کو مشغول کرنا چاہتا ہے، تو وہ ابلیس جو ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی طریقہ سے اللہ تعالی کے نام کی بڑائی نہ سنوں، اور مجھے شہادت دینا نہ پڑے، اس لئے کہ حدیث شریف میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے تو درخت، پتھر، لکڑ، ہر شئی قیامت کے میدان میں اس مؤذن کے حق میں گواہ بنیں گی اور گواہی دے گی کہ اس نے آپ کی عظمت کا آوازہ بلند کیا تھا، اور آپ کی وحدانیت کی شہادت دی تھی، تو نبیٔ کریم ﷺ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شئی گواہی دے گی، (مشکوۃ ج ا ص ۶۴) ممکن ہے وہ گواہی سے بچنے کیلئے ایسا کرتا ہو، یا ممکن ہے عظمتِ الٰہی کے تاثر کی وجہ سے ایسا کرتا ہو، اور بہت ممکن ہے کہ وہ کان اس آواز کو سننے ہی نہ پائے یہ سارے احتمالات ہیں، اور محدثین نے اس کی طرف کتبِ حدیث میں تشریح کرتے ہوئے اشارات کئے ہیں، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ ابلیس انسان کو بہکانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

اجنبی مرد و عورت تنہائی میں جمع نہ ہو

اسی لئے کتابوں میں ابلیس کا قول لکھا ہے کہ جب بھی کہیں تنہائی میں کوئی مرد اور عورت جمع ہوتے ہیں تو ابلیس یہ کہتا ہے کہ میں تیسرا ہوتا ہوں، (مشکوۃ شریف ص ۲۶۹) اسی لئے حدیث شریف میں نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اجنبی مرد اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں جمع نہ ہوں، (شیاطین سے حفاظت ص ۱۱۶) بلکہ آپ کو تعجب ہوگا، ''اغاثۃ اللحفان''، میں حافظ شمس الدین ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب ایسی شکل ہوتی ہے کہ ایک اجنبی مرد اور ایک اجنبی عورت تنہائی میں جمع ہو تو شیطان اُدھر بھی وسوسہ پیدا کرتا ہے اور اِدھر بھی وسوسہ پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ شیطان کی ذریت میں بعض یہ کام بھی انجام دیتے ہیں کہ مرد کے عضوِ مخصوص اور شرمگاہ میں پھونک مارتے ہیں تا کہ اس میں

ایک قسم کی گُدگُدی پیدا ہوا اور شہوت ابھرے اور کسی طریقہ سے وہ زنا میں مبتلا ہو جائے، تو اس کی طرف سے ہر ممکن کوشش ہوتی ہے معصیت میں مبتلا کرنے کی۔

ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم

یہی وجہ ہے کہ ایک موقعہ پر نبیٔ کریم ﷺ معتکف تھے اور آپ کی زوجۂ محترمہ آپ ﷺ سے ملنے کی غرض سے تشریف لائی تھیں، ظاہر ہے اعتکاف کی حالت میں صحبت اور اس کے مقدمات نہیں کیئے جائیں گے، یہ ملنا وہ تھا کہ کسی ضرورت سے آئی تھیں، جب وہ جانے لگیں تو حضور ﷺ دروازے پر تھے اور وہ بھی اندر تھیں، اتنے میں وہاں سے دو شخصوں کا گذر ہوا انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ ایک عورت سے گفتگو میں مشغول ہیں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ " علیٰ رِسلِکمآ" ٹھہر جاؤ تم، وہ ٹھہر گئے اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ابھی اپنی فلاں بیوی سے گفتگو کر رہا تھا، انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! بھلا آپ کے بارے میں ہمیں کوئی خیال پیدا ہو سکتا ہے، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا "ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم" (بخاری شریف، تلبیس ابلیس ص۴۳) کہ شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے، اگر تمہارے دل میں میرے باب میں کوئی وسوسہ پیدا ہو جائے کوئی خیال پیدا ہو جائے، تو نبی کے باب میں بدگمانی تو ایمان ہی کو لے ڈوبنے والی ہے اور ختم کر دینے والی ہے، بہر حال، یہ بتلانا تھا کہ شیطان انسان کا دشمن ہے۔

ابنِ جوزی رحمہ اللہ کی ایک بہترین تصنیف

اسی لئے اس موضوع پر حافظ ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ایک محدث ہیں مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "تلبیسِ ابلیس"، یعنی ابلیس کی چال، کہ

ابلیس کے انسان کو راہِ راست سے ہٹانے کے کیا کیا طریقے ہیں، تو انہوں نے اس پر باقاعدہ بحث کی ہیں کہ وہ تاجر کو کیسے بہکاتا ہے، صوفی کو کیسے بہکاتا ہے، ملازم کو کیسے بہکاتا ہے، جوانوں کو کیسے بہکاتا ہے، بوڑھوں کو کیسے بہکاتا ہے، عالم کو کیسے بہکاتا ہے، عبادت گذار کو کیسے بہکاتا ہے، نیکوں کو کس طرح بہکاتا ہے، اور آزاد لوگوں کو بہکانے کی کیا شکلیں ہیں اس کے پاس، اسی طرح سے وہ لیڈروں کو کیسے بہکاتا ہے، ہر ایک کے لئے انہوں نے تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے کہ کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے جو اس کے جال سے اور اس کے پھندے سے بچے۔

شیطان انسانوں کا ازلی دشمن ہے

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل وکرم سے جس کی حفاظت فرمائیں وہی بچ سکتا ہے، آٹھویں پارے میں سورۂ اعراف میں ایک عجیب انداز سے حق تعالیٰ شانہ نے ابلیس کی اطاعت سے روکا ہے، اس مضمون کو سننے سے پہلے آپ ایک تمہید سن لے، ایک آدمی ہو اس سے کوئی شخص یہ کہے کہ تم فلاں آدمی سے تعلق رکھتے ہو، حالانکہ فلاں آدمی وہ ہے کہ جس نے تمہارے والد کو ان کے گھر سے نکلوایا فلاں آدمی وہ ہے کہ جس نے تمہارے والد کے بدن سے کپڑے اتروا لئے، تو جب آدمی کو یہ معلوم ہوگا کہ اچھا! فلاں آدمی نے میرے والد کو اپنے مکان سے نکلوایا اور میرے والد کے بدن سے کپڑے اتروائے وہ اتنا سرکش اور اتنا بدمعاش ہے اور میرے والد کا اتنا بڑا دشمن ہے، تو مجھے بھی اس سے دشمنی رکھنی چاہئے، یا کم از کم تعلق نہ رکھنا چاہئے اتنا تو ہو، یہ ایک فطری اور نفسیاتی چیز ہے، قرآنِ کریم نے آٹھویں پارے میں سورۂ اعراف میں یہی ذکر کیا کہ ابلیس کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس کے پیچھے چلنا یہ تمہارے لئے زیب دہ نہیں ہے،

یہ وہ ہے کہ ''اخرج ابویکما من الجنة ''تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا اور یہی نہیں،'' ینزع عنهما لباسهما '' (اعراف،آیت:۲۷) کہ جب انہوں نے دانہ کھایا تو اس کے نتیجہ میں ان کے بدن سے کپڑے ہٹے ہیں، اور دانہ کھانے کی صورت یہ ہوئی تھی کہ دو دانے تو ماں حوّا نے اپنے لئے رکھے اور ایک دانہ حضرت آدم علیہ السلام کیلئے اسی لئے حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسی کی سزا گویا یہ مقرر ہوئی کہ وراثت میں مرد کو دوہرا حصہ دیا جاتا ہے اور عورت کو اکہرا یہ اسی کی مکافات ہے، ''للذکر مثل حظ الانثیین ''(نساء،آیت:۱۱) تو جب وہ دانہ انہوں نے کھایا ہیں تو جبرئیل امین نے ان کے سر سے تاج اتار لیا، حضرت آدم علیہ السلام ساٹھ ہاتھ لمبے تھے، (بخاری شریف، ترجمان السنۃ) جب ان کے بدن سے کپڑے ہٹ گئے تو انہوں نے اپنے بدن پر پتے ڈال دیئے، اب اس میں بھی تفصیلات ہیں کہ وہ پتے کاہے کے تھے، باقی تفسیر اسکی تفصیلات کے جاننے پر موقوف نہیں ہے، تو پتّے لگائیں اور دوڑے، تو دوڑتے ہوئے درخت کی ایک ٹہنی سے انکے بال اٹک گئے، تو حضرت آدم علیہ السلام نے خفا ہو کر کہا ٹہنی سے کہ اے ٹہنی! میرے سر کو چھوڑ دے، کیونکہ سر حضرت آدم علیہ السلام کا بڑا تھا اور بال بھی کافی بڑے تھے، تو حق تعالیٰ کی طرف سے ندا ہوئی کہ اے آدم کیا تم مجھ سے فرار اختیار کرتے ہو اور مجھ سے بھاگتے ہو، تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ یا اللہ! میں آپ سے فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ آپ سے مجھ کو ایک حیا محسوس ہو رہی ہے، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ کپڑے بھی ہٹے، تاج بھی گیا اور پریشانی سے دوچار ہوئے، اور اس عالم کی تنگنائیوں میں ان کو آنا پڑا، تو قرآنِ کریم نے یہ اسلوب اختیار کیا کہ یہ تو وہ بدمعاش ہے کہ جس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا اور ان کے بدن سے کپڑے تک اتروالئے، اور ظاہر ہے کہ وہ چور اور ڈاکو جو بدن کے کپڑے اتروالے اس

سے بڑا چور اور بدمعاش کون ہوگا، تو اس اچھے اسلوب سے بنی آدم کے دل میں شیطان کی گویا نفرت قائم کرکے اس سے دوری پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے، مگر انسان ہے کہ شیطان سے بہت زیادہ دوستی کیئے ہوئے ہے، تو یہاں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، اور دشمن کی لپیٹ میں جو آ گیا تو جو کچھ انجام ہوگا وہ ظاہر ہے ایسا آدمی پھر مقبول نہیں ہوسکتا، تو یہاں تو گویا تذکرہ یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، اور اس کی پکڑ مقبولیت سے ہٹ کر مردودیت کا باعث ہے۔

مجتبیٰ اور مصطفیٰ میں ایک لطیف فرق ہے

آگے فرماتے ہیں "وکذلک یجتبیک ربک" اس میں ایک خاص مقبولیت کا تذکرہ ہے، فرماتے ہیں اسی طریقہ سے حق تعالیٰ تمہیں مجتبیٰ بنائیں گے اور چن لیں گے "ویعلمک من تاویل الاحادیث" اور سکھلائے گا تمہیں دقیق دقیق باتوں کا علم، یا سکھلائے گا تمہیں باتوں کو ٹھکانے پر بٹھانا، یا سکھلائے گا تمہیں خواب کی تعبیر کا علم، ویتم نعمتہ علیک، ، اور اپنی نعمت تم پر کامل فرمائے گا جس طریقہ سے "کما اتمھا علیک من قبل" ،تم سے پہلے تمہارے دونوں باپ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی ذات کو تو اضعاً ذکر نہیں کیا بلکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام جو دادا ہوتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے ان کا ذکر کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا کہ تم پر نعمت کو کامل فرمائیں گے حق تعالیٰ اسی طریقہ سے جیسا کامل کیا تمہارے آباء پر اور فرمایا کہ بیشک آپ کا رب جانتا ہے کہ وہ علیم ہے اور حکمتوں کا مالک ہے، حق تعالیٰ حکیم ہے، شانِ علیمی سے کمالات سے نوازے گا یعنی شانِ علیمی سے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کون مصداق ہے کس کمال کا، اور شانِ حکیمی سے جانتے ہیں کہ اسکو حکمتوں سے اور کمالات سے کیسے

نوازا جائیں، تو علم وحکمت حق تعالیٰ کی صفت ہے، یہ مجتبیٰ کا لفظ آپ نے تقریروں میں سنا ہوگا، احمدِ مجتبیٰ محمدِ مصطفیٰ، تو مجتبیٰ مصطفیٰ دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، یہ باب افتعال سے آتا ہے اسم مفعول کا صیغہ ہے، تو مجتبیٰ کے معنی ہے منتخب اور مصطفیٰ کے معنی بھی ہے منتخب، مگر دونوں میں ذرا ذرا سا فرق ہے، حدیث شریف میں ہے کہ ''اذا اَحَبَّ اللّٰـهُ عَبدًا اِبتَلَاهُ فَـاِنْ صَبَـرَ اِجتَبٰـی، و اِنْ رَضِـیَ اِصْـطَفٰـی او کـمـا قـال علیـه الصلوة والسـلام، ، (انمول حدیث ص ۳۱۰) اللہ جل شانہ کسی بندہ سے محبت فرماتے ہیں اور کسی بندہ سے خوش ہوتے ہیں تو اس بندے کا امتحان لیتے ہیں اگر وہ امتحان میں صابر رہا تو مجتبیٰ بنا لیتے ہیں اور راضی رہا تو مصطفیٰ بنا لیتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ مجتبیٰ سے مصطفیٰ کا درجہ بڑھ کر ہے، اس کی ایسی مثال ہے جیسے مثلاً آپ اپنے دوست کے سامنے آموں کا ایک ٹوکرا رکھ دیں، اور آموں کا ٹوکرا رکھنے کے بعد یہ کہے کہ اس میں سے کوئی آم آپ منتخب فرمالیں اور پسند فرمالیں، ایک تو یہ ہے، اور ایک صورت یہ ہے کہ آم کا ٹوکرا رکھ کر آپ اس سے یہ کہے کہ ان تمام آموں میں بہتر یہ آم ہے، تو اس کا فرق لطیف یوں بیان کیا گیا ہے کہ مجتبی کی حقیقت یہ ہے کہ ساری ٹوکری میں سب سے ممتاز وہ مجتبی ہے، اور جس کو آپ پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اس کو پسند کرلے یہ مصطفیٰ ہے، تو گویا یوں کہہ لیجئے کہ انسانوں میں انسانوں کی نسبت سے جو ممتاز ہوتا ہے وہ مجتبیٰ سمجھا جاتا ہے، اور خدائی نسبت سے اسی مجتبیٰ کو مصطفیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو گویا اضافی فرق ہے کہ اصطفی کی نسبت حضرت حق کی جانب ہے اور اجتبی کی بھی مگر سمجھنے کے لئے آپ ایسے سمجھ لے کہ گویا اصطفی کا درجہ اجتبی سے کچھ بڑھکر ہے جس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک بندہ وہ ہے جس سے حق تعالیٰ شانہ پندرہ آنہ راضی ہو، اور ایک بندہ وہ ہے جس سے حق تعالیٰ شانہ سولہ آنہ راضی ہو، یا یوں سمجھ لو کہ ایک بندہ وہ ہے جس سے اللہ میاں بالکل سولہ آنہ راضی، اور ایک

بندہ وہ ہے جس سے اللہ میاں ساڑھے سولہ آنہ راضی، تو پہلا مجتبیٰ کہلائے گا، اور دوسرا مصطفیٰ کہلائے گا، بہت ذرا سا لطیف فرق ہے، تو فرمایا، ''وکـــذلک یـــجتبیک ربک،، تو اجتبیٰ کی حقیقت ہے منتخب کرنا، اور لغت کے اعتبار سے چن لینے کے معنی آتے ہے، حق تعالیٰ شانہ کا بندوں کا انتخاب کرنا اور چن لینا اس کی دو قسمیں ہیں، ایک ہے وہ شخص جو اپنی کوششوں سے اور اپنی سعی سے عبادت کرتے ہوئے چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے منتخب فرمالیتے ہیں (خطبات حکیم الاسلام ج۲ص۵۹۳) اور ایک وہ بندہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ادھر بڑھ کر پھر عبادت میں لگ گیا ہے تو ایسا شخص درحقیقت مُنِیْبُ کہلاتا ہے، (خطبات حکیم الاسلام ج۲ص۵۹۳) تو مجتبیٰ کو محبوب بھی کہتے ہیں، اور منیب کو محبّ بھی کہتے ہیں، اس کی بالکل آپ ایسی مثال سمجھ لے کہ جیسے دنیا میں بعض بندے ہوتے ہیں وہ بیچارے ذکر کرتے رہتے ہیں، دعا کرتے رہتے ہیں، نماز پڑھتے رہتے ہیں، نیک کام کرتے رہتے ہیں، کرتے کرتے گویا خدا تعالی کی طرف چل رہے ہیں اور چلتے چلتے چلتے پھر ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت کا فیضان ہوتا ہے اور حق تعالیٰ شانہ انہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، تو پہلے یہ چل رہے تھے یہ سلوک ہے اور پھر حق تعالیٰ نے کھینچ لیا یہ جذب ہے، اپنے طور پر چلنا یہ ایسا ہے جیسے سیڑھی پر چڑھنا، اور ادھر سے کھینچ لئے گئے یہ ایسا ہے جیسے لفٹ سے جانا، تو دونوں میں جو تفاوت ہے وہی فرق ہے درحقیقت سلوک میں اور جذب میں اور وہی فرق ہے درحقیقت انسان کی اپنی کوشس میں اور ادھر سے کھینچ لئے جانے میں، تو اجتبیٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں بندے کے قلب پر غیب سے ایک کشش اور ایک وارد ہوتا ہے اور وہ بندے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور بندہ اس کے نتیجہ میں حق تعالیٰ کی طرف کھنچ جاتا ہے۔

مجذوب کی دو قسمیں ہیں

آپ نے ایک لفظ پڑھا یا سنا ہوگا مجذوب کا، مجذوب کے معنی کھینچا ہوا حق تعالیٰ نے جذب فرمالیا اس کو، مجذوب کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک مجذوبِ محض ہے کہ جس کی عقل ماؤف ہوچکی ہے اوراس کے حواس گم ہےاس لئے کہ اس عالم کی کچھ چیزیں اس پر منکشف ہوتی ہے وہ اسی میں گم ہوجاتا ہے، یہ حیرتِ مذموم کہلاتی ہے، شیخ اگر کامل ہے تو پھر وہ آگے بڑھتا ہے اور ترقی کرتے ہوئے جو حیرت ہوتی ہے وہ حیرتِ محمودہ کہلاتی ہے، تو جذب کی جو شکل ہوتی ہیں اگر جذبِ محض ہے تو اس میں ترقی نہیں، مگر اعمالِ شرعیہ، علم ومعرفت ، دعوت ، دینی کام، بصیرت، تعلیم، شعور، ان ساری چیزوں کے ساتھ وہ چلتا ہے تو یہ جذب مع السلوک کہلاتا ہے، اور ایسے آدمی کو ترقی بہت ہوتی ہے، تو بہت موٹے لفظوں میں اس کو آپ ایسا سمجھ لے کہ ایک ہے السالک المجذوب چلتا رہا پھر اُدھر سے کھینچ لیا گیا، اور ایک ہے المجذوب السالک کہ کھینچ لیا گیا پھر چلنے لگا (مجالس خطیب الامت ص۴۴) السالک المجذوب کی مثال تو ایسی ہے جیسے دنیا میں بہت سے لوگ عبادت کرتے رہتے ہیں اور پھر مقبول ہوجاتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر ایک بادشاہ اپنی کنٹری میں یہ اعلان کردیں کہ مجھے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری بنانے کی غرض سے ایک آدمی چاہئے یہ بادشاہ نے اعلان کیا، اب ہزاروں لوگوں نے درخواست دیں، کوششیں کیں، اور مستقل قسم کی سفارشیں انہوں نے استعمال کیں، مگر بادشاہِ وقت جس کو منتخب کرلیں وہی مقبول سمجھا جائے گا، چاہنے والے چاہیں ہزاروں پیدا ہوجائیں، یہ ایک مسلّم حقیقت ہے، تو حق تعالیٰ کی طرف سے ندا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ عامّہ ہے مگر وہ مقبولیتِ خاصّہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے

نصیب ہوتی ہے تو وہ حسبِ استعداد ہی ملتی ہے، وہ سب کو نہیں ملا کرتی، جیسے مثلاً نبوت ہے وہ سب کو نصیب نہیں ہوتی وہ استعداد سب میں نہیں ہوتی ہے، یا ولایتِ خاصہّ بھی ہر آدمی کو نصیب نہیں ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان تو ہوتا ہے یا یہ کہ چلنے کیلئے اذنِ عام ہوتا ہے مگر وہ جسے قبول فرمالے شاہی باز جس کی جھونپڑی پہ جا کر بیٹھ جائے وہی گویا نصیبِ ور سمجھی جاتی ہے کہ نظرِ انتخاب اس پر پڑ گئی، اسی لئے عارفِ رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ؂

دادِ اورا قابلیت شرط نیست

بلکہ شرطِ قابلیت دادِ او ست

کہ اللہ تعالیٰ کی دین کیلئے قابلیت شرط نہیں ہے، بلکہ قابلیت کی شرط ان کا دینا ہے کہ وہ دیدیں تو آدمی قابل بن جائے اور وہ نہ دیں تو آدمی میں کوئی قابلیت نہیں ہے، اس لئے کہ استعداد بھی حق تعالیٰ ہی عطا فرماتے ہیں، تو ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان نے چلنا شروع کیا اور چلتے چلتے ادھر سے کھینچ لیا گیا یعنی مقبول ہو گیا، جیسے نمازیں سب پڑھتے ہیں، تلاوت، دعا، درود سب کرتے ہیں، مگر عند اللہ مقبول کس کا کام ہے یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا، تو ایک صورت تو یہ ہے۔

وہ برّی حکومت تھی، یہ بحری حکومت ہے

اور دوسری صورت ہے جیسے آپ نے سنا ہوگا حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کا واقعہ کہ یہ بادشاہ تھے اور یہ جی میں تھا کہ خالص دل سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا اور تھے بادشاہ ایک روز انہوں نے دیکھا کہ رات کا وقت ہے او کوٹھے پر کسی کے چلنے کی آواز آئی، پوچھا کون؟ تو کہا میں ایک آدمی ہوں، کہا، یہاں کیسے آئے؟ اس نے کہا

میرا اونٹ گم ہوگیا ہے، وہ غیبی تنبیہ تھی ،فرشتہ تھا، یا کوئی رجالِ غیب تھا تو بادشاہ نے کہا کہ یہ کیسی حماقت ہے کہ بادشاہ کے محل پراور وہ بھی رات کے وقت اونٹ تلاش کیا جاسکتا ہے؟ ہوگا کسی گلی میں کسی جگہ پڑا ہوا، جب یہ بات کہی تو اس نے کہا کہ جس طریقہ سے بادشاہ کے محل پر اونٹ کا تلاش کرنا رات کے وقت دشوار ہے، ایسے ہی دنیا کی محبتوں کے ساتھ خدا تعالی کا ذکر اور خدا تعالی کی یاد اور دنیا کے جھمیلوں کے ساتھ اسکے یہاں مقبولیت دشوار ہے، پہلے قلب کو اس سے صاف کرنا ہوگا ،بس یہ جملہ سننا تھا کہ قلب میں ایک آگ لگی ، ایک شوزش پیدا ہوئی دل میں اور سب چھوڑ چھاڑ کر تنہائی میں جنگل میں عبادت میں مشغول ہو گئے ، (تذکرۂ مشائخ چشت ص ۱۳۸) لوگ ان کی تلاش میں نکلے اور نکلنے کے بعد ان کو لا کر بادشاہت کیلئے بٹھانا چاہا منّت سماجت کی ، بہت خوشامد درامت کی ،تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالی نے مجھے اس سے اچھی حکومت عطا فرمائی ہے، لوگوں نے کہا وہ کیا؟ تو کتابوں میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک سوئی لی جس سے وہ اپنا کپڑا سیتے تھے وہ سمندر میں ڈالی اور ڈالنے کے بعد سمندر کے کنارے کھڑے ہوکر یہ ندا دی کہ میری سوئی جو ہے واپس لے آ ؤ، بہت ساری مچھلیاں سونے کی اور چاندی کی سوئی لے لے کے برآمد ہوئی، تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی مجھے ضرورت نہیں، میں نے جو سوئی اندر ڈالی ہے وہی برآمد ہونی چاہئے ، یہ ان کی کرامت تھی چنانچہ ہوا یہ کہ ایک مچھلی اسی سوئی کو لیکر برآمد ہوئی، تو آپ نے اس کے منہ سے وہ سوئی لی اور لوگوں سے کہا کہ بتاؤ وہ حکومت اچھی ہے؟ یا یہ اچھی ہے؟ کہ وہ برّی حکومت تھی ، یہ بحری حکومت ہے، اور اس میں خلاف ورزی بالکل نہیں ہے، (حوالا بالا ص ۱۳۹) تو ابتداء میں جذب کی کیفیت ان پر ہوئی۔

سلوک کی حقیقت کو پہلے سمجھنے کی ضرورت ہے

یہ ایسا ہی ہوا جیسے ایک مجذوبہ تھی اس سے لوگوں نے کہا کہ بارش نہیں ہوتی، آپ دعا کیجئے، اس نے یہ کیا کہ اپنے سر کے بال کھولے اور بالوں سے جھاڑو دی اور جھاڑو دینے کے بعد آسمان کی طرف نظر کی اور کہا کہ پروردگار! جھاڑو میں نے دی ہے چھڑکاؤ آپ فرما دیجئے، اتنا کہنا تھا کہ بارش برسنا شروع ہوئی اور سارا جل تھل ہو گیا اور عجیب وغریب کیفیت ہو گئی، تو یہ جو واقعات ہیں یہ درحقیقت ابتداء میں جذب ہے، اور پھر انہوں نے عبادت میں سعی کرنا شروع کی ہے تو کھینچ لئے گئے یہ محبوب ہے اور بعد میں جا کر پھر وہیں سے جو ہے مراد، اسی لئے ایک مسئلہ سنتے چلے، حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ایک مرید تھے انہوں نے اپنے شیخ سے کہا کہ حضرت اللہ میاں کی تجلی دیکھنے کو جی چاہتا ہے، فرمایا کہ اگر ایسا ہی جی چاہتا ہے تو پھر عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو جاؤ، انہوں نے کہا اچھا یہ عجیب وغریب بات ہے، عشاء پڑھے بغیر سو جاؤں، یہ ان سے نہیں ہو سکا، اور یہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ جو ہے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے شیخ، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے شیخ، اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے شیخ، شیخ العرب والعجم ہے، تو انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ عشاء پڑھے بغیر سو جاؤ دوسرے روز بھی ان سے یہ کام نہیں ہوا، تیسرے روز بھی شیخ نے یہی کہا کہ عشاء پڑھے بغیر سو جاؤ، بہت ہمت کی تو عشاء کی سنت چھوڑی اور عشاء کی سنت چھوڑ کر سوئے ہیں تو خواب میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا حضور ﷺ نے فرمایا کہ بھائی ہم نے کیا بگاڑا جو ہماری سنت چھوڑ دی، تو شیخ کے پاس آئے صبح میں اور آ کر کہا کہ حضرت! ایسا ایسا ہوا تو کہا میں کہتا تھا کہ فرض چھوڑ دوں، تم نے سنت چھوڑی تو حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اگر فرض چھوڑتے تو تمہیں اللہ میاں کی

بھی زیارت ہو جاتی (خطبات حکیم الاسلام ج ۲ ص ۵۹۳/۵۹۴) اچھا! اب آپ اس کا مطلب سمجھ لے کہ کیا مطلب ہے اس کا، اس کا مطلب یہ ہے اصل میں کہ وہ عبادت کرتے کرتے اتنے مقبول بن چکے تھے کہ اگر وہ فرض چھوڑتے بھی تو تجلی ہوتی اور انہیں کہا جاتا کہ اٹھو اور پڑھو فرض یہ مطلب ہے، تو اس درجہ ان کی مقبولیت تھی، یہ نہیں ہے کہ فرض چھوڑنا خدا تعالی کے دیدار کا باعث ہے، تو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے جیسے یار لوگوں نے مطلب لے رکھا ہے کہ کچھ کرومت اور واصل باللہ ہو جاؤ، کھانا خوب پیٹ بھر کر یہاں کھاؤ، اور نماز پڑھو مکہ شریف میں، یا مدینہ شریف میں، تصوف کی جو گت بنائی ہے یا اس کی ٹانگ توڑی ہے یار لوگوں نے وہ سب پیٹ بھرنے کے دھندے ہیں، سلوک کی حقیقت ہی لوگ نہیں سمجھیں اور اس کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں صرف منشاء یہی تھا کہ وہ اس درجہ کے تھے کہ اگر واقعۃً نماز چھوڑتے بھی تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو متنبہ کیا جاتا۔

نوٹ۔ یہ بیان یہیں تک سی، ڈی میں محفوظ تھا آگے کا حصہ باوجود کوشش کے نہ مل سکا۔

درس نمبر (۱۰)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم

وکذلک یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمته علیک وعلیٰ آل یعقوب کما اتمها علیٰ ابویک من قبل ابراهیم واسحق ، ان ربک علیم حکیم(یوسف،آیت:٦)☆ **صدق الله العظیم۔**

نبوت اور ولایت کا فرق

بزرگانِ محترم! گذشتہ کل یہ بات چل رہی تھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تمہیں منتخب فرمائیں گے، اور ظاہر ہے کہ یہ انتخاب اور چننا حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں نبوت کی شکل میں ظاہر ہوا، ولی جو ہوتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقبول اور منتخب بندہ ہوتا ہے، اور نبی بھی اللہ تعالیٰ کا منتخب اور مقبول بندہ ہوتا ہے، مگر دونوں میں فرق ہے، ولایت کی حیثیت ایسی ہے جیسے ڈگری ہو، اور نبوت کی حیثیت ایسی ہے جیسے منصب، (امداد الباری شرح بخاری ج۲ ص۴۳۳) بادشاہ کی طرف سے دیا جانے والا مقام، پوسٹ، تو ڈگری ایک ایسی چیز ہے کہ جو شخص سعی کرے محنت کرے کوشش کرے وہ حاصل کرسکتا ہے، تو ولایت محنتوں سے کوششوں سے جدوجہد سے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ عطا فرمادیتے ہیں، اور نبوت کا تعلق انسانی محنت اور کوشش سے نہیں ہے، اس کا تعلق ہے فضلِ خداوندی سے' **الله اعلم حیث یجعل رسالته،** (انعام،آیت:۱۲۴) اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ اپنی رسالت

کو اور اپنی نبوت کو اور اپنے پیغام کو کہاں رکھے اور کس سے یہ کام لے، تو ولایت ایسی ہے جیسے ڈگری، اور نبوت ایسی ہے جیسے اُدھر کی دی ہوئی پوسٹ اُدھر کا دیا ہوا منصب اور مقام، اور وہ انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے، جس سے واضح ہے کہ نبوت آدمی کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے، ولایت بھی اختیاری ہے تو اسباب کے اعتبار سے، ذریعہ کے اعتبار سے کہ ذکر کی کثرت ہو، تلاوت ہو اطاعت ہو گناہوں سے بچے، یہ اسباب اختیار کرنے پر اُدھر سے ولایت مرتب ہو جاتی ہے، قبولیت مرتب کر دی جاتی ہے، اس کے ساتھ لگا دی جاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عادتِ شریفہ اور سنتِ شریفہ ہے، ورنہ ولایت بھی اللہ تعالی ہی کی طرف سے ملتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ حق تعالیٰ آپ کو منتخب فرمائیں گے، تو گفتگو بیچ میں یہ آئی تھی کہ ایک ہوتا ہے مجتبیٰ، اجتبیٰ کی ایک شکل یہ ہوتی ہے جس میں آدمی پر جذب ہوتا ہے جاذبہء غیبی جو خدا تعالی کی طرف قلب کو کھینچتا ہے اور طبیعت کا میلان دل کا رجحان اللہ تعالی کی ذاتِ عالی کی طرف ہو جاتا ہے، امت کے افراد میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے، مگر مجذوب کی اور نبیوں کی اطاعت کرنے والے کامل کی مثال آپ ایسے سمجھے کہ جس سے دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا دونوں میں بہت ڈیفرینس ہیں، عام انسانی مزاج یہ ہے کہ جہاں کوئی نئ بات ہو جائے، نادر بات، انوکھی بات، آدمی فطری طور پر ادھر متوجہ ہوتا ہے، تو کوئی بات ایسی ظاہر ہو جائے جس میں کرامت ہے، عادت کے خلاف کوئی قصہ ہو گیا، کوئی نئ بات رونما ہو گئی، تو آدمی کی طبیعت فطری طور پر ادھر چلتی ہے، اور ایسے لوگوں کی طرف رجحان زیادہ ہوتا ہے، حالانکہ فقط مجذوب ہونا کہ جس کے ساتھ اعمال، معرفت، حقیقت، اور اللہ تعالی کی طرف صحیح رخ نہ ہو وہ ناقص درجہ ہے اور احکام کے اتباع کے ساتھ، شریعت کے احکام کو اپنانے کے ساتھ آدمی ترقی کرتا رہے وہ کامل درجہ ہے، اس کی مثال بالکل

ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ ہو اور اس نے شاہی دربار سجایا ہو، اور اس میں سارے افسران سارے حکمران ہو، تمام آفیسر، اور وزراء، وغیرہ سب جمع ہو، اس حالت میں بادشاہ کا ایک چھوٹا سا بچہ کم عمر دو چار سال کا چلا آئے اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے کہ دربارِ شاہی کے کچھ آداب ہیں، اور لوگوں کے درمیان بادشاہ بیٹھے ہیں کہ ان کی ایک دوسری حیثیت بھی ہے باپ ہونے کے علاوہ، مگر اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے وہ تو باپ کی گود میں پہنچ جائے گا اور بن سکے گا تو تاج کھینچے گا، اور جی میں آئے گا تو ڈاڑھی بھی نوچے گا، اگر ڈاڑھی ہوئی، اور اگر اس کی طبیعت چاہی تو کپڑے پر پیشاب بھی کردے تو کوئی بعید نہیں ہے، تو بچے کو باپ کے دربارِ شاہی میں بیٹھنے کی حیثیت سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے، اس کے سامنے یہ مسئلہ ہی نہیں ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ باپ نے دربار سجایا ہے، اور دربار سجا کر سب کے سامنے میرے والد صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اس سے اسکو کوئی بحث نہیں، بس! وہ یہ سمجھتا ہے کہ باپ ہے اور ان کے ساتھ میرا معاملہ ہے تو ایک تو شکل یہ ہے کہ دربارِ شاہی میں بادشاہ کے سامنے کوئی بچہ آئے اور ضد کرے، پیشاب کردے، تاج کھینچ لے، کپڑا کھینچ لے، ڈاڑھی نوچ لے، ضد شروع کردے کہے کہ مجھے کھلونا دلادو، آئس کریم دلاو، پیسے دیدو، وہ جو کہے گا دیدیا جائے گا، اور ایک دوسری صورت ہے وہ یہ ہے کہ بادشاہ کا ایک بڑا لڑکا ہو، اور دربارِ شاہی سجا ہوا ہو، اور اس میں وہ بیٹا موجود ہو، اس کو یہ معلوم ہے کہ یہ میرے باپ ہے میرے والد ہے، مگر وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ دربار سجا ہوا ہے اور باپ کی بادشاہت کی شان کا لحاظ اس کے سامنے ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اسکا ادب مجھے ملحوظ رکھنا ہے، اس کے ادب کا خیال رکھنا ہے، اور وہ اس کا پورا لحاظ کریگا، اور پورا ادب ملحوظ رکھے گا، آپ نے دیکھا کہ باپ کے دو بیٹوں کے دونوں معاملہ میں کتنا ڈفرینس ہے، چھوٹا بچہ جو ہے وہ آکر ضد کرتا ہے اور بڑا بچہ جو ہے

اس کی نوعیت دوسری ہے، اب ظاہر بات ہے کہ درجہ اسی کا بڑا ہے جس نے آدابِ شاہی کا لحاظ کیا، اور رعایت کی، حتّٰی کہ کوئی اہم پوسٹ پر اور کسی جاندار منصب پر بھیجنے کی ضرورت پیش آئے گی تو بادشاہِ وقت اپنے چھوٹے ننھے منھے بچے کو بھیجنے کی بجائے اپنے بڑے بیٹے کو بھیجے گا، یہ ایک موٹی سی حقیقت ہے، جب آپ اس مثال کو سمجھ گئے تو اللہ تعالیٰ کے دبارِ عالی کے اعتبار سے جو فقط مجذوب ہے ان کی مثال ایسی ہے جیسے دربارِ شاہی کے بچے کی، اللہ میاں کے بچے تو نہیں ہیں، دربارِ شاہی کے بچے ہیں وہ، اور وہ ضد کرتے ہیں اللہ میاں ان کی ضد پوری بھی کر دیتے ہیں۔

اللہ میاں سے میری لڑائی ہوگئی ہے

حدیث شریف میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ بعض خستہ حال، پراگندہ بال، پھٹے پرانے کپڑے والے کہ پیغام دیں تو قبول نہ ہو کہیں جائیں تو انہیں بٹھلایا نہ جائے دروازوں سے دھکہ دے کر نکالدیا جائے، مگر انہیں میں بعض ایسے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں خدا رسیدہ ہوتے ہیں کہ اگر کسی بات پر قسم کھالے تو حق تعالیٰ ان کی خاطر سے قسم پوری فرمادیں گے (بخاری شریف حدیث نمبر ۲۷۰۳) تو ایسے بھی ہوتے ہیں، ایک مجذوب تھے ان سے ایک آدمی نے کہا کہ حضرت! دعا فرمائیں کہ میرا فلاں کام ہو جائے کہنے لگے کہ اللہ میاں سے میری لڑائی ہوگئی ہے آجکل میں اللہ میاں سے بالکل خلاف چلتا ہوں اور وہ مجھ سے، اس نے کہا کہ ہیں! کہا ہاں بالکل، نہیں سمجھ میں آتا ہو تو چلو میرے ساتھ، گئے ندی پر اس نے کرتہ اتارا اسے دھویا اور سکھانے کیلئے ڈالا، تو جب تک یہ کام ہوا دھوپ تھی جب کرتہ سکھانے کیلئے ڈالا تو بادل آنا شروع ہو گئے اور بارش برسا، تو اس مجذوب نے کہا کہ دیکھا نا! میں تم سے کہتا تھا کہ اللہ میاں سے آجکل میری کٹّی ہے، (اس کے ساتھ

بنتی نہیں ہے) تو ایک شکل یہ ہوتی ہے۔

شاستری گیا

جھولوانیہ ہندوستان میں ایم، پی، میں ایک بستی ہے وہاں ایک مجذوب تھے، لال بہادر شاستری جب مر گیا تو صبح انڈیا ریڈیو ساڑھے چھ یا سات بجے بولا کہ شاستری جی دنیا سے چلے گئے اور وہ مجذوب اس سے پہلے ہی رات کے چار بجے سے کہنے لگے کہ رام بولو بھئی رام، رام بولو بھئی رام، تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ مجذوب ہے مسلمان ہے پھر رام بولو بھئی رام کا کیا مطلب! تو معلوم ہوا کہ ان پر منکشف ہو چکا تھا کہ شاستری گیا۔

عقیدت کے آگے عقل کام نہیں دیتی

تو عجیب عجیب واقعات ہوتے ہیں ان کے تو لوگ اس قسم کی چیزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں بلکہ عقیدت اگر ہوتی ہے تو عقیدت ایسی چیز ہے کہ وہاں عقل کام نہیں کرتی، ایک مجذوب تھے سٹے کے نمبر والے انکے پاس پہنچتے تھے تو دور سے دیکھکر انکو کشف ہو جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ جاؤ، جاؤ، جاؤ بھاگو یہاں سے، تو اب آپ ذرا دیکھئے عقیدت کس کو کہتے ہیں تو وہ مجذوب جاجاجاجا کتنی دفعہ بولتے تھے اس کو وہ لوگ گنتے تھے کہ مثلاً جاجاجاجاجا پانچ دفعہ کہا ہے تو کہتے تھے کہ پانچ کا آکڑا اس لگادو تو نمبر آجائے گا یہ تو باپوؤں کا راج ہے، حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے یہاں کچھ لوگ آئیں سٹورے سٹّہ کھیلنے والے وہ چاہتے تھے کہ حضرت سے نمبر معلوم کریں، جہاں قدم قدم پہ پکڑ ہوتی ہو، حضرت کو علم ہوا تو فرمایا کہ: نکالو ان لوگوں کو، بس تو خوش خوش چلے گئے کہنے لگے کہ حضرت نے فرمایا کہ نکالو، حالانکہ حضرت یہ کہہ رہے تھے کہ نکالو ان

لوگوں کو یہاں خانقاہ سے اور وہ خوشی خوشی میں اس لئے چلے گئے کہ بس ہمارا مطلب حل ہو گیا حضرت یہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی نمبر نکالو لگ جائے گا (ملفوظاتِ فقیہ الامت ج۲ قسط نمبر۹ ص۲۲،۲۳) تو مارے گھٹنا پھوٹے سر والی بات ہے، خیر، تو میں کہہ رہا تھا کہ مجذوبیت ایک ایسی چیز ہے کہ جہاں پر انسانی عقل کار فرما نہیں ہوتی بعض دفعہ تو لوگ ان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور جو اتباعِ سنت کے ساتھ شریعت کی تعلیم بتاتے ہیں بڑے حضرات جن میں جذب بھی ہوتا ہے تو چونکہ اس میں کچھ کرنا پڑتا ہے کچھ کوشش کرنی پڑتی ہے گناہوں کو چھوڑنا پڑتا ہے تو آدمی اس سے گھبراتا ہے، اور اس کی اہمیت ذہن میں نہیں ہوتی ہے، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو بڑا لڑکا ہے جس کے سامنے آدابِ شاہی کی رعایت ہے، وہ ہیں درحقیقت عارفین، کاملین، واصلین، ربانیین، یہ درحقیقت بڑے حضرات ہیں کہ جن کو اللہ تعالی سے ایک خاص قسم کا اجتبی اور قرب حاصل ہوتا ہے۔

لوگوں نے دو قسم کے دھوکے کھائے ہیں

اسی لئے ایک کام کی بات سن لے کہ لوگوں نے اس معاملے میں دو قسم کے دھوکے کھائے ہیں، بعض تو وہ ہیں جنہوں نے سلوک کا انکار ہی کر دیا حالانکہ قرآن وحدیث کے سوا سلوک کی کوئی حقیقت نہیں ہے، مگر حقیقت ناشناسی کی وجہ سے لوگوں نے انکار کیا۔ اور ایک طبقہ وہ ہیں جنہوں نے لوگوں کو اپنے پیٹ کی وجہ سے دھوکہ دیا، اہلِ اسلام کو جتنا نفع سچے صوفیاء سے ہوا ہے، اتنا ہی نقصان پیٹ پرست پیروں سے بھی ہوا ہے، (مجالس خطیب الامت، ص۴۶) تو صحیح قسم کے لوگوں سے نفع بھی بہت ہوا کہ ملک کے ملک اور علاقہ کے علاقوں نے اسلام قبول کیا ہیں، اور ہزاروں کے ہزاروں اور لاکھوں کے لاکھوں بگڑے بھی ہیں، اس لئے کہ جب حقیقت نہیں بتلائی گئی تو اس کا یہ اثر ہوا، تو

شریعت کی حقیقت کونہیں سمجھنے کی وجہ سے یہ چیز ہوتی ہے، اور اگر کوئی ایسی بات آجائے خلافِ شرع تو خلافِ شرع چیز کبھی قابل اتباع نہیں ہوتی۔

ایک جامع العلوم شخصیت اور ان کا ایک واقعہ

اور اگر کسی بڑے شخص کا واقعہ ہوتا ہے تو وہ صورۃً ہوتا ہے حقیقۃً نہیں، چنانچہ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں، دہلی میں ایک بزرگ گذرے ہیں آپ نے بھی ان کا نام سنا ہوگا ان کا نامِ نامی اسمِ گرامی ہے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ جو شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے صاحبزادے ہیں، آپ بہت بڑے مفتی بھی تھے، محدث بھی تھے، مفسر بھی تھے، قاری تھے، حافظ تھے، اور جو ہے شاعر تھے، ادیب تھے، مؤرخ تھے، غرض یہ کہ عام ان کی معلومات تھیں یعنی جامع العلوم تھے وہ، جس فن میں دیکھئے مہارت حاصل تھی حتی کہ دنیوی چیزوں سے متعلق بھی بے پناہ معلومات تھیں، اور بڑے صاحبِ کرامات تھے، ان کے ایک چھوٹے بھائی تھے جن کا قرآنِ کریم کا ترجمہ ہے، ''موضح القرآن'' حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ شیخ الاسلام پاکستان وہ فرماتے تھے کہ: اردو میں قرآنِ کریم نازل ہوتا تو اسی زبان میں نازل ہوتا، اتنا جامع ترجمہ ہے ''موضح القرآن'' ان کے چھوٹے بھائی تھے شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ ان کی ایک کرامت دہلی میں مشہور تھی کہ وہ اگر پہلی تاریخ کو رمضان المبارک میں تراویح میں اگر ایک پارہ پڑھتے تو تیس (۳۰) روزے پورے ہوتے، اور سوا پارہ پڑھتے تو انتیس (۲۹) روزے ہوتے، (حکایات اولیاء ص ۵۸) یہ ان کی مشہور کرامت تھی، خود شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ ایک آدمی کو بھیجتے کہ جاؤ دیکھ آؤ اکبری مسجد میں بھائی عبد القادر نے آج تراویح میں کے پارہ پڑھا ہے (حکایات اولیاء ص ۵۸) اور اسی اعتبار سے سارے دہلی کے موچی سارے دہلی

کے دھوبی اور دہلی کے دوسرے لوگ عید کی نسبت سے کام لیتے تھے (حکایات اولیاء ص ۵۸) جب ان کا انتقال ہوا ہے تو ان کے بڑے بھائی شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ پر منکشف ہوا کہ اللہ تعالی نے آج مولوی عبد القادر کے اعزاز میں دہلی قبرستان کے سارے مردوں سے چوبیس (۲۴) گھنٹے کیلئے عذاب موقوف کر دیا ہے (خطبات حکیم الاسلام ج ۵ ص ۲۴۴) تو میں عرض کر رہا تھا کہ شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ بڑے باکمال شخص تھے، ان کے پاس دہلی میں ایک طالب علم پڑھتا تھا شاہ صاحب نے اس سے کہا کہ آج دہلی کے چکلے میں ایک نئی لڑکی آمدنی کیلئے لائی جا رہی ہے تو اس طالب علم سے کہا کہ آپ جایئے اور اس کے ساتھ رات گذاریئے، وہ بڑا حیران بڑا پریشان کہ اپنے وقت کا اتنا بڑا بزرگ، اتنے بڑے محدث، اتنے بڑے مانے ہوئے مفسر، منگل کے روز شام میں دہلی کی جامع مسجد میں ان کا بیان ہوتا تھا تو بڑا ہجوم رہتا تھا، نزھۃ الخواطر میں حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے ان کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت کو چودہ امراض ایسے تھے کہ جو مہلک قسم کے تھے پھر بھی ان بیچاروں نے کام کیا ہے اور آج تک ان کے کارنامے موجود ہیں، تو شاہ صاحب نے یہ بات فرمائی، طالب علم کو بڑا تردد ہوا، عصر بعد پھر کہا اس نے کہا بہت اچھی بات ہے مگر وہ نہیں گیا، مغرب بعد پھر کہا مگر وہ اب بھی نہیں گئے، حضرت نے کہا ضرور جائیں، انہوں نے کہا اچھا میں عشاء پڑھ کے جاؤں گا، عشاء پڑھ کے گئے، تنہائی ہوئی اس لڑکی سے، اب وہ لڑکی اور یہ دونوں تنہا اور ظاہر بات ہے کہ نئی لڑکی اگر لائی گئی ہو اور چکلے میں ایک نوجوان لڑکا اور نوجوان لڑکی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اس کے بعد کیا ہوگا وہ سبھی جانتے ہیں، وہ لڑکی رونے لگی اور طالب علم کی طبیعت پر بھی ایک کیفیت تھی، طالب علم نے پوچھا کہ رونے کی کیا وجہ ہے اس نے کہا بس! میری ایک غم کی داستان ہے، لڑکے نے کہا آخر کیا، تو اس نے کہا ایک داستانِ غم ہے آپ

سنیں گے، اس نے کہا بہت شوق سے، لڑکی نے کہا کہ میں دہلی میں جو ندی ہے جمنا اس کے اُس پار رہتی تھی، اور میری شادی ہوئی دہلی میں ایک لڑکے سے، صورتِ حال یہ ہوئی کہ ہماری بارات کشتی میں آرہی تھی تو طوفان آیا ندی میں اور طوفان آنے سے تختہ ٹوٹا اور کشتی جو ہے وہ ڈوبی تو کسی کو تختہ ہاتھ آ گیا اور کوئی کسی کے ہاتھ آ گیا، تو میں ایک تختہ پر سوار ندی کے اس کنارے آئی، تو کمہاروں نے مجھے پکڑ لیا اور آپس میں بات کی کہ یہ جو لڑکی آئی ہے اس کو اپنے قبضہ میں رکھے، اس کی پرورش کریں اور بعد میں اس کو آمدنی یعنی کمانے کا ذریعہ بنائیں گے، تو یہ ہے میری داستان، اور آج تک میں نے کسی کے ساتھ منہ کالا نہیں کیا اور نہ کسی نے میرے ساتھ یہ میری حقیقت ہے، آج انہوں نے مجھے ظاہر کیا ہے اور اس غرض سے مجھے بازار میں لائے ہیں، لڑکے نے پوچھا کہ تیرے شوہر کا نام کیا ہے؟ اس نے نام بتایا تو اس نے کہا کہ خوش ہو جاؤ، مبارک ہو میں ہی تیرا شوہر ہوں، اور اس نے کہا جب ندی میں طوفان آیا تو میں دوسرے تختہ پر پہنچا اور اسکے واسطے سے کنارے پر آیا اور باہر آ کر مجھے خیال ہوا کہ میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس پڑھنے جاؤں، تو میں وہاں پڑھتا رہا اور آج ان پر منکشف ہوا کہ بازار میں ایک لڑکی لائی جارہی ہے اس سے جا کر تم ملو اور اس کے ساتھ رات گذارو، تو میں یہ سمجھتا تھا کہ حضرت زنا کی تلقین کر رہے ہیں، حالانکہ زنا سے بچانا مطلوب تھا، اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کوئی نفس پرست اور پیٹ پرست پیر ایسے واقعات کو لیکر اگر اس کو بنیاد بنائے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے زنا کی تلقین کی تھی تو وہ تلقین زنا سے بچانے کیلئے کی تھی، منہ کالا کرنے کیلئے نہیں کی تھی کہ اس واقعہ کو لیکر تصوف کو بدنام کیا جائے اور سلوک کو بدنام کیا جائے، سمجھ میں آئی بات، تو اس لڑکے نے کہا کہ میری ہی شادی تیرے ساتھ ہوئی تھی اور میرا یہ نام ہے، تو اس لڑکی کی تو عید ہوگئی، تو یہ شیخ کا کشف تھا ان پر یہ بات منکشف

ہوئی تھی، یہ ہے وہ بات جس کو حافظ شیرازیؒ نے کہا ہے کہ ؎

بمے سجادہ رنگین کن　　گرت پیر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم ومنزل ہا

اگر شیخ تمہیں اس بات کی تلقین کرتا ہو کہ تم اپنا مصلیٰ شراب سے رنگ دو تو اس صورت میں تم یہ بھی کر گذرو اس لئے کہ سالک اس راستہ سے بے خبر نہیں ہوتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ وہ شیخ ہو مبتدع نہ ہو، تو کہنے کا منشاء یہی ہے کہ اس کی صرف صورت ایسی ہوتی ہے ورنہ خلافِ شریعت بات کوئی شخص تلقین وتعلیم نہیں کر سکتا، اور خلافِ شریعت بات تلقین کر کے کوئی آدمی خدا تعالیٰ کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا، شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا　　تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

حضور ﷺ کا راستہ چھوڑ کر کوئی شخص منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، اگر کبھی کہیں کسی نے کوئی ایسی بات کہی ہے یا تو مغلوبیت میں کہی ہے، یا عنوان ایسا تھا اور اس کے نیچے شریعت کا حکم تھا، اب بتایئے! شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یہ واقعہ کتنا عبرت انگیز ہے، تو حضرت شاہ صاحبؒ السالک المجذوب تھے، بہت بڑے درجہ کے شخص تھے، تو اجتبیٰ کی ایک شکل یہ ہے کہ ولایت کا مقام مل جائے، اور ایک ہے نبوت، اور اس مقام پر نبوت مراد ہے۔

امام رازیؒ کا ایک دقیق نکتہ

تو حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام سے فرما رہے ہیں کہ

''وکذلک یجتبیک ربک ''اور اسی طریقہ سے منتخب فرمائیں گے آپ کو آپ کے پروردگار، ''ویعلمک من تاویل الاحادیث ''اور سکھلائیں گے تم کو باتوں کو ٹھکانے بٹھانا، دقیق باتوں کا علم، خواب کی تعبیر کا علم، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ علم ملا اور یہی علم تھا جس کے نتیجہ میں اللہ تعالی نے انہیں مصر کے جیل خانہ سے چھٹکارا نصیب فرمایا، امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں ایک مقام پہ لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خواب کی تعبیر کا علم ان کے لئے مصر کے جیل خانہ سے چھٹکارے کا سبب بنا، اسکی شکل یہ ہوئی تھی کہ بادشاہِ وقت نے ایک خواب دیکھا تھا اور اس سے پہلے ایک واقعہ یہ ہوا تھا کہ بادشاہ کے یہاں ایک شراب پلانے والا تھا اور ایک کھانا کھلانے والا، دونوں سے پڑوس کے کسی ملک کے بادشاہ نے کانٹیک کیا، باورچی سے کہا کہ تم زہر ملا ہوا کھانا بادشاہ کو کھلا دو اور ساقی سے کہا کہ تم زہر ملی ہوئی شراب بادشاہ کو پلا دو اور کسی طرح سے بادشاہ کو ختم کر دو، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، بعد میں شراب پلانے والے کو یہ خیال آیا کہ یہ نہیں ہوسکتا یہ تو اپنے محسن کے ساتھ بدسلوکی ہے، خیانت ہے، چنانچہ وہ اس کام سے رک گیا، باورچی نے کھانے میں زہر ملا دیا سی، آئی، ڈی، کے ذریعہ سے بادشاہ کو پتہ چل گیا، بادشاہ نے فوراً دونوں کو طلب کیا اور باورچی سے کہا کہ تم نے جو کھانا میرے لئے پکایا ہے اس میں سے تم کھاؤ، باورچی نے کہا میں نہیں کھاتا کہا اچھی بات ہے وہاں پر کوئی گائے بندھی ہوئی تھی اسکو کھلایا تو وہ فوراً ختم ہوگئی، مرگئی، کہا ان کو تو ابھی قید خانہ میں ڈالدو، بعد میں تفتیش ہوگی، تحقیق ہوگی، پھر ساقی سے کہا کہ تم مجھے جو شراب پلاتے ہو وہ شراب تم پیؤ، اس نے کہا بہت اچھی بات ہے فوراً گٹ گٹ پی گیا اور اسے کچھ بھی نہیں ہوا، لیکن چونکہ شبہ تھا اس لئے اسے بھی قید خانہ میں رکھا گیا تحقیق کے واسطے، یہ واقعہ پیش آیا، تو اس طرح یہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں رہ چکے تھے، اور

ان یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں، چونکہ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے خواب کی تعبیر بتلائی تھی، اور جو خواب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے بیان کیا ایک قول کے اعتبار سے گھڑا ہوا تھا اور دوسرے قول کے اعتبار سے واقعی، اس خواب کی جو تعبیر دی تو باورچی تو خیر ہلاک ہوا (اسکی تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ) اور ساقی بچ گیا اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ بادشاہ سے کیا اب یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیل خانہ میں کیسے گئے اسکی تفصیل بعد میں آئے گی، تو ساقی نے بادشاہ سے کہا کہ جیل خانہ میں ایک شخص ہے جو خواب کی تعبیر کا علم جانتا ہے اس خواب کی تعبیر کو وہی حل کر سکے گا، آپ اجازت دے تو میں جاؤں کہا ٹھیک ہے وہ گیا اور جا کر حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب بیان کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بھی دی اور تدبیر بھی بتلائی، تو بادشاہ نے انہیں جیل سے نکلوایا، تو امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ خواب کی تعبیر کا علم اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے مصر کے جیل خانہ سے نکلنے کا سبب بنا ہے، تو قرآن وحدیث کی صحیح تعبیر اور صحیح تاویل اور صحیح توجیہ کا علم جس کو ہوگا تو وہ انشاء اللہ قیامت میں جہنم کے جیل خانہ سے اسکے لئے چھٹکارے کا سبب بنے گا، دنیا سے جانے کے بعد قبر کے عذاب سے چھٹکارے کا باعث ہوگا اور دنیا میں شکوک وشبہات اور جہالت کے قید خانہ سے نکلنے کا باعث بنے گا، بڑی عجیب بات لکھی امام رازی رحمہ اللہ نے اور ان کا واقعی حق ہے۔

امام رازیؒ کے علمی مقام کی ایک جھلک

امام رازیؒ نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں سے فرمایا کہ میں صرف سورۂ فاتحہ سے دس ہزار مسائل نکال سکتا ہوں، تو امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے اس جملہ کو

میرے ساتھیوں نے چھیک چھاک سمجھا (فضول سمجھا) کہ گویا ایسی ہی بات ہے اس کے بعد جب میں نے بحث شروع کی ہے تو صرفُ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، تعوذ جس کو کہتے ہیں اسی سے جو میں نے بحث کا دروازہ کھولا ہے تو ان پر یہ واضح کر دیا کہ سورۂ فاتحہ تو دور ہے صرف تعوذ سے دس ہزار مسئلے نکل سکتے ہیں، اتنا بڑا مفسر وہ لکھ رہے ہیں۔

ان ربک علیم حکیم

تو خیر، مجھے بتانا یہ ہے کہ یہاں نبوت مراد ہے، فرمایا کہ ''ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمته علیک'' اللہ تعالیٰ تمہیں خواب کی تعبیر کا علم عطا فرمائیں گے اور اپنی نعمت تم پر تمام کریں گے دنیوی اعتبار سے بادشاہت اور معنوی و روحانی اعتبار سے نبوت، ''کما اتمھا علی ابویک'' جسطرح آپ کے باپ دادا پر اس نے نعمت کا اتمام کیا ہے کہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے شدائد سے اور مشکلات سے اور مشقتوں سے نجات دیں اور نبوتوں سے سرفراز فرمایا رسالتوں سے سرفراز فرمایا'' کما اتمھا علی ابویک من قبل ابراھیم واسحق'' جیسا کہ آپ سے پہلے آپ کے باپ دادا ابراہیم واسحاق پر نعمتوں کا اتمام کیا تم پر بھی اسی طرح نعمتیں تمام فرمائیں گے، یہ خواب کی اجمالی تعبیر بتائی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اور فرمایا کہ ''ان ربک حکیم علیم،، بیشک آپ کا رب علیم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں، اللہ تعالیٰ خود علیم ہے اپنی شان علیمی سے جانتے ہیں کہ کس کو کیسا خواب دِکھایا جائے اور کس کو کس مقام پہ پہنچایا جائے، اور شانِ حکیمی سے وہ طریقہ جانتے ہیں کہ کس انداز سے پہنچایا جائے، علم سے مراد صلاحیتوں کا علم ہے اور حکمت کے ذریعہ سے ان صلاحیتوں تک پہنچاتے ہیں میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ یہ اجتبیٰ ہے۔

دو چیزیں ہیں ایک ہے صرف اور ایک ہے جذب

یہاں ایک کام کی بات اور سنتے چلے، دو چیزیں ہیں ایک صَرْف ہے دوسرے جذب ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت فرماتے ہیں تو کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں ابتداءً جیسے کوئی بچہ ہو اور آپ نے پیار میں اسے اٹھالیا، اور کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ وہ چلنا شروع کرتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو آپ اسے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، جیسے آپ نے بچہ کو آگے کھڑا کیا اور کھڑا کرنے کے بعد کہا کہ بیٹا چل، آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ تک پہنچ نہیں سکتا، اس نے ایک قدم بڑھایا دوسرا قدم بڑھایا تیسرا قدم بڑھایا اور قریب ہے کہ گرے تو آپ لپک کر اس کو اٹھا لیتے ہیں تو حق تعالیٰ بندوں کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کی روحانی راہ کو بندے طے کرنے کا ارادا کر کے چلے، نفس کے خلاف قدم اٹھائیں، اللہ میاں جانتے ہیں کہ مجھ تک پہنچنا ان بندوں کے بس کی بات نہیں ہے بس یہ تھوڑا چلا اور خدا کی رحمت اسے اٹھا لیتی ہیں، خدا کی رحمت اسے نظرِ قبول سے دیکھ کر مقبول بنا لیتی ہیں، شرط یہ ہے کہ چلے بس، تو ایک شکل یہ ہے کہ پہلے سے آپ نے اٹھا لیا یہ جذب ہے، اور ایک یہ، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ کسی شئ میں مشغول ہے آپ اس سے ہٹا کر اسکو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، تو کتابوں میں لکھا ہے کہ جو مجتبیٰ اور مقبول بندے ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خاص طور سے دو معاملے ہیں کبھی تو حق تعالیٰ ان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں کہ ان کے قلب میں ایک کیفیت ڈال دیتے ہیں اور کبھی کسی شئ سے ان کی طبیعت لگتی ہے تو اسے ہٹا لیتے ہیں، جس سے ہٹایا گیا اس کو عربی میں صرف کہتے ہیں صرف کے معنی ہے ہٹا دینا، پھرا دینا، حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے جنت سے طبیعت ان کی لگ رہی تھی بس ایک واقعہ پیش آ گیا ایک بات ہونی تھی وہ ہوگئی اور جنت

سے ہٹائے گئے دنیا میں آنے کے بعد بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں طبیعت یہاں نہیں لگتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے لگاؤ تھا مگر ایک قتل کا واقعہ پیش آ گیا کہ ایک قبطی اور اسرائیلی کا آپس میں نزاع ہو رہا تھا یہ چھڑانے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قبطی کو جو ایک مکاّ مارا ہے تو ماشاء اللہ مکا تھا ’فقضی علیه، (قصص، آیت: ۱۵) اس کا کام تمام ہو گیا، کسی طرح فرعونیوں کو خبر ہوئی، تو فرعون کی پارلیمنٹ میں یہ بات ہوئی کہ ان کو پکڑ کر ختم کر دیا جائے ایک مخلص کو اطلاع ہوگئی اس نے آ کر خبر دی کہ ’’وجاء رجل من اقصا المدینة یسعی، قال ان الملا یاتمرون بک لیقتلوک‘‘ تمہارے خلاف شاہی پارلیمنٹ بیٹھ کر قتل کی شازش کر رہی ہیں، ’’فاخرج‘‘ آپ جلدی سے یہاں سے نکل جایئے، ’انک من الناصحین ’فخرج منها خائفا یترقب‘‘ (قصص، آیت: ۲۰/۲۱) آپ جلدی سے گھبرائے ہوئے نکلے اور مدین کے راستے پر جا پڑے اور حضرت شعیب علیہ السلام کے یہاں پہنچے جو ان کے خسر بننے والے تھے، سسرا باجی یعنی دوسرا باجی تو مصر سے طبیعت کو ایک لگاؤ ہو رہا تھا تو یہ واقعہ پیش آیا تکوینی طور پر کہ مصر کو چھوڑنا پڑا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام سے بڑی محبت تھی ایک لمحہ کیلئے پلک جھپکنے کے برابر بھی ان کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کرنا اور ہٹانا نہیں چاہتے تھے مگر ہٹائے گئے، اور ابن کثیرؒ کی ایک روایت ہے کہ چالیس سال کیلئے اور ایک روایت ہے اسّی سال کیلئے ہٹائے گئے تو ہر پیغمبر کو یہ پیش آیا، حتیٰ کہ حضور ﷺ کو مکہ مکرمہ سے محبت تھی اور ہجرت کے موقعہ پہ ارشاد فرمایا مکہ مکرمہ کو مخاطب کر کے کہ اگر میری قوم مجھ کو تجھ سے نہ نکالتی تو میں تجھے نہ چھوڑتا (تاریخ مکة المکرّمة ص ۵۷ بحوالہ ابن ماجہ ص ۲۲۴) اور تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں لکھا ہے کہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت بلالِ حبشیؓ اور حضرتِ ابوبکرؓ کو مکہ یاد آیا تو بعض دفعہ رو پڑیں (اسوۂ صحابہ حصہ اول ص ۴۵ بحوالہ بخاری) تو حضور

ﷺ نے مدینہ منورہ کی محبت کیلئے دعا فرمائی، اب ذرا الفاظ دیکھئے کہ مجھے قوم نہ نکالتی تو نہ چھوڑتا، معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ سے جی لگ رہا تھا تو ہٹائے گئے، یہ صرف ہے۔

مدینہ منورہ پہنچیں تو ساری بیویوں میں سب سے زیادہ محبت ماں عائشہ صدیقہؓ سے تھیں، وہ ایک غزوہ سے لوٹتے ہوئے استنجے گئی وہاں ان کا ہار گم ہو گیا، تلاش میں نکلی تو ہودج چونکہ ماں عائشہ صدیقہؓ کا ہلکا پھلکا بدن تھا وہ سمجھے کے اندر موجود ہیں اونٹ پر رکھدیا گیا اور وہ چلدیئے، آپ وہیں ٹھہری رہیں بعد میں ایک صحابی جو گری پڑی چیزوں کو تلاش کرتے تھے جن کا نام حضرت صفوان بن معطلؓ تھا وہ آئے انہوں نے دیکھا کہ کوئی جثہ معلوم ہوتا ہے قریب آئے تو حضرت عائشہؓ نے پردہ فرمالیا انہوں نے ''انا للہ الخ،، پڑھا اس کے بعد اونٹ بٹھایا اور اس پر حضرت عائشہؓ کو سوار کیا اور یہ دوپہر کے وقت قافلے والوں سے جا ملے، (سیرت عائشہؓ ص۷۶) عبد اللہ بن ابی جو منافق تھا اس نے پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ حضرتِ عائشہؓ نے نامناسب حرکت کی ہے، ظاہر ہے حضور ﷺ کو کیا صدمہ ہوا ہوگا، ایک مہینہ تک حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں میں نیند کا سرمہ نہیں لگایا، بڑی ادیبہ بھی تھیں، تو فرمایا کہ ''ما اکتحلتک'' میں نے نیند کا سرمہ نہیں لگایا یعنی سوئی نہیں ایک مہینہ تک (سیرت عائشہؓ ص۷۷) تو مجھے بتانا یہ ہے کہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد ساری ازواج میں ماں عائشہ صدیقہؓ سے سب سے زیادہ محبت تھیں اور یہ واقعۂ افک پیش آیا اور طبیعت کچھ ہٹی، سمجھ رہے ہیں صرف! حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ صرف ہے، ہر ایک کے ساتھ ایک عجیب انداز سے اللہ تعالی کا معاملہ ہے، پھر قرآن کریم کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برأت میں نازل ہوئی ہیں، تو میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ صرف میں یہ ہوتا ہے کہ طبیعت ہٹا دی جاتی ہے، طبیعت جس چیز سے لگ رہی ہے اس چیز کو وہاں سے ہٹا دیا گیا یا اُن کو وہاں

سے ہٹا دیا گیا، اور جذب میں یہ ہوتا ہے کہ کھینچ لیا جاتا ہے، تو صرف میں ہٹا لیا جاتا ہے، اور جذب میں کھینچ لیا جاتا ہے، تو پیغمبروں پر بھی طبعی طور پر جو چیزیں پیش آتی ہیں اس میں بھی حق تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملات ہوتے ہیں۔

نبوت عدد کے اعتبار سے آپ ﷺ پر پوری ہوگئی ہے

بہرحال بات اس پر تھی کہ ولایت ایسا سمجھو جیسے ڈگری اور نبوت ایسے سمجھو جیسے پوسٹ و منصب ہے (امداد الباری شرح بخاری ج ۲ ص ۴۳۳) وہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے اور اب تو نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے کوئی نبی نہیں آ سکتا، آپ کہیں وہ حضرت عیسی علیہ السلام آئیں گے، تو وہ تو ایسا ہی ہے جیسے مثلاً ہم تقریر کریں اور ہماری تقریر کے بعد ایک آدمی کھڑے ہو کر یہ کہے کہ بھائی ابھی جو باتیں سنی ہیں اس پر عمل کرو، تو حضرت عیسی علیہ السلام دنیا میں تشریف لائیں گے اور تشریف لا کر یہی کہیں گے کہ حضور ﷺ کی شریعت پہ عمل کرو، اور خود حضور ﷺ نے ان کی تشریف آوری کی اطلاع دیدی، اسی لئے بقول حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے نبوت عدد کے اعتبار سے حضور پر ﷺ پوری ہوگئی۔ (ملفوظات محدث کشمیری ص ۳۲۰) جیسے آپ ایک آنہ سے گننا شروع کریں سولہ آنے تک روپیہ پورا ہو گیا اب ادھر سے ایک آنہ اٹھا کر ادھر ڈالے تو سترہ آنے تھوڑی ہی ہوتے ہے، سمجھ میں آ رہا ہے، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ، ایک روپیہ مکمل اتنے آنے آپنے رکھ دیئے اب اسکے بعد ایک آنہ ادھر سے اٹھا کر ادھر آگے پہنچا دیا سولہ کے بعد تو وہ سترہ آنے تھوڑی ہوئے وہ تو ادھر ہی کا ایک ہے، تو حضرت عیسی علیہ السلام چونکہ آپ ﷺ سے پہلے تشریف لا چکے ہیں اس لئے خاتم النبیین حضرت عیسی علیہ السلام نہیں، حضور ﷺ ہیں،

تو اجتبیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کا نبوت کی شکل میں ظاہر ہوا، اللہ تعالی نے انہیں نبوت عطا فرمائی اور نبوت عطا فرمانے کے ساتھ بادشاہت بھی عطا فرمائی، اور دونوں کی برکتیں کیسی کچھ ظاہر ہوئی ہیں اسکی تفصیلات آگے انشاء اللہ آتی رہیں گی، دعا کیجئے اللہ پاک عمل کی توفیق عطا فرمائیں، اور قرآن وحدیث سے شغف اور دلچسپی نصیب فرمائیں، آمین۔

درس نمبر (۱۱)

الحمد لله و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، امابعد!

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم ،

و کذلک یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمته علیک وعلیٰ آل یعقوب کما اتمھا علیٰ ابویک من قبل ابراھیم واسحق ، ان ربک حکیم علیم(یوسف،آیت:۶) ☆ **صدق اللہ العظیم**

علم اور نبوت کا ایک خاص جوڑ ہے

بزرگانِ محترم! کل یہ بات چل رہی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ نے شروع ہی سے حضرت یوسفؑ پر بڑا ہی انعام اور بڑا ہی کرم فرمایا، حضرت یعقوبؑ انہیں خبر دے رہے ہیں کہ حق تعالیٰ تمہیں مجتبیٰ بنائیں گے اور خواب کی تعبیر کا علم عطا فرمائیں گے، اور نعمت کا اتمام فرمائیں گے، اور بیشک حق تعالیٰ حکیم وعلیم ہیں، مجتبیٰ اور مصطفیٰ کی کچھ تفصیل پیچھے عرض کردی گئی تھی، آج بھی کچھ باتیں اسی آیت کے متعلق گوش گذار کرنے کا قصد ہے، اللہ تعالیٰ مفید اور نافع باتیں کہلوائیں۔

حضرت یعقوبؑ فرمارہے ہیں ''**ویعلمک من تاویل الاحادیث**'' حق تعالیٰ تمہیں خواب کی تعبیر کا علم عطا فرمائیں گے، دقیق باتوں کا علم عطا فرمائیں گے، اور اپنی نعمت مکمل فرمائیں گے، نعمت کے اتمام سے مراد نبوت ہے، اس سے یہ بات مستفاد ہوئی کہ علم اور نبوت کا ایک خاص رابطہ اور جوڑ ہے، کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جسے حق تعالیٰ شانہ نے خصوصیت کے ساتھ علم سے سرفراز نہ فرمایا ہو۔

نبی حق تعالیٰ شانہ کا عارف ہوتا ہے

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نبی حق تعالیٰ شانہ کا عارف ہوتا ہے، اور صفاتِ ربّانی پر نبی کو خبر ہوتی ہے، بالکل اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بہت بڑا دربار سجا ہو اور بادشاہ سلامت اپنے دربار میں ساری شوکت وحشمت کے ساتھ تشریف فرما ہو، اور تمام افسران ہو حکمرانِ بالا دست ہو، اور بادشاہ کے قریب وزیرِاعظم موجود ہو تو ظاہر بات ہے بادشاہ کے مزاج کی جتنی معرفت وزیرِ اعظم کو ہوگی وہ دوسرے افسران کو نہیں ہوگی، اور جتنی معرفت قریبی افسران اور حکمران کو ہوگی اتنی عام رعایا کو نہیں ہو سکے گی، تو درجہ بدرجہ قرب کے مراتب گویا طے ہوتے رہیں گے۔

وحی اور الہام کا فرق

اسی لئے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت نانوتویؒ سے یہی سوال کیا گیا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اولیاء اللہ کے قلب پر جو بات آتی ہے اسے الہام سے تعبیر کرتے ہیں، اور انبیاء کے قلب پر جو بات آتی ہے اسے وحی سے تعبیر کرتے ہیں، تو سرچشمۂ علم دونوں کا ایک ہی ہے پھر دونوں کے حکم میں بڑا فرق کیوں کیا گیا ہے جبکہ علم ادھر ہی سے آتا ہے، مگر ولی کی بات اتنی قطعی نہیں سمجھی جاتی جتنی نبی کی بات سمجھی جاتی ہے، نبی کی بات دین میں حجت ہے دین میں اس سے استدلال ہوسکتا ہے، وہ معیار بن جاتی ہے، اور ولی کی بات اس درجہ کی قطعی نہیں ہوتی ہے جو بات اس میں پائی جاتی ہے، تو حضرت نانوتویؒ سے سوال کیا گیا کہ الہام بھی ویسے ہی قطعی اور یقینی ہونا چاہئے جیسے وحیٔ مبین ہوتی ہے قطعی اور یقینی، تو حضرت نے بڑا عجیب وغریب جواب دیا اور بڑوں کی شان ہی عجیب ہوتی ہے، کبھی تو سکوت کے ساتھ جواب ہوتا ہے اور کبھی کلام کے ساتھ جواب ہوتا ہے،

اور جواب کی بھی قسمیں ہیں، بلکہ جیسے سکوت کے ساتھ جواب ہے سوال بھی سکوت کے ساتھ ہوتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ کا ایک خادم تھا اور تھا مسلکِ یہود سے تعلق رکھنے والا وہ علیل ہوا بیمار ہوا نبیٔ کریم ﷺ عیادت کیلئے تشریف لے گئے اور اس کے سامنے موت سے پہلے پہلے کلمۂ توحید پیش کیا، بیٹے نے باپ کی جانب سوالی نگاہ سے دیکھا، تو باپ نے اجازت مرحمت فرمائی کہ کلمہ پڑھ لے، نبیٔ کریم ﷺ نے جب اس کا کلمہ سنا تو خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے گھر سے باہر تشریف لے آئے، (مشکوۃ شریف) تو یہاں آپ دیکھیں گے کہ جو جواب دیا گیا ہے وہ آنکھوں کے ذریعہ سے دیا گیا، تو معلوم ہوا کہ کبھی آنکھ سے بھی سوال ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جواب بھی پیدا ہو جاتا ہے، تو یہاں بھی شکل یہی ہوئی کہ حضرت نے جواب دیا اور بڑا عجیب وغریب اور ان کی شان ایسی ہی تھی علوم میں اسی لئے امام رازیؒ اور امام غزالیؒ نے جو بڑے بڑے مسائل دلائل کے ساتھ لکھے ہیں، حضرتؒ نے اس کو چٹکلوں میں اور مثالوں سے حل فرما دیا ہے، گویا اس کو عقلی نہیں رکھا بلکہ حسّی یعنی آنکھوں دیکھا حال جو ہوتا ہے ویسی کیفیت اسکی بنا دی، جیسے مثال کے طور پر ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! بزرگوں کے پاس دفن ہونے کی لوگوں کو خواہش ہوتی ہے تو کیا اس میں کچھ فائدہ بھی ہے، نفع بھی ہے؟ حضرت نے اسکو اس وقت کوئی جواب نہیں دیا، اس بات کو زمانہ گذر گیا جب گرمی آئی تو ایک صاحب حضرت کو پنکھا جھل رہے تھے اور ہوا کر رہے تھے اور وہ سوال کرنے والے شخص قریب بیٹھے تھے تو حضرت نے ان سے پوچھا کہ آپ کو ہوا لگ رہی ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہوا لگ رہی ہے تو فرمایا کہ یہ آپ کے اس دن کے سوال کا جواب ہے یعنی منشاء یہ تھا کہ یہ ہوا کرنے والے براہِ راست تو مجھے ہوا کر رہے تھے مگر قرب کی وجہ سے آپ بھی محروم نہیں آپ کو بھی ہوا لگ رہی ہے تو حق تعالیٰ کی رحمت میں تعمیمی شان ہے، حق تعالیٰ کی طرف

سے جب کسی بندۂ خدا پر رحمت نازل ہوگی تو قریبی بھلا اس سے کیسے محروم رہے گا؟ اس پر بھی اسکے اثرات پڑیں گے اور پہنچیں گے (خطبات حکیم الاسلام ج ۳ ص ۳۹۴/۳۹۵) تو حضرت نے اس سے دریافت کیا اور وہ صاحب حضرت کے ساتھ چل رہے تھے، حضرت نے ان سے پوچھا کہ سامنے جو جیل خانے کی دیوار نظر آتی ہے، بتایئے! وہ کتنے قدم کے فاصلے پر ہے، انہوں نے کہا کہ یہاں سے تقریباً ساٹھ ستر قدم ہوں گے، پھر کچھ دور چلنے کے بعد حضرت نے پوچھا کہ اب بتایئے! کتنا فاصلہ ہے، کہا تیس چالیس قدم، کچھ اور آگے بڑھے تو پھر دریافت کیا تو فرمایا کہ پندرہ بیس قدم، اور کچھ آگے بڑھے تو پھر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آٹھ دس قدم، کچھ اور آگے بڑھے تو کہا کہ پانچ سات قدم، اور قریب ہوئے تو کہا کہ ایک قدم باقی ہے، فرمایا کہ اب تو ایسا نہیں ہے کہ ایک یا دو قدم، اس نے کہا نہیں، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جب تم دور تھے تو پچاس ساٹھ، تیس چالیس، دس، بیس، پانچ، سات یہ شک کے صیغے استعمال کر رہے تھے جواب میں قطعی کیفیت نہیں تھی اور جب تم اتنے قریب ہوگئے کہ ایک قدم کا فاصلہ رہا تو اس وقت اب یہ کہنے لگے کہ ایک ہی قدم کی مسافت اور دوری باقی ہے، تو دیوار اپنے مقام پر قائم ہے اور شک کی اور یقین کی کیفیت وہ ہمارے اعتبار سے مختلف ہے کہ جب ہم دیوار سے دور تھے تو کلام کے اندر آپ کے شک کا پہلو تھا اور اس میں قطعی طور پر بات نہیں کہی گئی کہ پچاس ساٹھ، تیس چالیس، دس بیس، اور جب ایک قدم کی مسافت باقی رہی تو اس صورت میں تمہارے کلام میں قطعیت پیدا ہوئی، تو رب العلمین سے انبیاء کرامؑ جتنے قریب ہیں اتنے قریب اولیاء اللہ نہیں ہیں، تو وہ علم اس قطعیت کے ساتھ لیتے ہیں کہ وہاں اندر حجابات باقی نہیں رہتے، اور ولی کے اندر بھی قرب ہوتا ہے مگر اس شان کا قرب اور نزدیکی نہیں ہوتی جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو نصیب ہوتی ہے (خطبات حکیم الاسلام ج ۳ ص ۳۹۵/۳۹۶)۔

مااتّخذاللہ جاھلا ولیّا

اسی لئے صوفیاء لکھتے ہیں کہ ''مااتخذاللہُ جاھلاً ولیا'' 'اللہ تعالیٰ نے آج تک کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا، پھر غور سے سن لے! اللہ تعالیٰ نے آج تک کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا، اور جب حق تعالیٰ کسی کو ولایت دیتے ہیں تو علمِ لدنیّ سے سرفراز فرما دیتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ جاہل ہو، جاہل کو تو دنیا کے سلاطین اپنے یہاں رکھنا پسند نہیں کرتے، تو جب انسان جہالت کو برداشت نہیں کرسکتا ہے تو رب العلمین کی ذات ایسی گئی گذری تھوڑی ہے کہ آدمی جاہلِ مطلق ہو اور مقربِ خداوندی بن جائے، تو بنیادی اور اساسی چیز علم ہے، اسی لئے صاحبِ روح المعانیؒ لکھتے ہیں کہ '' ویتم نعمته، ، سے نبوت کی طرف اشارہ ہے، گویا پہلے علم کی طرف اشارہ اس کے بعد نبوت کی طرف اشارہ ہے۔

علم کی اہمیت

اور یہی وجہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کو غارِ حراء میں جبرئیلِ امین نے پہلا جملہ جو ارشاد فرمایا تو یہی کہ '' اقرا ، ، آپ پڑھئے تو آپ نے فرمایا ماانا بقاریٔ (تاریخ مکۃ المکرّمۃ ص۲۲۲ بحوالہ بخاری شریف) تو غرض یہ کہ ابتداء ہوتی ہے درحقیقت علم سے اور اس کے بعد جا کر پھر حق تعالیٰ نے کمالاتِ نبوت سے سرفراز فرمایا ہے، اسی لئے فرمایا کہ ''اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم '' (علق، آیت: ۳/۴) آپ پڑھئے اور آپ کا رب جو ہے اکرم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھلایا ہے تو قلم جیسی بے جان چیز قلم جیسی بے وقعت چیز کہ بظاہر اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے جب وہ علم کا ذریعہ بن جائے تو اسے خادمِ علم قرار دیا گیا کہ اس کے ذریعہ سے علم پہنچتا ہے اور علم آتا ہے۔

علم کے ساتھ عبدیت ضروری ہے

تو انسان بھی اگر حق تعالیٰ کے آگے اپنے کو ڈالدے اور جھکا دے تو حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی علم کا فیضان ہوگا، اسی لئے کتابوں میں لکھا ہے کہ جیسے مثلاً انسان کے ہاتھ میں یہ قلم ہے (یہاں حضرت نے اپنے ہاتھ میں قلم لیکر حاضرین کو دکھلایا) یہ قلم جب تک اکڑا رہے تو اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا اور جب لکھنا شروع کریں گے تو وہ جھکے گا اور پستی اختیار کرے گا تو خدا تعالی کے آگے بندہ اگر جھکے گا تو اسکی زبان سے بھی علم وحکمت کے چشمے جاری ہوں گے، وہاں صفحات بھر جاتے ہیں یہاں قلوب علم سے بھر جائیں گے، تو بنیادی چیز عبدیت ومعرفت ہے کہ اس کے بغیر علم نہیں آتا، اسی لئے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے تھے کہ میرے نزدیک حضرت آدمؑ کی تاجِ خلافت کی بنیاد عبدیت ہے اور حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک علمیت ہے (مجالس خطیب الامت ص ۱۳۸) اور حق یہ ہے کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ جتنا علم اور جتنی معرفت ہوگی اسی اعتبار سے عبدیت کی کیفیت بھی پیدا ہوگی، تو علمیت کے ساتھ عبدیت ہونا انتہائی ضروری ہے، اور وہ علم جس سے آدمی میں بندگی پیدا نہ ہو وہ صرف الفاظ ونقوش ہے اس سے کچھ بھی نہیں ہوتا، چنانچہ آج امریکہ کے اندر حجۃ اللہ کا درس دیا جاتا ہے، امریکہ اور یورپ کے بہت سے مدارس میں بعض جگہوں میں ہدایہ داخلِ نصاب کی گئی ہے، تو ہدایہ جیسی فقہ کی کتاب اور حجۃ اللہ جیسی اسرار وحکم کی کتاب حتی کہ خود قرآنِ کریم لوگ پڑھتے ہیں مگر پڑھنے کے بعد بھی چونکہ اس کے حقائق اپنے اندر نہیں اتارتے ہیں اور اس غرض سے نہیں پڑھتے تو الفاظ کا علم تو ہو جاتا ہے مگر حقیقت نہیں آتی، اور سب سے بڑی چیز ہے حقیقت کا پیدا ہو جانا۔

حضرت نانوتویؒ کا بہترین جواب

اسی لئے حضرت نانوتویؒ سے پوچھا گیا کہ حضرت! آپ اتنے بڑے عالم ہے پھر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے تعلق قائم کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت نے بڑا اچھا جواب دیا فرمایا ایک وہ آدمی ہے جس کے سامنے مٹھائیوں کے مختلف نام ہے کہ یہ پینڈا ہے، یہ برفی ہے، یہ فلاں اور فلاں ہے مگر اس نے اس کو چکھا نہیں اور وہ اس کے ذائقہ سے واقف نہیں ہے، اور ایک آدمی ایسا ہے کہ اس نے ساری مٹھائیاں کھائی ہیں نام اسے معلوم نہیں (الافاضات الیومیہ جلد دہم ۱۷) تو مقصد تو گویا آم کھانے سے کام ہے نام سے کیا بحث ہے؟ اور نام تو بالکل بعد کے درجہ کی چیز ہے۔

کام مقدم ہونا چاہئے نام تو بعد کی چیز ہے

اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا کہ ''ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ'' اس سے اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے جس نے خدا تعالی کی طرف دعوت دی ''وعمل صالحا'' اور خود بھی اس نے نیک کام کئے ''وقال اننی من المسلمین'' (حم السجدۃ، آیت: ۳۳) اور اس کے بعد یہ کہا کہ میں مسلمانوں میں سے ایک ہوں، تو قرآنِ کریم نے پہلے تو کام ذکر کیا اس کے بعد نام کا تذکرہ کیا، معلوم ہوا کہ اصلِ اصول یہی ہے کہ پہلے کام ہو پھر نام ہو، آج دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ کوئی تنظیم شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے نام کا مسئلہ آجاتا ہے کہ یہ صدر ہے یہ سکریٹری ہے، یہ شکریٹیٹی ہے یہ فلاں ہے یہ فلاں ہے، تو غرض یہ کہ اسی بنیاد پر جھگڑا اور تصادم شروع ہوجاتا ہے، تو اسلام کا نقطۂ نگاہ درحقیقت کام کو مقدم کرنا ہے، اور اس کے بعد پھر مسئلہ آجاتا ہے اپنی حیثیت اور اپنے نام کا ورنہ حق یہ ہے کہ سب سے بڑی چیز مٹا کر کام کرنے کی ہے۔

عبدیت بڑی چیز ہے

اسی لئے آپ تبلیغی جماعت میں دیکھیں گے کہ یہ ایک لفظ کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو بے حیثیت بنا کر کام کیا جائے، ترکیسر میں تبلیغی اجتماع تھا اس میں ان لوگوں نے خواص میں بندے کی بات رکھی تھی، تو میں نے ان سے ذکر کیا کہ یہ بے حیثیت اردو والا ہے کہ دین کیلئے انسان فکر کرے اور اپنے جان و مال کی قربانی لیکر لگے اور اپنے آپ کو بے حیثیت بنا کر چلے تو میں نے کہا کہ یہ بے (دو) گجراتی والا نہیں ہے کہ دین کی حیثیت بھی اور اپنی حیثیت بھی گویا دو حیثیت بلکہ یہ بے نفی کے معنی میں ہے کہ اپنے آپ کو بے حیثیت بنائیے اور واقعی عبدیت بڑی چیز ہے۔

مٹی کا اثر

اس لئے اگر کوئی آدمی کسی مقام پر کام کرتا ہو اور دوسرا کوئی پہنچ جائے تو اسے اور خوش ہونا چاہئے کہ مجھے اس سے مدد ملے گی، تقویت ہوگی، اور میں نے اس کی مثال دی کہ ہمارے یہاں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک آدمی نے مٹکے میں برف ڈالدیا آئس ڈالدیا، تو دوسرے صاحب یہ کہنے لگے کہ مٹکا یہ کام کرتا ہے کہ پانی کو محفوظ بھی رکھتا ہے اور ٹھنڈا بھی کرتا ہے تو ٹھنڈا کرنا اس کا کام ہے، مگر جب مٹکے کے اندر برف ڈالدیا گیا تو مٹکے کو غیرت آتی ہے کہ جس کام کو میں انجام دے رہا ہوں اس کام کو یہ مجھ سے بھی اچھے انداز میں دینا چاہتا ہے، تو مٹکا بھی پانی ٹھنڈا کرتا ہے مگر برف پڑ جانے کی وجہ سے وہ اپنا کام چھوڑ دیتا ہے، تو انسان بھی چونکہ مٹی سے بنا ہے وہ دیکھتا ہے کہ میں کسی کام کو کر رہا ہوں، اب یہ آ گیا تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اب میری پوزیشن ڈاؤن ہوگئی تو وہ

بدل ہوجاتا ہے تو وہاں جیسے مٹکے نے یہ کام کیا اور یہ اسی سے بنا ہوا ہے مٹی سے تو اسکے اندر بھی یہی بات پیدا ہوجاتی ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ یہ اخلاص کے خلاف ہے کہ آدمی کام میں لگا ہوا ہو اور دوسرا کام کرنے والا آجائے تو اس کو گرانی اور ناگواری ہو، بلکہ اسے تو خوش ہونا چاہئے۔

نفس وشیطان انسان کے دو بڑے دشمن ہیں

تو اپنے کو بے حیثیت بنانے کا مطلب یہ ہے کہ نکلنے سے پہلے شہرت کا کوئی قصد نہ ہو، اور نکل کر جب واپس آئے تو بھی شہرت کا کوئی قصد نہ ہو، ورنہ ایک بات ذہن میں رہے کہ نفس وشیطان اول تو کوئی کام کرنے دینا نہیں چاہتے، اور اگر آدمی کرلے تو محفوظ رہنے دینا نہیں چاہتے، اب آپ دیکھئے! جیسے مثال کے طور پر آدمی نے کسی ملک کا سفر کیا اور سفر کر کے جب واپس لوٹتا ہے تو کارگذاری سنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو ترغیب ہو لوگوں کو شوق ہو کہ ہماری جماعت فلاں جگہ گئی فلاں مقام پر گئی اور یہ فائدہ ہوا، مگر آپ نے کسی ملک کا سفر کیا ہے تو اب یہ نہیں ہونا چاہئے آپ جہاں بیٹھ جائے وہاں اس کا تذکرہ آپ ایسے کریں جیسے طوفانِ نوح کا ایک واقعہ تھا، یا ولادتِ مسیح کا ایک واقعہ جس سے انگریزی سال بنتا ہے یا ہجرت کا واقعہ تو اس کو ایسی حیثیت دے کہ ہر موقعہ پر اسی کی رٹ تو اس سے گویا کارگذاری مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتلانا ہوتا ہے کہ میں نے اتنے ملکوں کا سفر کیا، تو اخلاص کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کارگذاری کے محل میں اسے ضرور بیان کرے، ترغیب کے محل میں اسے ضرور بیان کرے، مگر اپنی نیت کی حفاظت کرے کہ اس میں شہرت کی کیفیت اور اس قسم کی اور کوئی کیفیت پیدا نہ ہو۔

چلت پھرت کا مقصد

اور ایک بات یہ ذہن میں رہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ فرماتے تھے کہ اس چلت پھرت (تبلیغی جماعت) کا مقصد یہ ہے کہ زندگیوں میں دین آجائے (ملفوظات حضرت مولانا الیاسؒ ص ۲۶)۔

چھ نمبر کا انتخاب بڑا عجیب ہے

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ چھ نمبر کا جو انتخاب ہے یہ بڑا عجیب ہے، بلکہ میں اپنے اس مزاج کے تحت جو میری عادت ہے میں یہ کہدوں کہ اس کو صحیح طریق پر انجام دے تو چھ سمت میں اور چھ جہت میں اس کی برکات پھیلے گی اس لئے کہ جہتیں بھی چھ ہی ہیں ایک اوپر ایک نیچے ایک دائیں اور ایک بائیں اور ایک آگے اور ایک پیچھے تو چھ نمبر کی برکات چھ سمت اور چھ جہت میں پھیلے گی بشرطیکہ اس کو اصول کے ساتھ انجام دیا جائے۔

مائن آؤٹ آف کنٹرول نہ ہو

مثلاً آدمی جماعت میں نکلا تو ماحول اچھا ہے، ساتھی اچھے ہیں، اور چونکہ وہ خرافات سے دور ہے، دعاؤں کا ماحول، خدمت کا ماحول، تعلیم کا ماحول، اور ذکر وشغل کا ماحول ہے، تو بعض دفعہ آدمی کو کچھ کیفیات محسوس ہوتی ہے، اب موقعہ ہوتا ہے کہ اس کا مائن آؤٹ آف کنٹرول نہ ہونے پائے بلکہ بندگی کی کیفیت اس میں باقی رہے، چنانچہ ایک مثال دوں میں آپ کو کہ ایک آدمی ہے وہ رات کو تہجد پڑھتا ہے، فجر کی نماز پڑھتا ہے اس کے بعد چھ نمبر سنتا ہے ساتھ ہی اشراق پڑھ کے دعا کر کے نکلا ہے، اب وہ دیکھتا ہے کہ ایک مسلمان چارپائی پر سویا ہوا ہے، اب یہ موقعہ ہے نفس کو سنبھالنے کا کہ اگر ذرہ برابر اس کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ حقیر ہے اور مردود ہے اور ہم نے

تو جنت کا ایگری مینٹ کر رکھا ہے تو آپ کا سارا کیا کرایا چوپٹ ہو جائے گا۔

ایمان کا ہیرا سب سے زیادہ قیمتی ہے

اور بنیاد اس کی یہ ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایمان کا ہیرا اتنا قیمتی ہیرا ہے کہ آسمان وزمین اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اگر کوئی ہیرا کیچڑ میں اور نالی میں گر جائے تو وہ تو اس کا مستحق ہے کہ اس کو اٹھایا جائے اور کیچڑ اور نجاست سے دھو کر اس کو کام میں لایا جائے، ہیرا بہر حال ہیرا ہے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، تو اگر کوئی اللہ کا بندہ گناہ میں مبتلا ہے تو بجائے اس کو حقیر اور ذلیل سمجھنے کے اسکے ساتھ پیار وشفقت کا معاملہ ہونا چاہئے کہ وہ بھی گناہ کی نجاست اور کیچڑ کو دور کرے اور کسی طریقہ سے صلاح پر آجائے، اس لئے کہ مستقبل کی کوئی خبر نہیں کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔

انما العبرة بالخواتیم

ایک بزرگ تھے ان سے ایک عورت یہ کہتی تھی کہ تمہاری ڈاڑھی سے میرے بکرے کی ڈاڑھی اچھی ہے، وہ بڑے صاحبِ نسبت بزرگ تھے انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب میرا انتقال ہو تو اس عورت کے گھر کے پاس سے میرا جنازہ لے جایا جائے، چنانچہ زندگی کے دن پورے ہو گئے ان کا انتقال ہوا انتقال کے بعد جب جنازہ ادھر سے لے جایا جانے لگا تو صاحبِ کرامت شخص تھے اللہ تعالیٰ کو اپنے ولیوں کی اور نیک بندوں کی اہانت پسند نہیں آتی ہے گھر کے سامنے پہنچے تو جنازہ میں اٹھ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ اے عورت! آج تیرے بکرے کی ڈاڑھی سے میری ڈاڑھی اچھی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی، اور عذاب سے میرے لئے نجات کی شکل

پیدا ہوگئی کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے، تو غرض یہ کہ اعتبار انجام کا ہے۔

انسان کا مدار صفات پر ہے

مکہ شریف میں ایک مرتبہ ایک بلڈنگ میں خواص کا جوڑ تھا، اس میں ان لوگوں نے بندے کی بات رکھی تھی، حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحبؒ بھی آئے ہوئے تھے پرانے لگے ہوئے تو بات یہی چل رہی تھی کہ درحقیقت انسان کا مدار صفات پر ہے اگر صفاتِ حسنہ پیدا ہو تو قابلِ تعریف اور بری صفات ہو تو اس صورت میں قابلِ مذمت ہوتا ہے، آدمی کی ذات پر دار و مدار نہیں ہے، پھر میں نے کہا کہ اسی لئے گناہ کی شکل میں بھی گنہگار آدمی کو حقیر سمجھنے کی گنجائش نہیں ہے، وہ پرانے آدمی تھے لیکن انہوں نے یہ اشکال کیا کہ پھر ''بغض فی الله'' کا کیا مطلب ہے؟ یعنی کسی شخص سے عداوت اور اس کو مبغوض سمجھنا خدا کی نسبت پر، میں نے ذکر کیا کہ ''بغض فی الله'' کا مدار بھی صفات ہی پر ہے، پھر میں نے اس کی ایک مثال دی کہ مثلاً ایک مسلمان ہے اور وہ شرابی ہے، بدکار ہے، زانی ہے، اس کی لائف بالکل رف ہے، اور ظاہر بات ہے کہ ان افعال کی وجہ سے آدمی کو ناگواری ہوتی ہے اور ان کاموں کو آدمی برا سمجھتا ہے، اور پھر دلیل میں میں نے یہی بات پیش کی کہ وہی آدمی اگر توبہ کرلے اللہ تعالی کے آگے گڑگڑا کر اپنے گناہ معاف کرالے اور اپنی زندگی کو درست کرلے تو اب اس سے بغض اور ناراضگی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے حالانکہ ذات تو اس کی جو پہلے تھی وہی اب بھی ہے صرف صفات میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے، تو دار و مدار صفات پر ہے، لہٰذا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کل کو ہمارا حال بدل جائے اور دوسروں کا حال ٹھیک ہوجائے۔

ہمارے اکابرین عبدیت کا اہتمام کرتے تھے

لہٰذا حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا وہ عمل کہ کسانوں کے پاس پہنچ کر ڈاڑھی میں ہاتھ ڈالا اور اس کی کوشش کی کہ کسی طریقہ سے بیچارے راہ پر آجائے، تو یہ بڑے حضرات تھے عبدیت کا اہتمام کرتے تھے دعویٰ وہاں پر نہیں، تفاخر وہاں پر نہیں، تعلّی اور شوکت وہاں پر نہیں، بس یہ تھا کہ ہم لگے ہیں اس کام میں اور اسکی برکت سے ہمارے قلب میں ایمان جم جائے، یقین بیٹھ جائے، اور حقوق کی ادائیگی کی فکر پیدا ہو جائے۔

ایک مخلص بندے کی بات کا اثر

چنانچہ مجھے یاد ہے جب میں مالیگاؤں میں پڑھتا تھا تو میوات سے ایک جماعت آئی میں نے انکی تقریر سنی ظہر کی نماز کے بعد ان کی بات ہوئی ہے۔اس کی بات اور اس کے کلام میں اتنی تاثیر تھی کہ جیسے جملے جملے سے آہیں نکلتی تھیں، تو اللہ تعالی کے بعض ایسے مخلص بندے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو اللہ تعالی نے شروع میں کھڑا کیا اس کے بعد اللہ تعالی نے ان سے وہ کام لیا ہے کہ نہ پوچھئے بات۔

اخلاص بڑی چیز ہے

ایک مرتبہ ایک جماعت کسی شہر میں پہنچی تو گشت کی کوئی شکل نہیں بنتی تھی لوگ تیار نہیں ہوتے تھے بات نہ جمتی تھی نہ بنتی تھی نہ ذہن میں لوگوں کے آتی تھی، بالآخر انہوں نے یہ طے کیا کہ چار آدمی بستی کے چاروں کونوں میں پہنچ جائیں اور رات کو اٹھ کر گڑگڑا کر دعا کریں کہ پروردگار عالم! قلوب آپ کے اختیار میں ہیں ہماری تو کوئی حیثیت نہیں ہے ہمارا کام تو بس یہ ہے کہ ہم سعی وکوشش کریں نتیجہ مرتب کرنا آپ کا کام

ہے، چاروں نے دعا کی اور اس کی برکت سے صبح حق تعالیٰ نے اہلِ بستی کے دل میں تبدیلی پیدا کی اور ان کو اس کام سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہوئی، تو اخلاص بڑی چیز ہے، تو حق تعالیٰ کی ذاتِ عالی پر نظر ہو اور باقی تمام چیزوں سے آدمی فارغ ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ جو منشاء ہے اس کو خاص ملحوظ رکھے کہ زندگی میں دین آنا بڑی چیز ہے، اگر ہمارا معاشرہ اور معیشت ہمارا کیریکٹر اور اخلاق سارا معاملہ ٹھیک نہیں ہوا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ دعوت سے تعلق رکھتے ہیں پھر ان میں تبدیلی نہیں تو اس کا برا اثر پڑے گا۔

سب سے بڑا مسئلہ قلب کی دنیا کا ہے

ملاوی کے ایک اجتماع میں لوگوں سے میں نے یہ ذکر کیا کہ ہم اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ الحمد للہ اس کام کی برکت سے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے، اس جملہ کے نقل کرنے کے بعد بھی اگر ہم میں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی اور کل قیامت میں ہم سے سوال ہو گیا تو ہم کیا جواب دیں گے، تو حق یہ ہے کہ اپنے کو مٹا کر اخلاص سے ہم نکلیں، اور دیکھئے سب سے بڑا مسئلہ قلب کی دنیا کا ہے، آج کی دنیا میں لوگ کہتے ہیں لینگویج اور زبان کا مسئلہ بڑا اہم ہے مگر میں نے اپنے بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ انسان کے دل کی زبان ٹھیک ہوگئی تو سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں، صحابہ جب نکلے ہیں نبی کریم ﷺ کی صحبت کا اثر پا کر تو چین میں تقریباً آٹھ صحابہ پہنچے تھے اور آج تقریباً آٹھ کروڑ سے زیادہ مسلمان اس مقام پر موجود ہیں تو وہ ایسے تھے کہ جہاں پہنچے وہاں تبدیلی آگئی، ہم صرف اسی کو زبان سمجھتے ہیں اور بول لینے کو کامیابی مگر حقیقت یہ ہے کہ دل کی زبان سب سے بڑی زبان ہے اگر دل کی زبان اور عمل کی زبان ٹھیک ہوگئی تو مسئلہ آسان ہے۔

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا ایک ملفوظ جس کا غلط مفہوم لیا گیا

یہی وہ چیز ہے جس کو حضرت مولانا الیاس صاحبؒ فرماتے تھے کہ تقریر اصل نہیں، کام اصل ہے، اور اس میں بھی میں ایک اصلاحی بات کہدوں شاید وہ ناگوار بھی ہو حضرت کی دوررس نگاہیں دیکھتی تھی کہ یہ کام پھیلے گا، اس میں بھیڑ ہوگی، اور آج الحمدللہ پوری دنیا میں یہ کام پھیلا ہوا ہے اور عوام اس میں لگے ہوئے ہیں اور ایک بڑا عالَم اس سے جُڑا ہوا ہے، تو اگر تقریر پر بنیاد ہوتی تو ہوسکتا تھا کہ کمپیٹیشن (تقابل) پیدا ہوجائے، ہوسکتا تھا کہ کبر و عجب پیدا ہوجائے، ہوسکتا تھا کہ اپنے بارے میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ میری کوئی حیثیت ہوگئی ہے اور یہ خیال تو سب کو ہوسکتا ہے، خود مجھے یاد ہے جب ابتدائی زمانہ میں میری تقریریں ہوتی تھی تو گجرات کے مختلف اخباروں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا تو میں دیکھتا تھا کہ اس سے نفس خوش ہوتا تھا، بعد میں پھر یہ کیفیت تھی کہ اب تو رونا آتا ہے اور ایک اعتبار سے ہنسی بھی آتی ہے مگر یہ کہ ابتداء میں ایسی حالت تھی، یہ تو جب تھا کہ علم پڑھا تھا بزرگوں کے پاس رہا تھا تب یہ کیفیت تو پھر بیچارے عوام کی کیا حیثیت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کو ایک آدمی نے کہا کہ حضرت! فلاں مولوی صاحب کو فلاں بستی میں بھیجدیں تو امید ہے کہ بہت نفع ہوگا، حضرت نے فرمایا کہ نفع کی بات کرتے ہو وہ چند مصافحوں کے ہیں گویا ابھی بالکل ابتدائی حال ہے، ذرا آؤ بھگت ہوئی تو ہوسکتا ہے قلب میں کبر پیدا ہوجائے، تو بڑے لوگوں کی نگاہیں بڑی ہوتی ہیں، تو حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا منشاء یہ تھا کہ کمپیٹیشن کی شکل نہ ہو دعوی کی شکل نہ ہو تعلّی کی شکل نہ ہو، مگر کم علمی کی وجہ سے بعض لوگ اس جملہ کا ایک اور مطلب لے لیتے ہیں وہ اس طرح نقل کرتے ہیں کہ تقریر و بیان مقصود نہیں ہے، تو اس میں درحقیقت مولانا کا جو

منشاء اور مقصد تھا اس سے ہٹ کر ایک اور مطلب لیتے ہیں، کہ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں قرآن وحدیث میں کھپائی اور لگائی ان کے بیان کو بے وقعت کرنے کیلئے بعض لوگ اس جملہ کو استعمال کرتے ہیں کہ تقریر مقصود نہیں ہے، تو یہ درحقیقت مولانا کی روح کو ایذاء پہنچانا ہے، اس لئے کہ وہ اربابِ علم کا بے پناہ اکرام کرتے تھے، ہمیں تو صرف اپنی سطح کو ملحوظ رکھنا ہے۔

سنو زیادہ، بولو کم

یہی وجہ ہے کہ بچہ کا مزاج یہ ہے کہ وہ سنتا پہلے ہے اور بولتا بعد میں ہے، اور حضرت مولانا کا بھی منشاء یہی تھا کہ آدمی میں حقیقت پیدا ہو جائے، آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ چھوٹا بچہ سنتا پہلے ہے اور بولنا بعد میں شروع کرتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بولنے سے پہلے وہ روتا ہے، تو خدا کرے کہ ہم خدا تعالی کے آگے رونے والے بن جائے اور اس کے بعد پھر بولنے والے بنے تو سننا پہلے ہے رونا پہلے ہے بولنے کا مسئلہ بعد میں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کان دو لگائے ہیں اور زبان ایک ہے اس میں ادھر اشارہ ہے کہ سنو زیادہ بولو کم، اور ادھر بھی اشارہ ہے ایک موقعہ پر کسی جگہ اختلافات تھے تو میں نے کہا کہ یہ عجیب نظام ہے کہ جو مائن اور دماغ ہے وہ اوپر ہے وہ فیصلہ کرتا ہے اور جج مینٹ دیتا ہے اس کے لئے کان تو دو لگائے ہیں جو سننے والے ہیں اور آنکھیں دو لگائی جو دیکھنے والی ہیں اور کان اور آنکھ کے ذریعہ آدمی انکوائری کرتا ہے، ریسرچ کرتا ہے تو آنکھیں تو وہ ہیں جو دن بھر کھلی ہوئی رہتی ہیں رات میں بیچاری بند ہو جاتی ہیں، اور حضرتِ کان تو رات میں بھی کھلے رہتے ہیں، اسی لئے اصحابِ کہف کی نیند کے باب میں فرمایا "فضربنا علی آذانهم فی الکهف سنین عددا" (کهف آیت: ۱۱) کہ ہم نے ان کی آنکھوں پر نہیں بلکہ

کانوں پر نیند ماردی کہ آنکھ کھلنے سے رہی اور کان سننے سے رہے اور رعب کی وجہ سے کوئی قریب جانے سے رہا، اس لئے تین سونو سال تک وہ سوتے رہے، تو میں نے کہا آنکھ کھلی رکھی اور کان کھلے رکھے دن میں نہیں بلکہ رات میں کھلے رکھے تو ریسرچ کے دروازے کو حق تعالیٰ نے گویا کھول دیئے ہیں، مگر یہ زبان جس سے جج مینٹ کا تعلق ہے تو اس زبان پر بتیس (۳۲) دانتوں کا پہرہ لگایا اور دو پھاٹک لگادیئے تو گویا ریسرچ کے دروازے تو کھول دیئے کان بھی کھلے ہوئے آنکھ بھی کھلی ہوئی گویا ادھر اشارہ ہے کہ تحقیق اور تفتیش زیادہ ہونی چاہئے اور جج مینٹ دینے کے باب میں احتیاطی پہلو ہونا چاہئے۔

آدمی ہمیشہ حق بات کہے

تو کان دو آنکھ دو اور زبان ایک گویا اشارہ ادھر بھی ہے کہ انسان جب بات کرے تو حق بات کرے اور حق بات ایک ہی ہوتی ہے، مگر ویسے نہیں جیسے کسی خاں صاحب سے ایک آدمی نے پوچھا تھا کہ آپ کی کتنی عمر ہے؟ فرمانے لگے کہ پچاس سال، پھر دس سال کے بعد پوچھا کہ آپ کی کتنی عمر ہے؟ تو کہا کہ پچاس سال تو اس نے کہا کہ دس سال پہلے بھی پچاس سال اور ابھی بھی پچاس سال اب تو ساٹھ سال ہوگئی، تو جناب فرمانے لگے کہ مسلمان کا زبان ایک ہوتا ہے کہ مسلمان کی زبان ایک ہے کہ دس سال بعد بھی پچاس سال ہی ہے، تو ایسا نہیں ہے بلکہ حق چونکہ ایک ہوتا ہے اس لئے جج مینٹ میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔

تبلیغ اور دعوت میں فرق ہے

تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ جو اس راستہ میں نکلے ہیں انکے سامنے سب سے پہلے دعوت ہونی چاہئے "ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ" اس سے اچھی بات کس کی ہو

سکتی ہے جو اللہ تعالی کی طرف دعوت دے اسی لئے تبلیغ میں اور دعوت میں فرق کیا گیا ہے (جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات ص ۲۸/۲۷) دعوت ہر شخص کرسکتا ہے اور دے سکتا ہے کہ کوئی نماز نہیں پڑھتا تو اس سے کہے بھائی نماز پڑھو، جیسے گشت ہوتا ہے۔

گشت کی مثال

حضرت مولانا یوسف صاحبؒ فرماتے تھے کہ گشت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک تو ہوتا ہے منبع جسے پاور ہاؤس کہتے ہیں اور ایک شکل یہ ہے کہ وہاں سے مختلف مقامات پر تار پھیلا دیئے جائیں، میں تو اس کو یوں تعبیر کرتا ہوں کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ''الصلوٰۃ نور'' (فضائلِ نماز ص ۲۱/۲۰) کہ نماز نور ہے اور جب نماز نور ہے تو یہ نماز جس سے متعلق ہے وہ مصلی ہوا تو نماز پڑھنے والے مصلی کو تو آپ کھمبے کی طرح سمجھے اسے نور کا مرکز اور مصدر سمجھے، اور یہ جماعت جو نقد لینے کیلئے نکلتی ہے اس کو ایسے سمجھے جیسے تاروں کو پھیلا دیا گیا کہ ان کا ان سے کانٹیکٹ ہو جائے اسی لئے وہ پہنچتے ہیں اور پہنچنے کے بعد کہتے ہیں کہ آپ نقد چلنے کی کوشش کرے، اب لوگ طعنے دیتے ہیں الزام دیتے ہیں اور کچھ لوگ غسل کا عذر کرتے ہیں کہ کسی نے غسل نہیں کیا ہے تو غسل نہیں کیا تو اس کی شرافت کی بات کہ مسلمان ہو کر تین تین دن تک جنابت کا غسل نہیں کیا، آٹھ آٹھ دن تک جنابت کا غسل نہیں کیا، یہ تو رونے کا مقام تھا کہ مسلمان اور نجس، تو غرض یہ کہ یہ بیچارے کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کو مسجد میں لائیں اور ظاہر بات ہے کہ مسجد پہنچنا یہ دانائی کی بات ہے۔

قیامت کے میدان میں پتہ چلے گا کہ کون عقلمند ہے اور کون بے وقوف

ورنہ ایک صاحب دیہات میں رہتے تھے ان کی بکری بار بار مسجد میں جائے

اور مینگنی کردے، اب بیچارے مؤذن صاحب تنگ ہوگئے انہوں نے کہا کہ جب انتظامیہ اور کمیٹی کے لوگ بیٹھیں گے تو ہم اس میں تمہاری شکایت کریں گے، تو خیر، جب ان کا نام مؤذن صاحب نے ذکر کیا تو انہوں نے اس کو کہا کہ بھائی تمہاری بکری مسجد میں آتی ہے اور مینگنی کرتی ہے تم اسے منع نہیں کرتے، تو اس نے کہا کہ وہ تو بے وقوف ہے تم نے کبھی مجھ کو آتے دیکھا مسجد میں (سبق آموز واقعات حصہ دوم ص ۷۸) یہ عقلمندی اس کو سمجھتے ہیں کہ مسجد میں نہ جایا جائے، اور جو مسجد چلا جائے وہ بے وقوف ہے قیامت کے میدان میں پتہ چلے گا کہ کون عقلمند ہیں اور کون بے وقوف، اسی لئے ایک کالجین نے ایک طالب علم سے کہا کہ تم لوگ تو گویا مسجد کے مینڈھے ہو یعنی مسجد سے تعلق رکھتے ہو جیسے کہیں بکری ہو وہ بندھی رہے اس طریقہ سے، تو انہوں نے فوراً کہا کہ مسجد کا مینڈھا ہونا اچھا ہے اس سے کہ دنیا کے کتے بن کر رہے، واقعی طبیعت خوش کردینے والا جواب تھا۔

دوسروں کی اصلاح میں اپنا نقصان نہ کریں

تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ پہلی چیز تو دعوت ہے اور عملِ صالح کا اہتمام، حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے فضائلِ تبلیغ میں لکھا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی دوسروں کی اصلاح میں اپنا نقصان کردے، اس لئے اپنے کو بھی جانچنے کی ضرورت ہے کہ اخلاص ہے یا اس میں کچھ کمی ہے، کسی کی تحقیر تو نہیں، دعوی تو ذہن میں نہیں آیا، اچھا کوئی اور کیفیت اگر پیدا ہوجائے تو دھوکہ نہیں کھانا چاہئے کیوں کہ نفس بڑا سرکش ہے اس پاکیزہ ماحول میں آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ میری اصلاح ہوگئی، اس کے بعد جب چلّہ پورا ہوگیا وقت پورا ہوگیا گھر میں گئے تو وہی ساری الابلائیں شروع ہوجاتی ہیں وہی گھر کا ماحول

وہی محلّہ کا ماحول اب اگر آدمی میں پختگی ہے تو اس صورت میں وہ اس کو چلا سکے گا اور اپنے کو اچھائی پر جما سکے گا اور منشاء بھی یہی ہے کہ وہاں وہ اس ماحول کو جاری کرے جو سیکھ کر آیا ہے، وہ وہی ذکر کی فضا قائم کرے، وہی دعاؤں کی فضا قائم کرے، وہی دین کی محنت اور دعوت کی فضا کو قائم کرے، اگر وہ اپنا وقت پورا کرنے کے بعد پھر ان میں رنگ مل گیا تو پھر بات ہی کیا ہوئی، تو نکلنے سے پہلے بھی اخلاص کا اہتمام کرنا ہے اور نکلے ہوئے زمانہ کے اندر بھی اصول اور اخلاص کا اہتمام کرنا ہے۔

موقع شناسی سے کام لیں

اور اس کے ساتھ دیکھئے! ایک بات ذہن میں رہے کہ بزرگوں نے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ بڑے عجیب وغریب اصول ہیں، اور اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی موقع محل کو بھی سمجھے، ایک جگہ دیہات میں جماعت پہنچی گاؤں والوں نے انکی دعوت کی، تو انہوں نے کہا کہ دیکھو! ہم تو اپنا اپنا کھانا کھائیں گے اور اصول بھی یہی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا کھانا نہیں کھاتے یہ اصول کے خلاف ہے، تو ایک صاحب ڈنڈا لیکر آئے جاہلوں کی بستی ہوگی اور کہا کہ تم کو ہماری دعوت قبول کرنا ہے، یا تم ہماری عزت لینے کیلئے آئے ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسے موقعہ پر قبول کر لینے میں ہی سلامتی ہے جیسا موقعہ ہو اسے ملحوظ رکھا جائے تو موقعہ شناسی سے کام لیا جائے، جیسے حضرت مولانا عمر صاحب پالنپوریؒ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ مجھ سے مدینہ شریف میں ایک بڑے آدمی نے کہا کہ یہ سنا ہے کہ دعوت والے (تبلیغی جماعت مراد ہے) کسی کی دعوت قبول نہیں کرتے، مولانا فرمانے لگے کہ اگر آپ دعوت دینا چاہے تو میں سب سے پہلے آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں، کون کہتا ہے دعوت قبول نہیں کرتے۔

اب تو مدنی فضا ہے

اب تو خیر ماشاء اللہ مدنی فضا ہے اور استقبال کی فضا ہے، ورنہ بیچارے جو پہلے پہلے لگے تھے ان کیلئے تو بڑی صعوبتیں تھیں، میں نے زامبیا میں کہا کہ اب تو موٹر کار میں پیچھے اتنی بھنی ہوئی مرغیاں ہوتی ہیں کہ اس کو ہضم کرتے کرتے لوگ تھک جاتے ہیں، اب تو ہمارے لئے بڑی سہولت ہے وہاں تو گشت بھی کار میں ہوتا ہے، اور میں نے کہا کہ ہندوستان میں اگر کار میں گشت ہو تو وہاں تو جتنے فرصت علی خاں ہیں وہ سبھی کار میں آ کر بیٹھ جائیں گے جن کو کار میں بیٹھنا میسر نہیں ہے، تو اب تو بڑی سہولت ہے، الحمد للہ! کام عام ہو گیا ہے، لوگوں کے ذہنوں میں بات آ گئی ہے، دینی فضائیں عام ہو گئی ہیں، بلکہ اب تو وہ مقامات اٹھ رہے ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جا تا ہے اور وہاں کیفیت یہ ہے کہ سنتوں کی پیاس عام ہو گئی ہے اور وہ اپنی مادیت سے اتنے پریشان ہیں کہ فون پر بات سن کر وہ کلمہ پڑھنے کیلئے تیار ہیں، تو دنیا میں اس وقت بڑی پیاس ہے اور ان کو اس کی ضرورت ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم اصولوں کو ملحوظ رکھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بڑی برکت ہے، بعض دفعہ آدمی کو امیر کی اطاعت بڑی ناگوار بھی ہوتی ہے مگر حق یہ ہے کہ اس میں بڑی عافیت ہے۔

امیر کیسا ہونا چاہئے؟

اور امیر کی پوزیشن بھی وہی ہونی چاہئے کہ ''سید القوم خادمھم'' جسکو کہا گیا ہے، کہ وہ دوسروں کی خدمت کو ملحوظ رکھے اور جوڑنے کی کوشش کرے، بعض دفعہ ایک اچھا موقع شناس نرم امیر وہ کتنے سخت دل انسانوں کو جوڑ لیتا ہے۔

نرمی کا فائدہ

میں تو اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہم لوگ اچار کھاتے ہیں تو اس میں دیکھتے ہیں کہ جتنے بد اخلاق ہیں وہ سب جمع ہیں، مثلاً میتھی ہے اس کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ انتہائی کڑوی ہے، ادھر مرچی دیکھو تو وہ کہتی ہے کہ ہماری کڑواہٹ کی دھوم مچی ہوئی ہے، ادھر نمک دیکھو تو وہ کہتا ہے کہ ہمارا کھارا پن مشہور ہے، اور اس میں کیری (آم) پڑی ہوئی ہے وہ کچی ہے تو وہ کہتی ہے ہماری ترشی اور کھٹاس ایسی ہے کہ منہ میں رکھتے ہی پیشانی پر شکن اور بل آجائے، تو کیری کا کھٹا پن اور مرچی کی تیزی نمک کا کھارا پن اور میتھی کا کڑوا پن سب بد اخلاق جمع ہیں، وہ تو تیل ہے کہ اس نے نرمی سے سب کو جوڑ رکھا ہے کہ بگڑنے نہیں دیتا، تو اگر امیر کے اندر کیفیت یہ ہے کہ وہ نرم مزاج ہے اور متحمل مزاج ہے تو مختلف طبیعت کے لوگوں کو وہ لیکر چلے گا اور اس سے بڑی سہولت ہوگی، ساتھیوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں بعض وہ ہیں جنہیں بار بار اگربتّی (بیڑی، سگریٹ) کی ضرورت پیش آتی ہے، بعض وہ ہوتے ہیں جنہیں اور قسم کا تقاضہ پیش آتا ہے تو نرمی کے ساتھ شفقت کے ساتھ سمجھایا جائے تاکہ دوبارہ جب تشکیل ہو تو وہ نکلنے کیلئے تیار ہو جائیں، ورنہ ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھے کہ بس! اب ہم نے توبہ کی دوبارہ ہم نکلنا نہیں چاہتے، یہ شکل نہیں ہونی چاہئے، تو حکمت و محبت سے کام ہو اور اپنے آپ سے بھی غفلت نہیں ہونا چاہئے۔

ہم سے بڑا داعی کوئی نہیں

جب آپ سفر کریں گے اور دور کے سفر ہوں گے تو استقبال بھی ہوگا، زامبیا میں ایک دفعہ تذکرہ ہوا بعض لوگ چائینا اور روس دعوت دینے گئے ہوئے تھے تو وہاں کے

امیر صاحب بڑے سمجھدار تھے، انہوں نے بڑی اچھی بات کہی کہ جو لوگ یہاں سے گئے ہیں ہمارے علاقہ سے ان میں سے بعض وہ ہیں کہ آنے کے بعد مستقل ان کو سنبھالنا پڑے گا کہ جب ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ ہم چین گئے ہیں اور روس گئے ہیں تو ان کا مائن جو ہے وہ بالکل آؤف آف کنٹرول ہوگا اور ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ بس! ہم سے بڑا داعی کوئی نہیں ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ تو ہمارے شاگرد تھے اور مولانا یوسف صاحبؒ کو دعوت ہم نے دلائی تھی اور واقعۃً ایسی ہی بات ہوئی انہوں نے آنے کے بعد جو طرز اختیار کیا ہے وہ بڑا متکبرانہ اور اعتراضانہ طرز تھا۔

کونسا سفر معتبر ہے؟

تو کتنے ہی آپ سفر کریں اور ساری دنیا کا آپ سفر کریں، اور میں تو کہتا ہوں کہ مشرق سے لیکر مغرب تک اور پورب سے لے کر پچھّم کا سفر ابلیس بھی کرتا ہے، مگر سفر تو وہی معتبر ہے جس میں تقویٰ آئے عبدیت آئے، تعلق مع اللہ پیدا ہو جائے ورنہ شہرت کیا چیز ہے، وہ آج ہے کل نہیں اس کی تو کوئی حیثیت نہیں، تو انسان میں رذائل ہیں، اس لئے اپنے سے مطمئن نہ ہو نفس میں شرارتیں ہیں، خباثتیں ہیں اس لئے تہجد پڑھ لینے سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ اب ہم خواجہ باقی باللہ بن گئے ہیں یا بایزید بسطامی بن گئے ہیں، نفس کی بڑی عجیب عجیب چالیں ہیں بوڑھے ہو جانے کے بعد بھی اسکی طرف سے آدمی کو اطمینان نہیں ہوتا، تو اس وقت تو خیر جو آئے ہیں وہ بچے ہیں اور انتہائی نابلد اور اس راستہ کی گویا ابجد کی بھی انہیں خبر نہیں ہے، ان کی تو خیر ہم حوصلہ افزائی کریں اور ان کیلئے دعا کریں ان کو خوش آمدید کہیں ان کو مبارکباد دیں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں۔

علیگڈھ میں تبلیغ کی ابتداء اس طریقہ سے ہوئی

ورنہ کالج کے جو طلبہ ہوتے ہیں اکبر الٰہ آبادیؒ نے فرعون کے بارے میں بڑا اچھا شعر کہا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یعنی فرعون کو کالج کی سوجھتی تو بغیر قتل کئے ہوئے ذریت ختم ہوجاتی کہ روحانیت کا فالج پڑجاتا مگر اب الحمدللہ! وہ علیگڈھ کہ جہاں جب پہلی جماعت پہنچی تھی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے زمانہ میں تو ان ظالموں نے جماعت والوں کو کمرے میں بند کردیا سردی کی رات تھی اور پنکھا چلادیا، اب اندازہ لگایئے ان بے چاروں کے رات بھر میں کتنے درجات طے ہوئے ہوں گے، ایک تو یوپی کی سردی، پھر پنکھا چلتا رہا اور مولانا نے ان سے فرمایا تھا کہ علیگڈھ یونیورسیٹی میں اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں، باہر ہی رہیں اور دعوت دیں، چنانچہ ہوا ایسا ہی کہ جب کالج کی چھٹی ہوئی ہے تو یہ بیچارے میواتی خستہ حال ان کا حلیہ بھی دیکھنے کے لائق اور کالج کے طلبہ تو آپ جانتے ہیں ابلیس کے چھوٹے بھائی ہوتے ہیں تو ایک نے کہا اوہو! یہ تو مرزا غالب معلوم ہوتے ہیں، دوسرے نے کہا نہیں مرزا حیرت معلوم ہوتے ہیں، تیسرے نے کہا نہیں داغ دہلوی معلوم ہوتے ہیں، جس کی جو زبان میں آیا کہا، جب وہ قریب آئے تو پوچھا کہ بھائی آپ لوگ کیسے آئے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنی اصلاح کرانے آئے ہیں آپ کے پاس، تو وہ کہنے لگے کہ اصلاح تو آپ نائی کے پاس جاکر کرایئے، بال بنوانے کو بھی اصلاح کرانا کہتے ہیں، تو کہا کہ کسی نائی کے پاس کسی حجام کے پاس جاکر اصلاح کرایئے

تو انہوں نے کہا کہ خیر، آپ جو بھی کہیں ہم آپ کو کچھ سنانا چاہتے ہیں وہ سنیں اور غلطی ہو تو اس کو ٹھیک کر دے، پھر انہوں نے کلمہ پڑھا اور اس کا موٹا موٹا مطلب بیان کیا مگر وہ دل سے بات نکلی تھی ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کہ

جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اس کے بعد ان سے پوچھا کہ اچھا ذرا بتایئے ہم نے غلط تو نہیں پڑھا اس کی آپ تصحیح کر دے درست کر دے وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور بڑے شرمندہ ہوئے، بہر حال، تو ابتداء اس طریقہ سے ہوئی۔

طعن و تشنیع اس راہ کی سوغات ہیں

تو مذاق بھی ہوگا لوگ تمسخر بھی اڑائیں گے، ٹھٹھہ بھی ہوگا، رومال گر جائے گا تو لوگ کہیں گے کہ تبلیغ گر گئی، ڈاڑھی رکھیں گے تو لوگ کہیں گے کا کا (چچا) آ گئے، کوئی باوا کہے گا، کوئی چاچا کہے گا کوئی کچھ کہے گا، تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، طعنے دیئے جائیں گے، اور میں تو ایک بات کہتا ہوں کہ جو طعنہ دیتے ہیں وہ ابولہب اور ابوجہل کی سنت ادا کر رہے ہیں، ان کو سمجھنا چاہئے کہ ہم اس طریقہ پر چل رہے ہیں جو کام ابوجہل اور ابولہب اور ولید بن مغیرہ کا تھا، اور جن لوگوں کا مذاق اور ٹھٹھہ ہو وہ یہ سمجھ لے کہ یہ انبیاءِ کرامؑ اور خاص طور پر نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، تو اس راستہ کی یہ سوغات اور تحفے ہیں تو دین کے راستہ میں یہ چیزیں پیش آتی ہیں، مگر انجام اس کا بڑا بہتر ہوگا۔

دو کام ہیں، ایک نبیوں والا، دوسرا بنیوں والا

تو خلاصہ یہ نکلا کہ علم کے ساتھ نبوت کا جوڑ ہے، اور اسے نبیوں والا کام

کہا جاتا ہے جیسے اس روز میں نے کہا کہ پیسوں کا جمع کرنا اور مال کا جمع کرنا یہ بنیوں والا کام ہے، اور یہ حرکت ذرا بدل دے تو وہی نبیوں والا کام ہوگا، تو نبیوں والا کام اعمال پر محنت ہے اور بنیوں والا کام مال پر محنت ہے، تو یہ آخرت بنانے والی محنت ہے۔

اس راستہ میں بھی علم کی ضرورت ہے

اس وجہ سے اس راستہ میں بھی علم کی ضرورت ہے، تو فضائل کا شوق انسان کو عمل پر لائے گا اور پھر وہ علماء سے مسائل پوچھ پوچھ کر اور سیکھ کر اس پر عمل کریں گے اور اس اعتبار سے اس کے لئے کامیابی کی شکل ہوگی۔

اس راستہ کا اصل سرمایہ دعا ہے

تو بہرحال، یہ نکلنا انتہائی درجہ مفید ہے خود اپنے لئے بھی اور دوسروں کیلئے بھی مگر شرط یہ ہے کہ ہم اصول کی پابندی کریں، اور اس راستہ کا سب سے بڑا سرمایہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم دن بھر محنت کریں گے اور رات بھر امت کیلئے دعائیں کریں گے، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلنے کے بعد محنت اور جانفشانی کی صورت میں جو دعائیں ہوتی ہیں امید ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کریں

تو بہرحال، یہ جماعت اس بستی میں آئی ہے شفقت کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ نوعمر بچے ہیں، یہ نہیں کہ تربیت یافتہ ہیں کہ باقاعدہ تربیت ہوئی ہو، کوئی تاجر کا لڑکا ہے تو کوئی آجر اور ملازم کا لڑکا ہے کوئی کالج میں پڑھتا ہے تو کوئی فرصت علی خاں ہے تو وہ اپنے شوق اور جذبہ میں نکلے ہیں ورنہ کسی کو کرکٹ کا کسی کو ہاکی کا کسی کو فٹ بال یا والی بال کا شوق ہوتا تو وہ ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ

کرآتے ؟وہ تو کلبوں کی دنیا ہوتی عربی میں کتے کو کلب کہتے ہیں تو وہاں جا کر کیا کیا اجالے کرتے وہ ظاہر ہے۔

تو غرض یہ کہ ایسے دور میں اور اس نوعمری میں نکلنا بڑی خوشی کی بات ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اصولوں کو ملحوظ رکھیں اور ان کے جو سرپرست ہیں ان کی تربیت کرنے والے ہیں انہیں چاہئے کہ بہت شفقت سے اور محبت سے انکے ساتھ پیش آئیں تاکہ وہ گھر جاکر اس راستہ میں نکلنے سے توبہ نہ کریں، بلکہ دوسری دفعہ جب موقع آئے تو فوراً تیار ہو جائے، تو نرمی بھی ہو اور ان کا تھوڑا لحاظ بھی کیا جائے تو انشاء اللہ اس میں بڑی خیر ہوگی۔

علم اور نبوت دونوں میں بڑی مناسبت ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ پہلے علم کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد پھر نبوت کا تذکرہ ہے اور دونوں میں بڑی مناسبت ہے، تو ضرورت ہے کہ ہم ان ساری حقیقتوں کو سمجھیں، اور اپنی زندگیوں میں صحیح تبدیلی لائیں جو حقیقت میں منشاء ہے اس نکلنے کا کہ انسانی زندگی میں دین آجائے ، اللہ پاک عمل کی توفیق نصیب فرمائیں، اور زیادہ سے زیادہ اخلاص نصیب فرمائیں، اور اپنے کو سب سے چھوٹا سمجھنے اور دوسرے کی تعظیم وتوقیر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور صحیح معنی میں دین کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائیں، آمین۔

درس نمبر (۱۲)

بعداز خطبہ

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم

لقد کان فی یوسف واخوتہ اٰیٰت للسائلین(یوسف،آیت:۷)☆

صدق اللہ العظیم.

دنیامیں انسانوں کے درجات مختلف ہیں

محترم حضرات! گذشتہ کل یہ بات ذکر کی تھی کہ کبھی حق تعالیٰ شانہ بندوں کواپنی رحمتِ خاصہ سے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اسے اجتبیٰ اور جذب کہتے ہیں،اور کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ بندہ چلتا رہتا ہے کوشش کرتا رہتا ہے بعد میں اس پر قبولیت مرتب ہوتی ہے، قبولیت بھی ایک ولایت کی ہے اور ایک نبوت کی ہے،اور میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ ولایت کی مثال ایسی ہے جیسے ڈگری، اور نبوت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی منصب اور پوسٹ (امداد الباری شرح بخاری ج۲ص۴۳۳) وہ انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے کہ انسان کوشش کر کے نبوت حاصل کرلے، البتہ ولایت ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی کوشش کر کے حاصل کرسکتا ہے،اوراسکے بھی اسباب ہیں یعنی جن چیزوں سے اور جن کاموں کے کرنے سے اور جن کاموں سے بچنے سے بزرگی ملتی ہے انسان ان ذرائع کو اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالی کی طرف سے اس پر ولایت مرتب ہوجاتی ہے، اس کے بعد ایک بات یہ ذہن نشیں رہے کہ دنیا میں انسانوں کے درجات مختلف ہیں،اور اللہ جل جلالہ کے معاملات بھی انسانوں کے ساتھ مختلف ہیں، کچھ وہ بندے ہیں کہ جن کی معمولی نیکی

یا سیدھا پن ان کی نجات کیلئے کافی ہوجاتا ہے، کچھ اور ہے جن کی معرفت بڑھی ہوئی ہے توان کو مزید نیکی کی ضرورت ہے، اور جن کی معرفت اور بڑھی ہوئی ہے تو ان کا کام اور بھی بڑھا ہوا ہے، تو جیسی جیسی استعداد، لیاقت، اور صلاحیت بڑھتی جائے گی اسی اعتبار سے ذمہ داری اور اسی اعتبار سے کام کا بوجھ بھی بڑھتا جائے گا۔

ایک علمی اشکال اور اس کا آسان حل

یہی وجہ ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے باب میں قرآنِ پاک میں چودھویں پارے میں ارشادِ ربانی ہے کہ'' شاکراً لانعمه اجتبه وهده الی صراط مستقیم (نحل،آیت: ۱۲۱) ابراہیمؑ اپنے رب کی نعمتوں کے شکر گذار اور شاکر بندے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں منتخب فرمایا چن لیا، اور انہیں صراطِ مستقیم کی رہنمائی فرمائی، تو سوال یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے انہیں منتخب فرمالیا، چن لیا، تو چن لینا خود ہی صراطِ مستقیم کی ہدایت ہے، خود ہی اچھے راستہ کی رہنمائی ہے، چن لینے کے بعد قبول فرمالینے کے بعد صراطِ مستقیم کی ہدایت کیا مطلب؟ اس کو آپ ایسے سمجھیں جیسے مثلاً ایک آدمی ہے اس نے وضو کیا اور وضو کر کے طہارت حاصل کی پاکیزگی حاصل کی، مگر اس کے بعد پھر وہ دعا کرتا ہے'' اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله اللهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهرین ،،(ابوداؤد ج۱ص۲۳،ترمذی ج۱ص۱۸) کہ اے اللہ! یہ جسمانی پاکی تو میں نے حاصل کر لی ہے، لیکن گناہوں کی وجہ سے میری روح پر جو آلودگی آچکی ہے اور اثرات آچکے ہیں تو آپ مجھے توابین میں سے بنائیے توبہ کرنے والا بنائیے تاکہ جسم کے ساتھ روح بھی پاک ہوجائے، اور ظاہر کے ساتھ باطن بھی پاک ہوجائے'' واجعلنی من المتطهرین ،،اور مجھے پاکی میں کوشش کرنے والا اور سعی کرنے والا

بنایئے، تو اب سوال یہ ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کر چکا، اور اس لائق ہوا کہ خدا تعالی کے دربار میں حاضر ہو اور کھڑا ہو، تو اب اس دعا کا کیا مطلب؟ اگر پاک نہیں ہے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ وضو کر لیا اب یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ پاک نہیں ہے، اور اگر پاک ہو چکا ہے تو پھر پاکیزگی کی دعا کا کیا مطلب؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شئی کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ اس کی صورت ہی ہے، جب آپ کوئی صورت اختیار کریں گے تو اس میں حقیقت آجائے گی، جیسے مثلاً حدیثِ پاک میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ روؤ اللہ تعالی کے ڈر سے اس کے خوف سے اس کی عظمت سے، اور رونا نہ آئے تو رونے کی شکل بناؤ (ابن ماجہ ص ۳۱۹) تو رونے کی شکل ایک صورت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت رونے کی حقیقت سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کے مناسب صورت اختیار کی گئی، یہ نہیں فرمایا کہ رونا نہ آئے تو ہنسوں، اس لئے کہ ہنسنے کی صورت میں اور رونے کی حقیقت میں بہت دوری ہے، پھر ایک آنکھوں کا رونا ہے، اور ایک قلب کا رونا ہے، تو رونے کی صورت اختیار کرے گا تو یہ حقیقت سے بہت قریب پہنچانے والی چیز ہے، تو یہاں بھی یہی شئی ہے کہ جب وضو کر کے پاک ہو گیا تو گویا رب العلمین سے عرض کر رہا ہے کہ الہ العلمین! جہاں تک جسمانی پاکی کا تعلق تھا، ہاتھ پیر اور دوسرے اعضاء کو پاک کرنے کا تعلق تھا تو وہ پاکی تو میں حاصل کر چکا، مگر اس پاکی کا حقیقی اثر اندر پہنچ جائے اور حقیقی پاکی حاصل ہو جائے جو آپ کے دربار کے شایانِ شان ہے، ورنہ باطن تو ناپاک ہو اور ظاہر صرف پاک ہو تو آپ کے یہاں وہ پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے اس صورتِ پاکی میں پاکیزگی کی حقیقت پیدا فرما دے اس کی میں آپ سے دعا کرتا ہوں، گویا اچھی صورت لیکر حاضرِ دربار ہوا ہوں اور اچھی صورت میں حقیقت کا رنگ بھرنا یہ آپ کے دستِ قدرت کی بات ہے، اچھی صورت کو اچھی حقیقت

عطافرمادینا یہ آپ کی قدرت ورحمت کی بات ہے، آپ مجھے یہ نصیب فرمادیں، جب آپ یہ سمجھ گئے، تو حضرت ابراہیمؑ کے باب میں یہ فرمایا کہ ''اجتبـــــہ'' اللہ تعالی نے انہیں منتخب فرمالیا، اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالی نے انہیں رہنمائی عطافرمائی، تو رہنمائی کے بھی درجات ہیں، ایک رہنمائی یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی ہے وہ بادشاہ کے محل تک جانا چاہتا ہے بادشاہ تک پہنچنا چاہتا ہے تو رہنمائی کا ایک درجہ یہ ہے کہ اس راستہ پر اور اس سڑک پر پڑجائے جو بادشاہ سلامت کے محل تک پہنچتی ہو ایک رہنمائی تو یہ ہے، دوسری رہنمائی یہ ہے کہ بادشاہ کے محل پر پہنچنے کے بعد وہاں کسی شخص کی رہنمائی میں یا کسی شخص کے ساتھ وہ اس راستہ پر پڑجائے جو بادشاہ کا خاص رہنے کا کمرہ ہے دوسری قسم کی رہنمائی یہ ہوئی، مگر بادشاہ کے روم کے قریب پہنچنے کے بعد پھر وہاں ایک دربان ہے اور نگران ہے کہ آپ اسکی اجازت کے بغیر اندر داخل نہیں ہوسکتے تو ایک رہنمائی یہ ہے کہ آپ اس شخص کے ساتھ ہولے جو آپ کو روم کے اندر اور بادشاہ تک پہنچادے، یہ ایک مثال ہے سمجھانے کیلئے، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ انسان کا راہ پر پڑنا ایک تو وہ ہے جس میں اسکے خیالات اور عقائد صحیح ہوجائے، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کے اعضاء حق تعالی کی مرضی کے مطابق چلنے لگے، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کے قلب میں درستگی اور نیکی پیدا ہوجائے، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ قلب کبھی غیر کی طرف متوجہ ہی نہ ہونے پائے، ہمیشہ قلب کی نظر حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ عالی ہی پر رہے، تو حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو ہدایت عطافرمائی اور منتخب فرمالیا، اور منتخب فرمانے کا حاصل ہے کہ مقبول بنایا، اور مقبول بناکر ہدایت کے وہ سارے درجات طے کروادیئے کہ جس میں ان کا عقیدہ، جس میں ان کے اعضاء، ان کے افعال، ان کے اعمال، ان کا قلب وخیال ساری چیزیں حضرتِ حق کی مرضی میں فنا ہوگئی، اور وہ اس کا مصداق ہوگئے کہ ؎

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے
اور تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

ہر طرف وہی جلوہ نظر آنے لگا جدھر دیکھتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور کبریائی نظر آتی تھی یہ درحقیقت اس محل میں اس کی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں منتخب فرمایا اور صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائی۔

ھدًی للمتقین کا مطلب سمجھ لے

یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآنِ کریم کے باب میں ارشاد ہے کہ ''ھدی للمتقین ''(بقرۃ، آیت: ۲) قرآنِ کریم متقین کیلئے ہدایت ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ متقی کہتے ہی ہیں ہدایت یافتہ کو، جو ہدایت یافتہ نہ ہو اور جس نے ہدایت نہ پائی ہو وہ متقی نہیں کہلاتا ہے، تو متقین کیلئے ہدایت کا کیا مطلب؟ اس کا جواب تفسیر کی کتابوں میں یہ دیا ہے کہ متقین کیلئے ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ جو متقی بننا چاہتے ہیں ان کے حق میں یہ ہدایت ہے، (الافاضات الیومیہ جلد دہم ملفوظ ۲۶۳) گویا جو مآل کے اعتبار سے اور فیوچر کے اعتبار سے متقی بننا چاہتے ہیں ان متقی اور تقویٰ کی خواہش رکھنے والوں کیلئے قرآنِ کریم راہ نما ہے، اور اگر کوئی شخص تقویٰ اختیار کرنا ہی نہیں چاہتا اور اپنی غلط زندگی اور غلط لائف کو چھوڑ کر سیدھے راستہ پر آنا ہی نہیں چاہتا تو قرآنِ کریم ایسے شخص کے حق میں ہدایت نہیں ہے، اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بیمار ہو اور بیمار بھی بہت مہلک مرض کا ہو، اس کے بعد اس نے کسی اعلیٰ ترین ڈاکٹر کا انتخاب کیا ہو کہ جو بہت ہائے ڈگری لئے ہوئے ہو اور اس کو دِکھلایا ہو، ڈاکٹر نے اسے اچھی طرح سے چیک کیا ہو اور اس کے لئے اچھے قسم کی، اعلیٰ قسم کی، نفیس قسم کی دوا تجویز کی ہو، اور ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ تمہیں کچھ چیزوں

سے پرہیز کرنا ہے مثلاً کھٹاس سے بچو، ٹھنڈے سے بچو، تیل اور چکنی چیزوں سے بچو، اور یہ بتا دیا کہ صبح میں ایک خوراک لے لو، دوپہر میں ایک خوراک لے لو، اور شام میں ایک خوراک لے لو، مگر اعلیٰ سے اعلیٰ ڈاکٹر کو دکھلانے کے بعد اس کی تجویز کردہ دوا حاصل کرنے کے بعد کوئی شخص نہ پرہیز کرنا چاہتا ہو نہ دوا کو اس کے وقت پر استعمال کرنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں اگر شفا نصیب نہ ہو تو نہ ڈاکٹر کا قصور ہے اور نہ اس نسخہ اور دوا کا قصور ہے۔

امت بیمار ہے اور آپ ﷺ طبیب ہیں

ٹھیک اسی طریقہ سے ساری امت بیمار ہے اور نبی کریم ﷺ اس امت کے حق میں حکیم تجویز ہوئے ہیں اور آپ سے بڑھ کر حکیم اور دانا کون ہوسکتا ہے، تو امت مریض ہے اور نبی کریم ﷺ طبیب ہے امت کے ڈاکٹر اور روحانی حکیم ہے، اور حضور ﷺ نے امت کے مناسب جو نسخہ تجویز فرمایا ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے بھیجا ہوا نسخہ ہے، تو اس میں امت کو بتلایا کہ تین چیزوں سے بچنا ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ عام گناہوں سے بچو، چھوٹے ہو بڑے ہو، دوسرے یہ کہ بدعات سے بچو کہ وہ چیزیں جن کی دین میں اصل نہیں ہے ایسی چیزیں دین میں ایجاد مت کرو، اور تیسری چیز یہ کہ تمام کفریات وشرکیات سے بچو، تو تین چیزوں سے پرہیز ضروری ٹھہرا، اور نماز کے متعلق فرمایا کہ یہ نسخۂ شفاء ہے، اور اس کا ایک ڈوز اور اس کی ایک خوراک صبح لے لی جائے، دوسری خوراک اس کی زوال کے بعد لے لی جائے، تیسری خوراک اس کے دو گھنٹے بعد لے لی جائے مثلاً دو مثل پر، اور چوتھی خوراک سورج ڈوبنے پر لے لی جائے، اور پانچویں شفقِ احمر کے ختم پر لے لی جائے، اور خدا ہمت دے تو رات کے اخیری حصہ میں ایک خوراک اور لے

لے، اور یہ ایسا نسخہ ہے کہ درمیان میں بھی جب چاہے استعمال کرلے، تو اگر اس طرز پر اسے استعمال کیا پرہیزوں کے ساتھ تو پھر خدا تعالیٰ وہ صحت وشفا عطا فرمائیں گے جنت کی زندگی کی شکل میں کہ کوئی چیز مضر نہیں ہوگی کہ ’’ ولهم فيها مايشتهون ‘‘(حم السجدة، آیت: ۳۱) ہر رغبت کی چیز آدمی وہاں جا کر کھا سکے گا، پھر وہاں نہ پرہیز کا سوال ہے، نہ بچنے کا سوال ہے، دوامی قسم کی صحت وشفا حق تعالیٰ اسے نصیب فرمائیں گے۔

نعمت کا لفظ قرآنِ کریم میں ۱۴/ معنی میں استعمال ہوا ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ ہدایت کے درجات ہیں، اور آگے نعمت کا لفظ ہے، علامہ سیوطیؒ نے تفسیرِ اتقان میں لکھا ہے کہ پورے قرآنِ کریم میں نعمت کا لفظ چودہ معانی میں استعمال ہوا ہے، چونکہ مختلف مقامات پر نعمت کا لفظ آیا ہے، تو کہیں رحمت کے معنی میں ہے، کہیں نبوت کے معنی میں ہے، کہیں رسالت کے معنی میں ہے، کہیں دنیوی نعمت کے معنی میں ہے، کہیں اسلام کے معنی میں ہے، کہیں مادی نعمتوں کے معنی میں ہے، اور کہیں علم ومعرفت کے معنی میں ہے تو جیسا موقع ہے سیاق وسباق کے اعتبار سے اگلی پچھلی آیت کے مضمون کے اعتبار سے اس کو فٹ اور منطبق کیا جائے گا، تو پورے قرآنِ کریم میں نعمت کا لفظ چودہ معانی میں استعمال کیا گیا ہے، اس مقام پر نعمت کی تمامیت کا ذکر فرمایا کہ ’’ويتم نعمته عليك وعلىٰ آل يعقوب كما اتمها على ابويك ‘‘تو اتمامِ نعمت کا ذکر کیا۔

اکمالِ نعمت اور اتمامِ نعمت کا مطلب

دیکھئے! دو چیزیں ہیں، ایک ہے اکمالِ نعمت اور ایک ہے اتمامِ نعمت، دونوں چیزوں کا دقیق (باریک) علمی فرق آپ سمجھ لے، وہ یہ ہے کہ کمالیت کا مطلب یہ

ہے کہ کسی شئی سے غرض پوری ہو جائے، کمال کا مفہوم یہ ہے، اور تمام کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے سارے اجزاء پورے ہو جائے، اس کو آپ ایک مثال سے سمجھے، مثلاً ایک شخص کھانا کھانے بیٹھا کھانے کا مقصود اور غرض یہ ہے کہ اسکا پیٹ بھر جائے اور بھوک اس کی دور ہو جائے، یہ غرض اس کی حاصل ہوگئی دسترخوان پر بیٹھنے کے بعد، مگر سامنے اس کی تشتری میں ابھی کچھ کباب باقی ہے، کچھ روٹی باقی ہے، کچھ مرغی باقی ہے، کچھ سالن باقی ہے، تو پیٹ کا بھرنا اور بھوک کا دور ہونا یہ تو غرض ہے اس کو کہا جائے گا کمال، چاہے دسترخوان پر کھانے کے اجزاء باقی ہوں، اور تمام کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دسترخوان پر ہے جناب اس کو صاف کر جائیں کہ کوئی جز باقی نہ رہے، یہ نعمت کی تمامیت کہلائے گی، تو پیٹ بھر جائے یہ ہے کمالیت، اور دسترخوان صاف ہو جائے یہ ہے تمامیت۔

اور تمامیت کا تعلق ہے اجزاء سے، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب تیس روزے پورے کئے تو علمِ الٰہی میں یہ تھا کہ وہ چلہّ پورا کریں۔

نوٹ۔ یہ درس یہیں تک سی، ڈی میں محفوظ تھا آگے کا حصہ باوجود کوشش کے نہیں مل سکا۔

درس نمبر ۱۳

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم،اما بعد

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم

بسم الله الرحمن الرحیم

لقد کان فی یوسف واخوته ایٰت للسائلین☆ اذقالوا لیوسف واخوه احب الی ابینا منا ونحن عصبة ان ابانا لفی ضلل مبین ☆

صدق الله العظیم

قصۂ یوسف بھی آپ ﷺ کی نبوت کی ایک علامت ہے

بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ یوسف علیہ السلام اوران کے بھائیوں میں پوچھنے والوں اورسوال کرنے والوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں، نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اس واقعہ کو اتنی تفصیلات سے کوئی نہیں جانتا تھا، پچھلی کتابوں میں جوتذکرہ ہے وہ بھی اتنی تفصیلات کے ساتھ نہیں تھا، توبغیر کسی کمی بیشی کے اصلِ واقعہ کو بیان کرنا یہ حق تعالیٰ کے بتلانے اوراس کی وحیِ مبین کا اثر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لوگوں کواس کی خبردی، تو یہ واقعہ بھی نبی کی نبوت اور رسالت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے، اوراس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کا تعصب تھا کہ وہ تسلیم نہیں کرتے تھے لہذا ان پراس میں تنبیہ بھی ہے کہ تمہارے سامنے ایسے ایسے واقعات اورحقائق آپ کی نبوت کے کھول کھول کر بیان کئے جارہے ہیں پھرتم اس کونہیں مانتے، اورواقعہ واقعی بڑا عجیب ہے۔

محبت ایک فطری چیز ہے

پسِ منظر اس کا یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے حضرتِ یعقوب علیہ السلام کو بڑی محبت تھی اور یہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ محبت ایک فطری اور طبعی چیز ہے خاص طور سے اولاد کے ساتھ جانوروں میں بھی حق تعالیٰ شانہ نے یہ وصف رکھا ہے کہ اپنی اولاد سے ان کو بھی محبت ہوتی ہے، حتی کہ سانپ جیسی مخلوق کو اور شیر جیسی مخلوق کو بھی اپنی اولاد سے ایک تعلق ہوتا ہے، ہاتھی کو دیکھئے تو اسے اپنی اولاد سے تعلق، گینڈے کو دیکھئے تو اسے اپنی اولاد سے تعلق، میں نے افریقہ کے جنگلات میں دیکھا کہ ان کو کوئی خطرہ معلوم ہوتو بڑے بڑے ہاتھی اپنے بچوں کو درمیان میں لے لیتے ہیں اور خود اطراف میں کھڑے ہوجاتے ہیں، اب ان کے بچہ بھی پاڑے سے کم نہیں ہوتے ہیں، مگر یہ کہ بہرحال ہیں تو بچے تو اولاد کے ساتھ محبت اور لگاؤ ہونا یہ ایک طبعی اور فطری چیز ہے، اور اولاد بھی ایسی ہو جس میں شرافت اور نبوت کے آثار ہو، کمالات اور خوبیاں جن کے چہرے سے جھلکتی ہو اور جن کا چہرہ روشن مستقل کی غمّازی کرتا ہو، اور پھر نگاہ ہو حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے پیغمبر کی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ چھوٹے بھی تھے، تو چھوٹا پن ایک مستقل شفقت کی وجہ ہے، اور باجمال تھے وہ خود ایک مستقل رغبت کی وجہ ہے، اور کمالاتِ نبوت کا عکس تھا جو صاف جھلک رہا تھا اس لئے وہ بھی ایک مستقل وجہ تھی، تو کئی وجوہ ایسی تھیں کہ جس کی بناء پر ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو بڑی محبت تھی، اور یہ محبت سبب بن گئی بھائیوں کے حسد کا۔

شیطان کی چالیں بڑی عجیب ہوتی ہیں

دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا تھا کہ میں پہاڑ پر

ہوں اور اس پہاڑ پر دس بھیڑیئے ہیں اور یوسف ہے اور یوسف پر بھیڑیئے حملہ آور ہیں، حق تعالیٰ نے خاص عنایت فرمائی مگر حضرت یوسف علیہ السلام زمین میں غائب ہو گئے، تو اس خواب سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو تشویش تھی اس لئے کہ پیغمبروں کا خواب وہ ہمارے آپ کی طرح اگڑم بگڑم (فضول) تو ہوتا نہیں ہے کہ اناپ شناپ کھایا ہو اس کی وجہ سے صرف تخیلات ہو، تو وہاں ایسی شکل نہیں ہوتی ہے، اور ادھر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی خواب دیکھا تھا، تو محبت تھی اندیشہ بھی تھا، اور اس محبت کی وجہ سے بھائیوں میں حسد کی ایک کیفیت پیدا ہوئی، اور اس کیفیت کی وجہ سے بھائیوں نے ایک پروگرام بنایا، ہمیشہ ایک بات ذہن میں رہے کہ شیطان کی چالیں بڑی عجیب ہوتی ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عنوان تو ہوتا ہے بھلائی کا اور دین کا مگر طریقہ غلط اختیار کیا جاتا ہے، جیسے مثال کے طور پر ایک جگہ مسجد ہے لوگ اس میں نماز پڑھ رہے ہیں اور اسی طرح اس کے ساتھ مدرسہ بھی ہے جس میں باقاعدہ دین کی تعلیم ہو رہی ہے یا کہیں دینی نظام کے تحت باقاعدہ کام ہو رہا ہے، تو شیطان کسی مسلمان کے دل میں یہ وسوسہ نہیں پیدا کرے گا کہ دینی کام ہو رہا ہے اس کو مٹادو ختم کردو، ہاں! عنوان کوئی ایسا اختیار کرے گا جو سبب بن جائے گا اس کام کے فساد کا مثلاً یہی عنوان کہ مسجد کا نظام ٹھیک نہیں ہے لہٰذا منتظمین سے بھڑنے کے بعد ان میں انقلاب برپا کرو اور نتیجۃً مسجد کی ویرانی کا باعث، مدرسہ کی ویرانی کا باعث، حالات میں انقلاب کا باعث، تو شیطان جو ہے وہ مختلف انداز سے اور حکمت سے انسان کے پاس آتا ہے، تو یہاں بھی یہ پیغمبر زادے تھے پیغمبر کی اولاد بھلا وہ کسی ایسی چیز کا قصد تو کر نہیں سکتے تھے، تو یہاں بھی ان کا مقصود اچھا تھا، مگر اس کے نیچے جو کام ہوا ہے اس میں بلاشبہ شیطانی وساوس کو دخل ہوا اور ان سے غلطی ہوئی، ان کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ ہم ایک جماعت ہے پوری کی پوری اور باپ کی نصرت ہم کر سکتے ہیں،

خدمت ہم کر سکتے ہیں، دفاع کے لئے ہم تیار ہیں، اور ہر قسم کی ضروریات ہم سے وابستہ ہیں، تو ہماری ایک حیثیت ہے طاقت ہیں قوت ہیں اور ہم اچھی خاصی ایک جماعت ہے، جب اتنی منفعتیں ہماری ذات سے متعلق ہیں اور اتنے فوائد ہم سے وابستہ ہیں، تو باپ کو چاہئے کہ ہم بڑوں سے شفقت و محبت اور لگاؤ کا تعلق زیادہ رکھے، بنسبت چھوٹے یوسف کے کہ وہ ابھی ننھے منھے ہیں ان کی حیثیت ہی کیا ہے ہمارے سامنے، تو ہم جتنے نافع ہیں وہ اتنے نافع نہیں ہے، بلایا کے حق میں ہم جتنے دافع ہیں وہ اتنے دافع نہیں ہیں اور پھر ان کی طرف لگاؤ ہے یہ چیز ہمارے لئے تکلیف دہ ہے اور انہوں نے یہ کہا ''ان ابانا لفی ضلل مبین'' کہ ہمارے والد اس معاملۂ خاص میں کھلی غلطی کے اندر گویا مبتلا ہیں، یہاں ''ضـــلـــل'' کا ترجمہ گمراہی نہیں ہوگی، اس لئے کہ پیغمبر کو گمراہ سمجھنا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔

برادرانِ یوسف اعلیٰ درجہ کے مؤمن تھے

اور یہ طے ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے سب مومن تھے اور اعلیٰ درجہ کے مؤمن، کچھ غلطیاں ان سے بیشک ہوگئی مگر پھر معافی مانگی، استغفار کیا، تو وہ پیغمبر تو نہیں تھے قوی قول یہی ہے، مگر ان کے شرفِ صحابیت میں کوئی دورائے نہیں۔

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

مگر اس کے ساتھ انسان تھے بشریت بھی تھی اس وجہ سے انکی طبیعت میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ چیز ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا اس باب میں انہوں نے ایک نظام بنایا کہ کوشش یہ کی جائے کہ یوسف ہی کو ختم کر دے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، قصہ ہی ختم

ہو جائے مگر اس موقع پر بعضوں نے کہا کہ یہ کام مناسب نہیں ہے، اتنا بڑا جرم کہ بھائی کو مار دیا جائے اور پھر یہ باپ کی دل آزاری کا سبب ہے کہ وہ پریشان ہو اور ساتھ پھر بدنامی بھی ہے، تو غرض یہ کہ اس رائے کو پسند نہیں کیا گیا، ان میں جو بڑے تھے جن کا نام شمعون ہے حافظ ابنِ کثیرؒ نے حضرت مجاہد کا قول نقل کیا کہ شمعون بڑے بھائی تھے، بعض اربابِ تفسیر لکھتے ہیں کہ روبیل نامی ایک شخص تھے وہ بڑے بھائی تھے، اور عام کتبِ تفاسیر میں اور خود ابنِ کثیرؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ بڑے بھائی یہودا تھے، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ یہودا نے یا شمعون نے یا روبیل نے یہ کہا جیسا کہ اقوال مختلف ہیں کہ یہ کام ٹھیک نہیں اگر یوسف کو باپ سے ہٹانا ہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ ان کو کسی مقام پر لے جا کر کنویں میں ڈال دے یا کوئی اور شکل اختیار کرے، جان سے مارنا یہ مناسب نہیں ہے، خیر، اس وقت انہوں نے یہ طے کیا کہ یوسف کو باپ سے ہٹا دیا جائے۔

وتكونوا من بعده قوما صالحين

لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کی رہنمائی دیکھئے قرآن کہتا ہے انہوں نے آپس میں یہ کہا کہ ''وتكونوا من بعده قوما صالحين ''اور اس کے بعد تم قومِ صالح بن جاؤ گے، قومِ صالح بننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہے تو گناہ کی بات مگر بعد میں ہم توبہ کر لیں گے، اور اس کے نتیجہ میں ہم صالحیت کے مقام پر رہیں گے، اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، گویا غلطی سے تقویٰ ٹوٹے گا اور توبہ سے صلاح و درستگی پھر عود کر آئے گی، یا یہ مطلب ہے کہ جب یوسف کو ہم باپ سے ہٹا دیں گے تو باپ کی توجہ بجائے حضرتِ یوسف کے ہم لوگوں پر رہے گی، اور باپ پیغمبر ہے اور بڑے صاحبِ کمال پیغمبر ہیں اور پیغمبر کی نظرِ کرم جب ہم پر ہو گی تو ہمارے صالح بننے میں کوئی شبہ نہیں، اس سے سلوک

کا ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اگر شیخ کی نگاہِ کرم اور نظرِ کرم کسی مرید پر ہو تو اس کے صالح بننے اور آگے ترقی کرنے کی بڑی امید ہوتی ہے کہ جو بزرگوں کا منظورِ نظر ہوتا ہے اسکے لئے ترقی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالی کی محبت و معرفت ان کے قلب میں ہے اب وہ جس کو چاہیں تو اس پر حق تعالیٰ کا کرم ہو جاتا ہے اور اس کا حال پھر درست ہونے لگتا ہے، تو اس سے تصوف کے ایک مسئلہ کی یہ اصل نکلی کہ شیخ کی توجہ کو اصلاحِ حال میں دخل ہے کہ اگر وہ متقی اور متبع سنت شیخ ہیں تو اس کی توجہ سے اور اس سے تعلق کیوجہ سے حالت میں تبدیلی کی امید ہے کہ انسان صحیح راہ کی طرف آئے، تو بھائیوں نے یہ کہا کہ باپ کی توجہ ہو گی ہماری طرف اور باپ نبی ہے ان کی نظرِ شفقت ہم پر ہو گی تو ہمارا حال بھی ٹھیک ہو جائے گا تو گویا پھر ہم دوبارہ صالح ہو جائیں گے کہ ''رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی،، ایک گڑبڑی ہو گئی بیچ میں پھر صلح واپس اپنے مقام پر باقی۔

غالب پر آزادی غالب تھی

وہ غالب کے متعلق ہے آزاد آدمی تھا بہت، غالب کا نام تو سنا ہو گا بڑے مشہور شاعر تھے، ایک صاحب ان کے یہاں آئے، غالب نے ان کے سامنے شراب پیش کی انہوں نے کہا میں تو نہیں پیتا، اب ذرا اس کی آزادی دیکھئے، ان لوگوں کی آزادی بھی کیسی، وہ کہنے لگا کہ کسی دن بھی نہیں پیتے، کہا نہیں، غالب نے پھر کہا رمضان کے دن میں بھی نہیں پیتے، کہا نہیں، کہا عید و بقرعید پر بھی نہیں پیتے، کہا نہیں، تو وہ تو آزاد آدمی تھا جب ان کو وظیفہ ملتا تھا تو اس سے شراب کی بوتلیں خرید کر لاتے اور اس کو الماری میں رکھتے تھے بیوی نے کہا کہ مہینہ ختم ہوتا ہے تو کھانے کا ٹھکانہ نہیں رہتا، کھانے کے لالے پڑتے ہیں، اور تم شراب کی بوتلیں لا کر رکھتے ہو، تو غالب کہنے لگا کہ روزی کا وعدہ تو اللہ

تعالی نے کیا ہے شراب کا وعدہ نہیں کیا ہے اس سے تو منع کیا ہے اس کا انتظام تو ہمیں خود کرنا پڑتا ہے، آزاد آدمی تھے، ویسے بڑے شاعر تھے مگر وہی آزادی کی بات، تو مصرع کا حاصل یہی ہے کہ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ تو خیر بعض دفعہ کچھ کیفیت ایسی ہوتی ہے۔

ایک خاں صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ کے زمانہ میں ایک خاں صاحب تھے، وہ کہتے تھے جنت میں جانا کونسی بڑی بات ہے، ایک ہاتھ ادھر مارا ایک ادھر اور جنت میں پہنچ گئے، اور واقعی ایسا ہی اتفاق ہوا کہ کوئی جہاد پیش آیا تو اس میں شریک ہوئے اور شریک ہونے کے بعد شہید ہوئے، تو اللہ تعالی سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ گویا جنت میں پہنچے ہوں گے، تو غرض یہ کہ بعض لوگوں کے معاملات عجیب ہوتے ہیں۔

قبولیت کیلئے قابلیت بھی ہونی چاہئے

تو یہاں انہوں نے یہ بات کہی کہ ہم بعد میں صالح بن جائیں گے، ایک تو توبہ کرلیں گے دوسرے باپ کی نگاہِ کرم ہوگی تو جب پیغمبر کی نظرِ کرم ہو تو یقیناً اس کا اثر پڑے گا، مگر ایک بات ذہن میں رہے کہ سامنے والے میں بھی قابلیت ہونا چاہئے اگر سامنے والے میں جوہر قابلیت نہیں ہے تو وہ اسے کیسے قبول کرسکتا ہے اور کامل بن سکتا ہے، میں اسکی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کروں، نبی کریم ﷺ کو معراج نصیب ہوئی اور صبح کے وقت آپ نے اسکو بیان کیا تو ابوجہل نے اپنی جماعت کے لوگوں کو اشارہ کیا اور بلایا بس اشارہ کرنا تھا کہ ساری پارٹی اس کے پاس جمع ہوگئی چونکہ وہ قوم کا ذی حیثیت آدمی تھا اس کے بعد نے اس نے آپ ﷺ سے معراج کے بارے میں پوچھا، آپ ﷺ

نے ارشاد فرمایا کہ مجھے رات میں معراج نصیب ہوئی ہے تو کسی نے سر پہ ہاتھ رکھا کوئی تعجب کرتا تھا کوئی ہنستا تھا تو دیکھئے یہاں ان لوگوں نے یہ قصہ براہِ راست ڈائریکٹ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا، مگر وہی بات قابلیت نہیں تھی لہذا اس کا انکار کیا اور ایمان نہیں لائے، اور پھر ابوجہل حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ تمہارے ساتھی جن پر تم جان چھڑکتے ہو وہ تو اب کچھ عجیب عجیب باتیں کرنے لگے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کو ساتوں آسمانوں کا اور بیت المقدس کا ایک ہی رات میں سفر ہوا ہے، تو حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ وہ واقعۃً ایسا کہتے ہیں؟ کہا ہاں! کہا اگر وہ فرماتے ہیں تو میرا اس پر ایمان ہے میں تصدیق کرتا ہوں اس کی، اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ابوجہل اور اسکی پارٹی کے لوگ یہ بات ڈائریکٹ آپ ﷺ سے سن رہے ہیں براہِ راست مگر اندر استعداد موجود نہیں ہے اس لئے قبول نہیں کیا اور وہاں پر حضرت ابوبکرؓ نے بالواسطہ سنا ہے اِن ڈائریکٹ جسے کہتے ہیں اسکے باوجود صدیقِ اکبرؓ نے فوراً قبول کرلیا (تاریخ مکۃ المکرّمۃ ص۲۲۹) تو اگر کوئی اپنی صلاحیت کا ناس مارلے تو پھر کچھ بھی نہیں، یہی ابوجہل ایک دفعہ ہاتھ میں کنکریاں لیکر آیا اور کہا اے محمد! آپ اگر یہ بتلادے کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو میں کلمہ پڑھ لوں گا، تو دیکھئے، جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ہاتھ میں جو چیز ہے وہی اگر کہدے کہ میں کون ہوں تو، اسنے کہا تب تو میں کلمہ پڑھ لوں گا، اس کا یہ کہنا تھا کہ کنکریوں سے آواز آئی ''اشھد ان لاالٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ'' تو اس ظالم نے بجائے ایمان لانے کے کنکریاں پھینکدی اور کہنے لگا کہ تم پر بھی جادو ہو گیا ہے (ترجمان السنۃ ج۴) یہ عجیب قوم تھی کہ اسے ہر معاملے میں جادو ہی جادو نظر آتا تھا، چاند کے ٹکڑے ہوئے تو کہا کہ نظر بندی ہے جادو ہے، باہر سے آنے والے لوگوں میں سے بعضوں نے اس واقعہ کو بیان کیا تو کہا کہ چلتا ہوا جادو

ہے عام جادو سب کی نگاہوں پہ کر دیا ہے تو ان کو اسکے سوا کوئی اور بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ باپ کی نگاہِ کرم ہمارے حال کو درست کر دے گی۔

حضرت یعقوبؑ کے دو عذر، ایک محبت، دوسرا خوف

بہر حال یہ نظام بنا اور وہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنے کے بعد انہوں نے کہا کہ ابا جان کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے باب میں ہم پر مامون نہیں ہے، ہم اجازت چاہتے ہیں تو اجازت نہیں ملتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی کبھی ساتھ لے جانا چاہا ہوگا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے سامنے دو باتیں ذکر کیں فرمایا کہ یہ دو وجہیں ہیں جو میرے لئے مانع اور رکاوٹ بنی ہوئی ہیں جسکی وجہ سے میں اجازت نہیں دیتا، ایک بات تو یہ ہے کہ مجھے یوسف سے اتنی محبت ہے کہ اس کی جدائی مجھے برداشت نہیں، میں اپنی آنکھوں کے سامنے سے اس کا اوجھل ہونا اور ہٹنا پسند نہیں کرتا ''انی لیحزننی ان تذھبوا بہ ''، ایک وجہ تو یہ ہے، دوسری وجہ ''واخاف ان یاکلہ الذئب '' اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں بھیڑیا اس کو نہ کھالے کیوں کہ اس سرزمین میں بھیڑیئے کافی موجود تھے، اور ادھر خواب میں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے دیکھا تھا کہ دس بھیڑیئے گویا موجود ہیں، مگر ان سے اسکی وضاحت نہیں کی، اسپین کے ایک زبردست مفسر ہیں ابوحیان غرناطیؒ انہوں نے ''البحر المحیط '' کے اندر ایک مقام پہ لکھا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ جملہ ''واخاف ان یاکلہ الذئب'' مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ کھالے، یہ جملہ سبب بنا ہے تمام مشکلات کا۔

حسنات الابرار سیئات للمقربین

کیوں کہ پیغمبر کی ذات کو خدا تعالی سے خاص تعلق ہوتا ہے، اوران کی زبان پر یہ جملہ آیا تو بڑے لوگوں کی بات بڑی ہوتی ہے ان کی چھوٹی بات پر بھی گرفت کی شکل ہوجاتی ہے، تو وہی عنوان بن گیا ہے تمام مشقتوں اور مصیبتوں کا اسی لئے اربابِ تفسیر لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یعقوبؑ سے پوچھا کہ جانتے بھی ہو کہ تم کو یہ پریشانیاں کیوں پیش آئیں؟ کہا کہ نہیں، کہا کہ آپ کا یہ جملہ ''واخاف ان یاکلہ الذئب'' کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھیڑیا انہیں نہ کھالے، یہ سبب بن گیا ہے تمام پریشانیوں کا اور تمام قسم کی تشویشات کا۔

باپ اور بیٹوں کی گفتگو

تو دو باتیں حضرت یعقوبؑ نے ذکر فرمائی، ایک کا حاصل یہ تھا کہ فراق مجھے برداشت نہیں میرے لئے یہ غم کی بات ہے کہ یوسفؑ مجھ سے جدا ہوجائے، اور دوسری بات کا خلاصہ اور حاصل یہ تھا کہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ دو چیزیں ذکر کی ہیں، اور عجیب انداز سے ذکر کیں، ایک میں تو رعایت ہے حضرت یوسفؑ کی، اور دوسرے میں ان کے اندیشہ کو دور کیا گیا، تو بھائیوں نے ایک بات تو یہ کہی کہ ''ارسلہ معنا غدا یرتع ویلعب وانالہ لحافظون'' (یوسف، آیت: ۱۲) یوسف چھوٹے ہیں ننھے منھے ہیں ان کا بھی جی چاہتا ہے کہ باہر نکلے، کچھ کھیلے کودے کچھ کھائے کچھ ادھر ادھر دوڑے، تو ہمارا منشاء ہے کہ ہم تو جنگل جاتے ہی ہیں آپ بھائی یوسف کو بھی ہمارے ساتھ بھیجدے کہ وہ کھائیں گے اور ادھر ادھر دوڑ بھاگ ہوگی تو ان کی طبیعت میں نشاط انبساط اور فرحت ہوگی، اور رہا یہ اندیشہ کہ وہ بھیڑیوں کی زمین ہے بھیڑیوں کے کھانے کا اندیشہ ہے تو ہم

آپ کواطمینان دلاتے ہیں کہ ’’ وانـــالـــہ لـحـافـظـون ‘‘ ، بیشک ہم البتہ ان کی حفاظت کریں گے، تو گویا یوسفؑ کی بات بھی پیش کردی یعنی ان کی طرف سے وکالت کی کہ گویا وہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ آئے اس سے ان کو فرحت ہوگی ، خوشی ہوگی ، انبساط ہوگا ، اور چھوٹے بچے ہیں تو تازگی پیدا ہوجائے گی ، اورادھر یہ بات بھی انہوں نے ذکر کی کہ ہم اسکی حفاظت کریں گے، اس پر جو ہے حضرت یعقوب علیہ السلام تیار ہوگئے ، اور حضرت یوسف علیہ السلام کواجازت دی ، تو پہلے ان کا ذہن بنایا اسکے بعد باپ کے پاس جاکران سے بات کہی ، اور جس کا ان کو خطرہ تھا اس پر حفاظت کا وعدہ کیا ، قرآنِ کریم کا تو ایک حکیمانہ انداز ہے کہ مختصر الفاظ میں وہ بڑی بات کو ذکر کرتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی خوبی ہے ، خیر ، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اجازت دے دی ، دوسرے روز صبح کے وقت وہ چلے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کو ساتھ لیا ، تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بوسہ دیا ، سینہ سے لگایا ، اور اپنے بڑے بیٹے یہودا کو تاکید کی کہ اس کا خیال رکھنا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو پریشانی نہ ہو کوئی تشویش کی شکل نہ ہو ان کی حفاظت ان کی ضرورت ان کی ساری چیزوں کا تم خیال رکھنا ، اور بڑی شفقت کے ساتھ انہیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کیا اور بھائیوں کے ساتھ روانہ فرمایا۔

انسانی مزاج بھی عجیب ہوتا ہے

اب آپ دیکھئے ! انسانی مزاج بھی عجیب ہوتا ہے آج بھی اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں انسان ایسے ملیں گے جس میں بھائی بھائی کو کھا رہا ہے ، چنانچہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ایک بات بڑے پتہ کی فرماتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ

شانہ جنگل کے جانوروں کو زبان عطا فرمائے، درندوں کو، شیر کو، بھیڑ یئے کو، چیتے کو، ان کو حق تعالیٰ بولنے والی زبان عطا فرمائے اور ایسی بولی جس کو لوگ سمجھ سکیں، اور پھر کوئی آدمی جنگل کے کنارے کھڑے ہو کر آواز لگائے اور وہ جانوروں سے یہ پوچھے کہ تمہیں حق تعالیٰ اگر روپ بدلنے کی قدرت دے تو تم لوگ اپنے کو کس روپ میں ڈھالنے کی خواہش رکھتے ہو، کس مخلوق کے روپ میں اپنے کو ڈھالنے کی خواہش رکھتے ہو، تو مولانا فرماتے تھے کہ اگر جنگل کے جانوروں کو حق تعالیٰ زبان دے تو وہ یہ کہیں گے کہ ہم ساری مخلوق بننے کے لئے تیار ہیں مگر حضرتِ انسان بننا نہیں چاہتے ہیں، اور اگر ان سے اسکی وجہ پوچھی جائے تو وہ یہ کہیں گے کہ اس وقت عالم میں کیفیت یہ ہے کہ انسان انسان کا جتنا خون کر رہا ہے کوئی قوم جانوروں میں اپنی نوع کا اتنا خون نہیں کرتیں جتنا وہ کر رہا ہے، جانوروں میں آپس میں لگاؤ ہوتا ہے، اب آپ دیکھ لیجئے، کوّے کا انتقال ہوجاتا ہے تو وہ فورًا اپنی قوم کو کائیں کائیں یعنی کہاں گئے کہاں گئے کر کے جمع کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں سارے کوّے جمع ہوجاتے ہیں، اور میں تو اس کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ قابیل نے جب ہابیل کو قتل کیا تو وہ لاش کو دفن کرنے کا طریقہ نہیں جانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے کوّے کو بھیجا اس نے زمین کو کُریدا اور مردہ کوّے کو اس میں دفنایا، اس کو دیکھ کر انہوں نے بھی یہ تدفین والا عمل اختیار کیا ہے، تو انسانوں کے حق میں کوّا چونکہ معلّم ہے اس لئے جب کسی کوّے کا انتقال ہوتا ہے تو ساری قوم جمع ہوجاتی ہے کہ چلو جنازہ میں جانا ہے یہ گویا کیفیت ہے، تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ جانوروں میں تو ایک قسم کا لگاؤ ہے، اپنی ہی نوع کو اس طریقہ سے برباد کرنا وہ انسان کے علاوہ اور کسی مخلوق میں نہیں ہے، کتّا بلاشبہ کتّے کو نہیں دیکھ سکتا وہ اسکو برداشت نہیں کرسکتا، ایک بہت بڑا جانور مردہ پڑا ہو اور کتّا اسے کھا رہا ہے اور ایسے وقت میں کوئی اور کتّا آجائے گا تو اس کا چہرہ دیکھنے کے لائق ہوگا وہ

غرّ ائے گا منہ بگاڑے گا مگر یہ کہ اس کی ہلاکت کا سبب بن جائے اس طرح سے نہیں، اور آج اس وقت پورے ورلڈ میں آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ملک اور وہ تنظیمیں جو پوری دنیا کو مساوات کا درس دیتے تھے کہ کمیونزم قائم ہونا چاہئے، پچھلے دس سالوں میں پورے ورلڈ میں بعض سیاستدانوں کے انداز کے بموجب تقریباً ڈھائی کروڑ کے قریب انسانوں کا خون ان کے سر پر ہیں، ڈھائی کروڑ انسان آپ اندازہ لگائیے، ڈھائی کروڑ کتنے ہوتے ہیں ساڑھے بارہ ملین انسان تقریباً اتنے انسانوں کا خون بلکہ تین کروڑ کے قریب لوگوں کا مختلف ملکوں میں مختلف طریقوں سے خون کیا گیا، یہ آج کے مساوات کی کیفیت ہے، تو غرض یہ کہ یہ انسانی کیفیت ایک عجیب سی ہے، تو بھائیوں سے بھی یہ بات ہوئی لیکن پھر اس کا جو تدارک ہوا وہ میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں۔

فعل الحکیم لایخلو عن الحکمة

اور دوسری ایک بات یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کا ہاتھ کسی چیز میں اس انداز سے کام کرتا ہے کہ اس حقیقت کو آدمی نہیں سمجھ سکتا، اب آپ دیکھئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ملکِ مصر کے بادشاہ بننے کا جہاں مسئلہ ہے، اور ان کی ساری دنیا میں دھوم مچنے کی جو شکل ہے، باپ کی گود میں بظاہر وہ صورت نہیں تھی، اس وجہ سے حق تعالیٰ نے انہیں باپ کی گود سے ہٹانے کی شکل پیدا کی تو یہ باپ کیلئے تو تکلیف کا باعث ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے بھی تکلیف کا باعث مگر ان کو کیا پتہ تھا کہ اس کے پیچھے روشن فیوچر اور مستقبل چھپا ہوا ہے اس میں ان کی پوری ہسٹری اور تاریخ ہیں کہ کن کن دوروں سے انہیں گذرنا ہے اور کیا کیا کمالات انہیں حاصل ہونے ہیں، وہ ساری چیزیں اس میں چھپی ہوئی تھیں، حق تعالیٰ کی نگاہِ حکیمانہ اسے دیکھتی ہیں جو عالم الغیب

والشھادۃ ہے، بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام اس طریقہ سے یہاں سے نکلے۔

حضرت یوسفؑ پر برادرانِ یوسف کی زیادتی

تو میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ اربابِ تفسیر نے لکھا ہے کہ باپ کی نگاہیں جہاں تک دیکھتی تھی وہ یوسف کو دیکھتے رہے دور تک، تو کیا دیکھتے ہیں کہ بچے شفقت کے ساتھ اور محبت کے ساتھ یوسف کو لے جا رہے ہیں، مگر خدا برا کرے وساوس شیطانی کا اور خدا برا کرے حسد کی اس کیفیت کا کہ جب وہ باپ کی نگاہ سے جدا ہوئے ہیں تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر زیادتی کی سختی شروع کی، اس میں بعض وہ مفسر بھی ہیں جنہوں نے اس میں تھوڑا سا رنگ بھرا ہے، مگر جہاں تک تحقیقی بات ہے اس میں اتنا ہے کہ ان سے زیادتیاں بلاشبہ ہوئی ہیں، چنانچہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو شروع میں تو گود میں لیا اسکے بعد گود سے نیچے ڈال دیا، اور پھر کسی نے انہیں طمانچہ لگایا، کسی نے ان پر طعن کیا، جب وہ دوسرے بھائی کی طرف لپکتے تو وہ ناراضگی ظاہر کرتا تھا وہ تیسرے کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ گرانی ظاہر کرتا، حتی کہ بعضوں نے یہ بات بھی کہی کہ پکارو ان گیارہ ستاروں کو اور چاند وسورج کو جو تمہیں سجدہ کرر ہے ہیں وہ تمہاری حفاظت کریں گے، غرض دلخراش باتیں کہیں اور ان پر زیادتی کی۔

یہودا کی حضرت یوسف پر شفقت

حتی کہ بڑے بھائی یہودا جنہیں باپ نے وصیت کی تھی کہ یوسف کا خیال رکھنا حضرت یوسف علیہ السلام جب ان کی طرف متوجہ ہوئے کہ آپ تو میرا خیال رکھے، تو انہوں نے واقعی اس کو ملحوظ رکھا اور دوسرے بھائیوں سے کہا کہ یہ زیادتی یہ بدخلقی یہ چیزیں بالکل مناسب نہیں ہے، ہم باپ کو کیا منہ دکھائیں گے جا کر، اور ہم نے والد سے

جو وعدہ اور عہد کیا ہے ’’وانالہ لحافظون ‘‘ کہ ہم یوسف کی حفاظت کریں گے یہ اس کے بالکل خلاف بات ہے، لہٰذا نہ یہ ہونا چاہئے نہ وہ، اور وہ اس وقت بھی سوچ رہے تھے کہ انہیں ختم کردے، مگر انہوں نے یہ بات کہی کہ یہ کام مناسب نہیں ہے، ہاں البتہ انہیں کسی ایسی جگہ پر ڈالدو جہاں کنواں ہو کہ وہاں سے انہیں کوئی قافلے والا لے جائے، تو وہ باپ کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے اور ہمارا مقصد حل ہو جائے گا، یا اگر کسی وجہ سے ان کی جان چلی گئی تو نبی زادے کی جان لینے کا گناہ ہمارے سر پر نہیں رہے گا، اس لئے یہ چیز مناسب نہیں ہے، تو خیر، جب انہوں نے ان کو سمجھایا تو وہ کہنے لگے کہ تم باپ کے نزدیک مقرب بننا چاہتے ہو، اس لئے یہ بات کہہ رہے ہو اور دیکھئے اس وقت ان پر ایک کیفیت غالب تھی، ورنہ بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام نے معاف کیا، باپ نے ان کے لئے دعائیں کیں، اور بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے معافی آئی، تو خیر یہ طے پایا کہ کنعان کے قریب کچھ فاصلہ پر ایک کنواں تھا اور کنواں بھی ایسا تھا کہ جسکے اندر کسی درجہ میں پانی تھا بہت زیادہ نہیں، اور وہ بہت زیادہ غیر آباد بھی نہیں تھا مگر اس کی منڈیر نہیں تھی، تو یہ تجویز اور اسکیم طے پائی کہ ان کو اس میں ڈالدیا جائے، جب وہاں لے گئے ہیں تو اس موقعہ پر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بدن سے ان کا کرتہ علیحدہ کیا، اور انہیں اس میں ڈالنے کیلئے جب آمادہ ہوئے ہیں تو قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ’’واوحینا الیہ لتنبئنھم بامرھم ھذا وھم لایشعرون ‘‘(یوسف ،آیت:۱۵) اس وحی کے دو موقعہ بیان کئے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ کنویں میں ڈالدیئے جانے کے کے بعد وحی آئی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ جب وہ کنویں میں ڈالنے کا قصد کررہے تھے تو اس موقع پر یہ وحیِ مبین ان کی طرف آئی ہے، اور یہ وحی جو آئی ہے وہ نبوت والی وحی نہیں ہے اس لئے کہ ایک قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت حضرت یوسف علیہ السلام سات برس کے

تھے اور بھیڑیا تو بچے ہی کو کھاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر کم تھی، تو غرض یہ کہ وہاں لانے کے بعد انہیں ایک ڈول میں رکھ کر نیچے چھوڑا ہے تو اس وقت وہ بھائیوں کی طرف دیکھتے تھے اور ان سے فریاد کرتے تھے وہ جس کی طرف رخ کرتے وہ سب بے اعتنائی برتتے ، اور اس کے بعد انہیں کنویں میں ڈالا اور آدھی ڈول کنویں میں پہنچانے کے بعد پھر رسی کاٹ دی تا کہ وہ ایک دم نیچے پہنچ جائے ۔

جبرئیل امین کی قوت کا ایک نظارہ

اور اللہ تعالی کی شان دیکھئے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب بھائیوں نے رسّی کاٹ دی اور حضرت یوسف علیہ السلام ابھی آدھے کنویں تک پہنچے ہوں گے کہ جبرئیلِ امین جو ساتوں آسمانوں کے اوپر سدرۃ المنتہٰی کے قریب رہتے ہیں، اور زمین سے آسمان کی مسافت پانچ سو سال کی مسافت ہے، اور خود آسمان کا سمک اور موٹا پا جو ہے ''رفع سمکها فسوٰها ''(نازعات ،آیت: ۲۸) وہ خود پانچ سو سال کی مسافت ہے، پھر بیچ میں پانچ سو پھر دوسرا آسمان اسی طرح ہر آسمان کے بیچ میں پانچ سو سال کی مسافت ہے اب اندازہ لگائیے کہ کتنی زیادہ مسافت ہوگی ، اور پھر آج کے اس سائنسی دور میں راکٹ ایک گھنٹہ میں پوری دنیا کا چکر لگاتا ہے بلکہ متعدد چکر بھی ہو جاتے ہیں، اس کے باوجود یہ آسمان سے ٹکراتے نہیں اور نہیں وہاں تک پہنچ پاتے ہیں بلکہ انکار کر رہے ہیں، تو آپ اندازہ لگائیے کہ اس کی بلندی کتنی ہوگی ، اور قرآن کریم کی ۱۲۰ آیتیں خبر دے رہی ہیں کہ آسمان کا وجود موجود ہے، تو اب اندازہ لگائیے کہ اس وقت جبرئیلِ امین کو حق تعالیٰ کا حکم ملتا ہے کہ جاؤ یوسف کو سنبھالو، حضرت جبرئیلِ امین چلے ہیں اور کب چلے ہیں رسّی کاٹنے کے بعد اور تہہ تک پہنچنے سے پہلے آ کر یوسف کو سنبھال لیا ہے، اس سے آپ اندازہ

لگائیے کہ حضرتِ جبرئیلؑ کی قدرت کیسی ہوگی ،اسی لئے حافظ ابن کثیرؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ قومِ لوط کی چار بستیوں کو حضرت جبرئیلِ امین نے اوپر لے جا کر الٹ دیا ہے تو چار بستیوں میں تقریباً چار لاکھ آدمی تھے اور بعضوں نے پانچ لاکھ کا تذکرہ کیا ہے،تو چار پانچ لاکھ کی آبادیاں ان بستیوں میں تھیں ان کو حضرتِ جبرئیل نے زمین سمیت اس انگلی پر اٹھایا (یہاں حضرتؒ نے حاضرین کو وہ انگلی دکھائی) اور اوپر لے جا کر یوں نیچے الٹ دیا،تو فرشتوں کی طاقت کی یہ کیفیت ہے۔

جبرئیلِ امین سے بھی زیادہ طاقتور فرشتے ہیں

اور یہی جبرئیلِ امین حضرت عزرائیلؑ کے سامنے گویا سہمتے ہیں اور لحاظ کرتے ہیں ان کا،اور حضرت اسرافیلؑ کے سامنے تو یہ بہت ہی کمزور ہے،اور حضرتِ اسرافیلؑ کتنے طاقتور فرشتے ہوں گے اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیے کہ اتنا بڑا انظام ان کی پھونک سے ٹوٹ جائے گا، یہ نہیں کہ وہ ٹولز سے مارنا شروع کریں گے اور اٹھا پٹھک اور توڑ پھوڑ کی شکل ہوگی،نہیں،صرف ان کی پھونک سے یہ سارا عالم ٹوٹ جائے گا۔

حق تعالیٰ کی قدرت

اس سے اندازہ لگائیے کہ حق تعالیٰ کی قدرت کیسی ہوگی ، جبکہ اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کا یہ پاور ہے، اس سے اس کے عرش کی وسعت کا اندازہ اور اسکی قوتوں کا اندازہ آپ لگائیے بلکہ ہم اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے ،حق تعالیٰ اس پورے عالم کو ایک لمحہ میں اجاڑ بھی سکتے ہیں اور پھر بنا سکتے ہیں، وہ ایک منٹ میں بیسیوں دفعہ اسے اجاڑ کر پھر بنانے پہ قادر ہیں اس سے حق تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے،اور ایمان کو تازگی ملتی ہے کہ جب ایسے رب پر ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہمارا حاجت روا اور مشکل

کشا ہے، وہی ہماری ضروریات کا متکفل ہے تو بھلا ہم مخلوق پر کیوں نظر رکھے، حق تعالیٰ ہی پر نظر رکھے، اور اسی سے مانگنے کی عادت ڈالے جو اتنی قوّت والا اور طاقت والا ہے اور جس کے خزانے کمی کو قبول نہیں کرتے ہیں تو اس کی ذات کا تو پوچھنا ہی کیا۔

جبرئیلِ امین کی ڈانٹ کا اثر

تو بہرحال کہنے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں پہنچے، بعض تفسیروں میں میری نظر سے گذرا کہ حضرت جبرئیلؑ نے تشریف لا کر جتنے جانور تھے کنویں کے ان کو ندا دی کہ یوسف صدیق تم میں آئے ہیں ان کا لحاظ کرو، تو ہر جانور سرک گیا، پیچھے چلا گیا، مگر سانپ ظالم جو ہے وہ آگے بڑھا اور پہلے سانپ کی بڑی آواز ہوتی تھی جبرئیلِ امین نے دیکھا کہ یہ بزِ اخفش آگے بڑھ رہا ہے تو اس کو ڈانٹ پلائی اس کا اثر یہ ہوا کہ سانپ کی آواز ختم ہوگئی، اس کے بعد سے سانپ جو ہے کتنی ہی طاقت میں ہو اور اس میں کتنی ہی گرمی اور کتنا ہی پوئیزن اور کتنی ہی حرارت ہو مگر پھوں سے زیادہ اس سے نہیں ہوتا، سانپ میں سب سے زیادہ خطرناک ناگ ہوتا ہے مگر اس کی بھی آواز پھوں پھوں جیسے ٹیلیفون کی گھنٹی ہوتی ہے بلکہ وہ بھی نہیں اس سے بھی کم تو زیادہ سے زیادہ اس کا پاور یہی ہوتا ہے، وہ سارے اوں پھوں جو ہے یہ اس وقت شروع ہوئے جب حضرت جبرئیلؑ کی ڈانٹ پڑی ہے۔

کنویں میں جانا درحقیقت سبب تھا تخت و تاج کا

تو بہرحال دوسرا قول یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں تھے اس وقت کنویں میں یہ وحی پہنچی مگر یہ نبوت والی وحی نہیں ہے وہ تو عامۃً چالیس سال کی عمر میں پہنچتی ہے، گویا حق تعالیٰ کی طرف سے قلب میں ایک بات آئی کہ ایک وقت آئے گا

کہ تم انہیں اس واقعہ سے متنبہ اور باخبر کروگے اور انہیں اس کا شعور بھی نہیں ہوگا، کہ آج وہ بیکسی کے ساتھ تمہیں کنویں میں ڈال رہے ہیں مگر انہیں کیا پتہ کہ یہ کنویں میں جانا در حقیقت سبب بن جائیگا حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے تخت وتاج کے مالک بننے کا اور شہرت کا، تو غرض یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہاں کنویں میں رہے۔

برادرانِ یوسف عشاء کے وقت کیوں آئے؟

اب قصہ یہ ہوا کہ وہ کہنے لگے کہ ہم نے یوسف کو تو کنویں میں ڈال دیا لیکن اب ہم باپ کو جاکر کیا منہ دِکھائیں گے، پھر یہ طے ہوا کہ باپ کو جاکر یہی کہیں گے جس چیز کا آپکو اندیشہ اور ڈر تھا کہ کہیں بھیڑیا اس کو نہ کھالے ویسا ہی ہوا، اور اس کیلئے انہوں نے یہ کیا کہ ایک بکری کو ذبح کیا اور یوسف علیہ السلام کا جو کرتہ تھا اس پر بکری کا خون لگا دیا اور لگانے کے بعد پھر وہ گھر آئے ہیں، اور آئے بھی ہیں تو عشاء کے وقت قرآنِ کریم کہتا ہے ''وجائو اباھم عشاء ا ییکون ،،، روزانہ مغرب کے وقت آتے تھے، مگر آج دیر سے آئے عشاء کے ٹائم اس میں ادھر بھی اشارہ ہے کہ باپ پہلے ہی سے سمجھ جائیں کہ کوئی بات ہوئی ہوگی اس لئے ابھی تک آئے نہیں، اور آئے تھے روتے ہوئے، اور آنسو ان کے چونکہ حقیقی آنسو نہیں تھے اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ روشنی میں باپ کے سامنے یہ مصنوعی آنسو لے کر جانا ٹھیک نہیں ہے، تو آنکھوں کی شرم تھی، اور آنکھوں سے نکلنے والے آنسو مصنوعی شان کے تھے اور حجاب تو تھا ہی اسوجہ سے انہوں نے تاریکی کا وقت منتخب کیا اور گئے تو روتے ہوئے گئے، جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کے رونے کی آواز سنی تو گھبرائے ہوئے باہر نکلے اور پوچھا کہ کیا ہوا خیریت تو ہے، کوئی بات تو پیش نہیں آئی؟ اور پھر پوچھا یوسف کہاں ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ایسا ہوا ابا جان!

ہم گئے اور جا کر کھیلنے لگے اور یوسف کو ہم اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے اتنے میں ایک بھیڑیا آیا اور یوسف کو کھا گیا اور آپ تو ہماری بات مانیں گے نہیں۔'' وما انت بمومن لنا ولو کنا صادقین، ،چاہے ہم اپنی بات میں سچے ہوں۔

جمالِ یوسفی پر ایک اشکال اور اس کا جواب

اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے وہ خون آلود کرتہ پیش کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام باپ تھے اور پھر بیٹے کی محبت ان پر کیا گذری ہوگی یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے دل نے چوٹ کھائی ہو، اور پھر یہ کہ بچہ اور ایسا بچہ جس میں یہ کمالات، حدیث شریف میں ہے کہ سارے عالم کا آدھا حسن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو دیا تھا، پورے ورلڈ میں جتنا حسن تقسیم کیا اللہ تعالی نے اس میں سے آدھا حسن حضرت یوسفؑ کو دیا تھا، اور آدھا حسن سارے عالم کو، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات خود آپ ﷺ فرمارہے ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ ﷺ کا حسن کہاں گیا؟ تو وہ فرماتے ہیں کہ یہاں آپ ﷺ کے حسن سے بحث نہیں ہے، آپ تو فیصلہ کر رہے ہیں ججمینٹ دے رہے ہیں، جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ کرکٹ اور فٹ بال میں امپائر اور ریفری کا کام یہ بتانا ہے کہ یہ ایسا اور یہ ویسا وہاں اس کی صلاحیت سے بحث نہیں ہوتی، وہاں یہ بحث نہیں ہوتی کہ امپائر کی پوزیشن کیا ہے، وہ تو اس لائن کا ماہر ہے ہی صحیح، تو یہاں حضور ﷺ اپنے جمال سے بحث نہیں فرمارہے ہیں، آپ ﷺ کے جمال پر تو حجابات ڈالدیئے گئے، ورنہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مصر کی عورتوں نے حضرت یوسفؑ کا جمال دیکھا تو انگلیاں کاٹ لی، اور میرے محبوب کو دیکھتی تو جگر کے ٹکڑے کر ڈالتی وہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھیں (علمی تقریریں ص ۱۴۶) تو اللہ تعالی نے حضور ﷺ کے

جمال پہ حجاب ڈالدیا تھا اسکی تفصیل بعد میں آئے گی انشاءاللہ، بہرحال کہنے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے باب میں خبر دی اور اسکے ساتھ کرتہ پیش کیا تو باپ نے جلدی جلدی کرتہ دیکھا کرتہ خون آلود تھا۔

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے

اور یہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، بھروچ ضلع میں ایک بستی ہے سارود ایک دفعہ میرا وہاں جانا ہوا وہاں میں نے ایک واقعہ سنا کہ ایک صاحب کو اذان دینے کا بہت شوق تھا اور بانگی صاحب (مؤذن صاحب) تھے جلالی وہ ان کا ٹرن لگنے نہیں دیتے تھے انہیں اذان دینے کا چانس نہیں دیتے تھے، تو اس نے سوچا کہ آج صبح جا کر میں اذان دوں گا، تو کیا کیا کہ مسجد میں ایک ٹول تھا وہ اسنے لیا اور اس کو لینے کے بعد گھڑی کے پاس پہنچا، اور رات کے تین بج رہے تھے تو اس نے گھڑی میں ساڑھے پانچ بجا دیئے، اسکے بعد جناب کرسی سے اتر کر اذان دینے کے لئے تشریف لے آئے مگر وہ دلیل یعنی ٹول وہیں چھوڑ دی اور آ کر اذان شروع کی، اب وہ جلالی بانگی صاحب آئے اور پورے ملفوظات کے ساتھ آئے، کہا کہ کون چھے اذان دیوا واڑو (کون ہے اذان دینے والا) اس نے کہا کہ تم سوتے رہتے ہو ٹائم ہو گیا ہے دیکھ لو جا کے گھڑی، اب جو گھڑی دیکھی تو گھڑی میں تو خیر ساڑھے پانچ بجے تھے، لیکن حضرت نے جس کرسی پر کھڑے ہو کر یہ کارنامہ انجام دیا تھا اسے جلدی میں وہیں گھڑی کے نیچے بھول گئے تھے جو پروف تھا اور دلیل تھی ان کی کارستانی (چھیڑ خانی) کی تو بانگی صاحب (مؤذن صاحب) نے اس کو بہت تگڑی سنائی، معلوم ہوا کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے، تو یہاں حضرت یعقوبؑ نے کرتہ دیکھا اور کہا کہ بڑا عقلمند بھیڑیا تھا کہ یوسف کو کھا گیا مگر

کرتہ پر کہیں شقاق وشگاف اور پھٹن نہیں ہے، کرتہ بالکل صحیح سالم ہے، فرمایا کہ بھیڑیا بڑا عقلمند تھا کہ اس نے اس انداز سے کھایا کہ کرتہ پھٹنے نہ پائے، اور فرمایا کہ یہ گویا تمہارے نفس کی تلبیس اور چال ہے" فصبر جمیل "میں کوئی شکوئ نہیں کروں گا صبر کروں گا، اور میں اس معاملہ میں اللہ تعالی ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور اللہ تعالی ہی کی طرف گویا متوجہ ہوں، اس سلسلہ میں مزید کچھ تفصیلات انشاءاللہ بعد میں ذکر کی جائے گی دعا کیجئے اللہ تعالی توفیقِ عمل عطا فرمائے۔آمین۔اور اللہ تعالی حسد سے، کینہ سے، کپٹ سے ہماری حفاظت فرمائیں۔آمین۔

درس نمبر (۱۴)

بعد از خطبہ

لقد کان فی یوسف واخوته آیت للسائلین، اذ قالوا لیوسف واخوه احب الی ابینا منا ونحن عصبة ان ابانا لفی ضلل مبین.

انبیاءِ کرام کو اللہ تعالی لاریب والا علم عطا فرماتے ہیں

محترم حضرات! آج تبلیغی جماعت بھی ہماری اس مسجد میں آئی ہوئی ہے تو آج کے درس میں کچھ باتیں اس کام (مراد تبلیغی جماعت) کے سلسلہ میں بھی انشاء اللہ عرض کروں گا۔

بہر حال، گفتگو یہ چل رہی تھی کہ حضرت یعقوب علیہ الصلوۃ والتسلیم نے حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ بات فرمائی تھی کہ جس طریقہ سے حق تعالی تمہیں یہ شرف عطا فرمائیں گے کہ چاند سورج اور ستارے تمہارے آگے جھکیں گے اسی طریقہ سے حق تعالی تمہیں مجتبی بنائے گا، اور تمہیں حق تعالی خاص طور سے خواب کی تعبیر کا علم عطا فرمائیں گے، تو خاص طور سے خواب کی تعبیر کے علم کا تذکرہ فرمایا، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ علم حق تعالی انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو عطا فرماتے ہیں اور علم بھی وہ جسے لاریب والا علم کہنا چاہئے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔

علم کی دو قسمیں ہیں

اس لئے کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علم ہے جو خدا تعالی کی طرف سے چلا اور بندوں کو نصیب ہوا، حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: حقیقۃً علم

وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے چلا ہے، اور دوسرے جتنے علوم ہیں وہ واقعۃً علوم نہیں بلکہ فنون ہیں جن کو ہٹ دھرمی کے ساتھ علوم کہہ دیا گیا ہے، تو علم درحقیقت علمِ الٰہی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے چلتا ہے۔

جتنا علم ہوتا ہے اتنی معرفت بڑھتی ہے

تو نبیوں کو حق تعالیٰ سب سے زیادہ علم عطا فرماتے ہیں اور جتنا علم ہوتا ہے اتنی معرفت بڑھتی ہے اور اسی کے نتیجہ میں جہاں حق تعالیٰ سے قرب نصیب ہوتا ہے وہیں مخلوق کے معاملے میں ان کو یہ بصیرت ہوتی ہے کہ وہ مخلوق کو کس طریقہ سے دین کی دعوت دے، کس طریقہ سے ان کے سامنے بات رکھے، کیسے انہیں سمجھائیں تو وہ ساری چیزیں بھی اُن پر کھلتی ہیں، تو امت کے مزاج شناس بھی ہوتے ہیں اور رب کی معرفت بھی ان کو ہوتی ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بغیر علم و معرفت کے آدمی کوئی کام صحیح طریقہ سے انجام دے ہی نہیں سکتا، تو وہ بنیادی اور اساسی چیز ہے۔

پیغمبر کا صحبت یافتہ ظالم نہیں ہوسکتا

اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے اپنی کتابِ عظیم میں ایک عجیب واقعہ ذکر فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے لشکر کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے اور لشکر ظاہر ہے کہ بڑا لشکر تھا اس میں خاص شان تھی ان کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑا نوازا تھا، تو ایک چیونٹی یا ایک چیونٹا کہنا چاہئے جو چیونٹیوں کی گویا سردار تھیں اسنے اپنی قوم سے خطاب کرکے یہ بات کہی کہ ”یا ایھا النمل اد خلوا مسکنکم ،، (نمل،۱۸) اے چیونٹیوں اپنے بلوں میں داخل ہوجاؤ ”لا یحطمنکم سلیمن وجنودہ وھم لا یشعرون،،

(نمل،۱۸) کہ مبادا کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں کچل دیں، تمہیں روند دیں، تمہیں اپنے پیروں میں رگڑ دیں، اور انہیں اس کا علم بھی نہ ہوں۔

صدیقِ اکبر یارِ غار بھی ہیں اور رفیقِ مزار بھی

تو بھلا بتائیے کہ نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں رہنے والے صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ جو یارِ غار ہیں اور یارِ غار کی مثل بھی وہیں سے مشہور ہوئی ہے کہ آپ غار میں بھی ساتھ تھے اور اس کے علاوہ اور بھی واقعات ہیں کہ جب معراج میں تشریف لے گئے نبی اکرم ﷺ تو آسمانوں کے اوپر ایک فرشتہ کا ظہور ہوا جس کی شکل صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی تھی اور آواز بھی ویسی ہی تھی کہ جس سے آپ کو انس ہو اور مانوسیت پیدا ہو۔

پیغمبر کا صحبت یافتہ عادل ہوتا ہے

تو ایسے خلیفہ اور صحابی کے باب میں یہ کہنا کہ انہوں نے گویا ظلم کیا ہے تو در حقیقت اس چیونٹی کا جو علم ہے اس سے بھی زیادہ گیا گذرا علم ہے ان لوگوں کا جو صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظالم قرار دیتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ چیونٹی تو یہ سمجھتی ہے کہ پیغمبر کی صحبت میں رہنے والا عادل ہیں، اس میں انصاف ہے وہ ظلم نہیں کرتا، اور یہ عقلمند یہ سمجھ رہے ہیں کہ جو پیغمبر کے ساتھ ہمیشہ رہا وہ ظلم وستم کا معاملہ کر رہا ہے، کتنی بڑی غضب کی بات ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین کی ایک صورت کی نسبت ہی اس کے نام کی طرف کی جو ''سورۃ النمل،، کہلاتی ہے اور ''نمل،، کہتے ہے چیونٹی کو تو آپ کو حیرت ہوگی کہ چھوٹا سا جانور اور کتابِ مبین کی اور کتابِ ہدی کی ایک صورت اس پوری سورت کا نام سورۃ النمل ہے جو انیسویں پارے میں موجود ہے، یہ ساری برکت در حقیقت علم و

معرفت کی ہے کہ چیونٹیوں کو بھی یہ شرف نصیب ہے کہ اس کے نتیجہ میں حق تعالی اپنی کتاب کی ایک صورت کا نام سورۃ النمل رکھتے ہے جو بہت بڑی بات ہے۔

کلبِ معلم کا کیا ہوا شکار جائز ہے

یہی وجہ ہے کہ کتا ایک نجس جانور ہے، لیکن فقہاء لکھتے ہیں اور حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ کتے کو اگر شکار کی تعلیم دی جائے اور بسم اللہ پڑھ کر شکار پر اسے بھیجا جائے اور اسکی شکل یہ ہے کہ جب بھیجے تو چلا جائے اور بلائے تو لوٹ آئے تو گویا وہ تابع ہے اور صحیح معنی میں اسنے تعلیم حاصل کی ہے شکار کی اور شکاری کے امر پر چلتا ہے اور اسی پہ لوٹتا ہے اور بھیجنے والا بسم اللہ پڑھ کر اسے بھیج رہا ہے تو ایسے کتے کو کلبِ معلم کہا جاتا ہے، سکھایا گیا کتا، اب کتے کا یہ شکار بھی شرعاً حلال ہے، (فہمِ حدیث ج۳ ص۳۳۴ بحوالہ بخاری و مسلم) معلوم ہوا کہ یہ علم کی برکت ہے کہ کتے جیسا نجس جانور کا کیا ہوا شکار بھی حلال ہو جاتا ہے، اور علم کی برکت سے چیونٹی کو تو یہ شرف نصیب ہوا کہ اس کو اللہ تعالی نے نوازا اور ایک صورت کی نسبت اس کی طرف کردی گئی، تو علم کی برکت ہیں کہ پورے قرآنِ کریم کی ایک سورت کی نسبت چیونٹی کی طرف کی گئی، اور دینی تعلیم کی برکت ہے کہ کتے کے شکار کو حلال قرار دیا گیا، یہ اللہ تعالی کا خاص کرم اور انعام ہے معمولی بات نہیں ہے۔

علم بنیادی چیز ہے

تو معلوم ہوا کہ علم جو ہے وہ بہت بڑی دولت ہے، یہی وجہ ہے کہ چھ نمبر میں مستقل ایک نمبر علم و ذکر رکھا گیا، ظاہر بات ہے کہ اگر فضائل کا علم نہ ہو تو شوق نہیں ہوگا، اور مسائل کا علم نہ ہو تو اعمال صحیح نہیں ہوں گے، تو علم تو بنیادی چیز ہے، اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کو کہ ایسی چیزیں منتخب کی

انہوں نے اور منتخب بھی کیا کی وہ تو حق تعالی نے ان کے قلب پر الہام فرمایا کہ ان کا انتخاب کیا جائے یہ الہامی چیزیں ہیں ویسی چیز نہیں ہیں (ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ) اور الحمدللہ ایک عالم اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے، تو علم بہت بڑی چیز ہے۔

اصل علم علمِ الٰہی ہے

مگر علم وہی ہے جو لا ریب والا علم ہو کتاب وسنت کا علم ہو اور وہ علم نہیں ہے تو پھر خدا کے یہاں دوسرے علوم کی وقعت اور عظمت نہیں ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ دیکھو دنیا کے جتنے علوم ہیں ان تمام کی منفعت اور فائدہ اس وقت تک ہے جب تک کہ انسان کی آنکھ کھلی ہوئی ہے، آپ انجینئر ی لائن لے لے اور اسی طریقہ سے کوئی جو ہے سولی سیٹر بن جائے (وکیل بن جائے) بڑا بیرسٹر بن جائے کوئی شخص جو ہے ڈاکٹر بن جائے اور کوئی اور کسی لائن میں لگ جائے تمام علوم کے فائدے اس وقت تک ہے جب تک کہ انسان اس دنیا میں ہے اور آنکھ کھلی ہوئی ہے آنکھ بند ہونے کے بعد اسکے حق میں کیا فائدہ ہے، آپ بتائیے، گیا، بس سارا مسئلہ ختم ہے، ہاں علم وہ ہے جس سے یہاں کی زندگی بھی درست ہوتی ہے اور کروڑں سال کی دائمی زندگی درست ہوتی ہے، وہ علم ہے جسے انبیاء کرام علیہم السلام اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اسی علمِ الٰہی کی بنیاد پر حق تعالی نے امت کو عالم میں چمکایا یہ امت جب نکلی ہے تو صحابہ علمِ الٰہی لے کر نکلے ہیں، حضرت جیؒ فرماتے تھے اور بڑی پتہ کی بات کے اسی علمِ الٰہی کی بنیاد پر دنیا کی مختلف قوموں میں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں جا کر صحابہ نے کام کیا، تو صحابہ کا اصل جوہر علمِ الٰہی تھا جو جناب محمد ﷺ سے انہوں نے حاصل کیا، وہ اور چیزیں بھی جانتے تھے اللہ تعالی نے ان کو ذکاوت دی تھی، فہم دی تھی، دماغ دیا تھا، صلاحیت دی تھی، مگر خاص طور سے یہ علم جو بنیادی ہے جسے نبی کریم ﷺ نے انکے سامنے پیش کیا، یہ وہ روشنی ہے کہ اسکی مثال عالم

میں نہیں مل سکتی، یہ وہ روشنی ہے کہ لُٹانے سے بڑھتی ہے اس میں کمی کا کوئی سوال نہیں ہے یہ وہ روشنی ہے کہ دنیا کا کوئی دشمن اسے ختم نہیں کرسکتا۔

اے بادشاہ! تم نے اپنے اندر کونسا جوہر پیدا کیا ہے

اسی لئے آپ دیکھئے ایک بادشاہ ہے اور بادشاہ کی ساری بادشاہت کا دارومدار یہ ہے کہ وہ کرسی پر ہے، آپ نے افلاطون کا واقعہ نہیں سنا کہ ایک بادشاہ جارہا تھا یہ حکیم تھا جڑی بوٹیوں کی تلاش کرتا اور شام میں آکر بے چارہ آرام کرتا، ایک دفعہ یہ سڑک کے پاس آکر بیٹھا اور تھکا ہوا تھا تو آنکھ لگ گئی ادھر سے کوئی اس زمانہ کا بادشاہ ہوگا اسکی سواری آئی تو ہٹو، بچو، دوڑو، بھاگو، دھوم دھام جیسے سیکیوریٹی گارڈ ہوتا ہے اس زمانہ کے وہی صحیح، اب اسکے قریب آئے اسکو اٹھایا یہ نہیں اٹھا بہت غلبہ تھا نیند کا، تو اس کو جھنجھوڑا اتنے میں بادشاہ قریب آگیا تو بادشاہ نے کہا ٹھیر جاؤ اور آکر بادشاہ نے لات ماری یہ آنکھ کھولتے ہیں، بادشاہ نے پوچھا مجھے پہچانتے ہو میں کون ہوں؟ افلاطون نے کہا ہاں! میں کوشش کررہا ہوں کہ آپ کو جانوں کہ آپ کس جنگل کے جانور ہے، کہاں ہیں؟ مجھ کو جنگل کا جانور کہتے ہو، تم کو معلوم نہیں کہ میں بادشاہ ہوں میری ایک پوزیشن ہے ایک کنڈیشن ہے میرے پاس آرمی ہے، میرے پاس خزانہ ہیں، میرے پاس کرسی ہے، میرے پاس تاج ہے، وہ بڑا حکیم تھا اسنے کہا سنبھل جاؤ! آپ کو جن چیزوں پر ناز ہے جن چیزوں پر غرور ہے پہلے اسکی حقیقت سن لو، تمہارے سر پر جو تاج ہے وہ بلا شبہ عزت کی چیز ہے، مگر کل اس کو ہٹا دیا جائے تو آپ بے عزت ہے، آپ کے اندر کیا جوہر ہے، کرسی کی وجہ سے آپ کو عزت نصیب ہوئی، کل کرسی سے آپ کو اتار دیا جائے تو تم کسمپرسی میں پڑ جاؤ گے آپ کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا، تمہارے اندر کونسی خوبی ہے تم نے اپنے اندر کونسا کمال پیدا کیا آرمی اور فوج پر تم کو ناز ہے کہ اتنے میرے ماننے والے ہیں میں اشارہ کروں تو وہ لڑیں

گے، کل کو اگر آرمی اور فوج تمہاری باغی ہوگئی تمہارے خلاف ہوگئی تو تم کیا کرو گے، تو آپ کے اندر ایسا کونسا جوہر اور خوبی ہے جس پر آپ فخر کر سکتے ہو، اور شاہی خزانہ پر تمہیں جو ناز اور فخر ہے اسکی کنجیاں اسکی چابیاں تم سے لے لی جائے تو تمہاری کیا حیثیت ہے، تو نہ تم تجوری پہ فخر کر سکتے ہو، نہ تاج پہ فخر کر سکتے ہو، نہ آرمی اور فوج پہ فخر کر سکتے ہو، اور نہ کرسی اور پوزیشن پہ فخر کر سکتے ہو، تمہارے اندر کیا بنا ہے۔ (خطباتِ حکیم الاسلام ج ۴ ص ۵۱۷)

انسان کے اندر جو بنے گا وہ سو فیصد اس کے ساتھ جائے گا

اور واقعی پتہ کی بات کی ہے اسی لئے اس کام میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ انسان کے اندر جو بنے گا سو فیصد وہ ساتھ جائے گا اندر اگر آپ کے علم ویقین بن گیا تو ہوائی جہاز میں بھی ساتھ، سیٹینگ روم میں بھی ساتھ، غسل خانہ میں جائے تب بھی ساتھ بیت الخلاء جائے تب بھی ساتھ، جنگل میں جائے تب بھی ساتھ، شہر میں جائے تب بھی ساتھ، جو انسان نے محنت کر کے اپنے اندر بنایا ہے وہ سو فیصد انسان کے ساتھ رہے گا، اسی لئے آپ دیکھئے ایک آدمی کا انتقال ہوتا ہے موت کے بعد جب اسے نہلاتے ہیں تو کہتے ہیں اس کا چشمہ اتارو، ٹوپی اتارو، شیروانی اتارو، کوٹ اتارو، پتلون اتارو، اسی طرح اس کے ہاتھ سے انگھوٹھی بھی اتار لیتے ہے، گھڑی بھی اتار لیتے ہیں اور بھی جو کچھ اسنے پہن رکھا ہو وہ اتار لیتے ہیں، یہ باہر کا سارا کور اور لفافہ جس سے اس کا گویا سمجھئے میک اپ تھا، زینت تھی، آرائش تھی، وہ سب نکال لیا جاتا ہے اور اس کے بعد کفن پہنا دیا جاتا ہے، پہناتی ہوگی بعض قومیں گھڑی بھی اور عمدہ ٹائی بھی اور یہ اور وہ الا بلا، مگر سوال یہ ہے کہ اسکے اندر کیا ہے، وہاں تو کور کے بعد دیکھا جاتا ہے، آپ کے پاس ایک خط آجائے تو آپ فوراً خط لیتے ہیں اور لینے کے بعد اسکو کھولتے ہیں اگر کور گولڈن ہے اور اندر بکری کی مینگنی بھری ہے تو آپ کہیں گے لا حول ولا قوۃ الا باللہ اور اس کا کور جو

ہے گولڈن کور نہیں سادہ کاغذ ہے مگر اندر کیش ہے اندر کوئی اچھی قیمتی چیز ہے تو آپ خوش ہوں گے، تو یہ دنیا کا جتنا جو کچھ ہے یہ سب باہر کی چیزیں ہیں، اندر کوئی چیز بن جانی چاہیئے اسی لئے حضرت جیؒ فرماتے تھے کہ اندر وہ علم بن جائے جس علم کو خدائے پاک یقین سے تعبیر کرتے ہیں، اگر علم ویقین نہیں ہے تو وہ علم علمِ یقینی نہیں ہے، قطعی نہیں ہے، لاریب والا علم نہیں ہے، بلکہ وہ علم انسان کے اندر محنت سے بنا ہے جس علم کو حق تعالی شانہ جہل قرار دیتے ہیں۔

یقین کے بغیر گاڑی نہیں چلتی

اندر اگر انسان کے یقین بن گیا، اور دیکھو یقین کے بغیر گاڑی نہیں چلتی، آپ کو ایک سائیکلوجیک بات بتاؤں، ٹرین جو چلتی ہے اسکی دو پٹریاں ہوتی ہیں، ہم نے ہندوستان میں بہت سوں کو دیکھا اور بچپن میں ہم نے بھی یہ حماقت کی کہ ٹرین کی پٹری پہ بعض دفعہ چلے تو آدمی جب پٹری پہ چلتا ہے تو وہ اپنا بیلینس برقرار رکھنے کے لئے کبھی ادھر ہاتھ یوں کرتا ہے کبھی ادھر ہاتھ یوں کرتا ہے تو ہوا کا بھی اثر پڑتا ہے، بہرحال یہ ایک چیز ہے اور زمین کی بھی ایک کشش ہے یہ بھی ایک فلسفہ ہے مستقل، اسی طرح کبھی آدمی پل اور برتج پہ چلتا ہے کہ جہاں نیچے بڑا دریا ہے پانی موجیں مار رہا ہے اور ادھر ادھر کوئی آڑ نہیں ہے وہاں آدمی کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں (وہ ڈر جاتا ہے)، تو اسکی ایک وجہ تو یہی ہے کششِ ارضی کا اثر، لیکن دوسرا قوتِ متخیلہ ہے نفسیات کہ آدمی پر تخیل کا اور وہم کا اثر ہوتا ہے کہ اب وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ بہت مشکل ہے، اسپر ایک چیز طاری ہوگئی خوف کی۔

انسان کے تخیل اور وہم کا اس پر اثر پڑتا ہے

امریکہ میں ایک ریس ہوتی ہے اور اس پر وہ انعام رکھتے ہیں ہوتا یہ ہے کہ جیسے

مثلاً سومنزلہ بلڈنگ ہے اور اسکے سامنے دوسری بلڈنگ ہے اور دونوں کے بیچ میں پچیس ہاتھ کا فاصلہ ہوتا ہے اور وہ ان دونوں بلڈنگ کے بیچ میں ایک بہت بڑا رسہّ لگا دیتے ہیں کہ آدمی اِدھر سے اُدھر جائے، اگر وہ اس میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اس پر اسے دس لاکھ ڈالر انعام ملتا ہے، اور نیچے آجائے تو آخرت میں، اِدھر یا اُدھر، اِس پار یا اُس پار، جیسے میں نے کینیڈا میں دیکھا نیا گرا ایک فولڈ ہے بفیلو ایک بستی ہے اسکے قریب دنیا کے دو مشہور فولڈ ہے ایک تو زامبیا اور روڈیشیا کے درمیان وکٹوریا فولڈ وہ بھی دیکھا، اور یہ نیا گرا فولڈ تو وہ جو ہے اس میں ایک بہت بڑا پلاسٹک کا گیند بناتے ہیں اور اس میں آدمی کو رکھتے ہیں اور اوپر سے نیچے چھوڑتے ہے، وہ نیچے آکر پھوٹتا ہے اس میں جو آدمی بیٹھا ہے وہ سنبھل گیا اور اس کو چیر کر باہر آگیا تو اسکو دس لاکھ ڈالر انعام ملتا ہے، ورنہ آخرت تو ہے ہی سامنے، تو وہ ایک مشق کرتے ہیں، اب آپ دیکھئے کہ یہ جو آدمی چلتا ہے تو اس میں وہ مشق کرتا رہتا ہے مشق کرتا رہتا ہے مشق کرتا رہتا ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ اس کو اپنے وہم اور خیال کو ہٹانے کی مشق بھی کرنی پڑتی ہے، کیونکہ وہم غالب آگیا تو موت ہوجاتی ہے۔

وہم کا بھی اثر ہوتا ہے اس کا ایک واقعہ

میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں، دیوبند میں ایک مقام ایسا تھا جہاں کمرے میں اندھیرا تھا لڑکوں میں مشہور تھا کہ وہاں کوئی رات میں جانہیں سکتا اور جائے گا تو جن کا اثر ہوگا، ایک طالبعلم نے کہا کہ میں جاتا ہوں، انہوں نے کہا تم جا کر آئے تو تم کو اتنا انعام دیا جائے گا، انعام مقرر کیا، پھر وہ کہنے لگے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تم وہاں جا کر آئے ہو، تو اسکے لئے یہ بات طے ہوئی کہ تم وہاں زمین میں ایک کھیلی یا کھونٹی ٹھوک کر آجانا، ہم صبح

دیکھ لیں گے کہ آپ وہاں گئے یا نہیں، اسنے کہا اچھی بات ہے، اب ہوا یہ کہ وہ بے چارہ گیا اور جانے کے بعد وہاں بیٹھا اور ڈر تو اسپر شروع ہو گیا تھا وہم ہوتا ہے انسان کو ڈر شروع ہوا، اب اسنے وہاں پر کھیلی ٹھوکنا شروع کی اور اندھرا تھا، اب ہوا یہ کہ اسنے اپنے کرتہ کے دامن پر وہ کھیلی ٹھوک دی، اب ٹھوکتے ٹھوکتے اس پر ڈر شروع ہوا تو وہ اٹھ کے بھاگنے لگا، اب جو بھاگا تو اس نے تو اپنے کرتہ کے دامن میں وہ کھیلی ٹھوکی تھی تو کرتہ اس میں الجھ گیا، تو وہ سمجھا کہ مجھے جن نے پکڑ لیا اور وہیں خوف کے مارے اس کا انتقال ہو گیا، یہ بہت پرانی بات ہے، تو معلوم ہوا کہ وہم کا اثر ہوتا ہے۔

یقین کی بنیادیں مضبوط کئے بغیر پل صراط پار نہیں ہو سکے گا

اور دیکھئے ہم سب نے سنا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ ہم کو پل صراط پر سے گذرنا ہے، جب یہ ایک حقیقت ہے تو اللہ پاک ہم لوگوں کو ہمت دیں اور اسکی تیاری کی توفیق دے کہ پلصراط جو پندرہ سو سال کی مسافت ہے اور بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے (پل صراط اور اسکے مختلف مراحل ص ٦٨) جب یہاں وہم کی بنیاد پر ہم اتنے موٹے راستہ کو نہیں طے کر سکتے جب تک کہ یقین کی بنیادیں مضبوط نہ ہو، تو پلصراط بغیر یقین کی بنیادوں کے مضبوط کئے ہوئے طے ہو سکتا ہے؟ تو یقین کی دولت وہ دولت ہے کہ اس سے انسان سیدھے ڈگر اور سیدھے راستہ اور شاہراہ پر چل سکتا ہے ورنہ سارا نظام ہی چوپٹ ہو جائے گا، تو حق یہ ہے کہ اگر انسان نے محنت کر کر کے اپنے اندر وہ یقین بنایا جس کو حق تعالی یقین بولتے ہیں تب جا کے بیڑا پار ہوگا، مگر آج ہم لوگوں کا یقین کیا ہے بالکل پھوس پھوسہ یقین ہے۔

ہم لوگ عاشقِ احسانی ہے

حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: ہم لوگ عاشقِ احسانی ہے،

اللہ میاں کے احسان کے عاشق ہیں کہ وہ کھانے کو دے رہے ہیں، پینے کو دے رہے ہیں، پہننے کو دے رہے ہیں، چیزیں استعمال کو دے رہے ہیں، تو ہم کچھ کر لیتے ہیں ورنہ دو، چار، آٹھ ٹائم کھانا نہ ملے تبوک والے حالات کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تبوک تو بہت دور کی بات ہے تھوڑی دیر بھوک برداشت نہیں ہوتی، وہ تو تبوک تھا یہاں تو یہ ہے کہ ذیورا سی مشکل آ گئی تو لوگ شکوی شروع کر دیتے ہیں کہ اللہ میاں کو میں ہی ملا، اور بعض لوگ تو کہتے ہیں مجھ سے کونسا گناہ ہوا، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ سوال یہ ہے کہ کونسا گناہ آپ سے نہیں ہوا، آپ نے کیا کم گل کھلائے، کیونکہ جہل کی وجہ سے آدمی صرف دو چار گناہ کو گناہ سمجھتا ہے ورنہ آدمی سے غفلت کی وجہ سے گناہ ہوتے رہتے ہیں۔

قبر کے تین سوالات یقین ہی کی بنیاد پر حل ہوں گے

تو حق یہ ہے کہ اگر اندر وہ یقین بن گیا جس کو حق تعالیٰ یقین فرماتے ہیں تو وہ سو فیصد کامیاب ہے پھر اس پر موت بھی اثر انداز نہیں ہوگی وہ قبر میں جائے گا تو اندر کا بنا ہوا وہاں بھی سو فیصد ساتھ ہے اب وہ کور ہٹ گیا لیکن ملائکہ دیکھیں گے کہ او ہو یہ تو کچھ لے کر آیا ہے یہی وجہ ہے کہ قبر میں جو تین بنیادی سوالات ہونے ہیں وہ یقین ہی کی بنیاد پہ حل ہوں گے، خالی رٹ لینے سے حل نہیں ہوں گے۔

آپ ﷺ کی ایک تقریر جس سے صحابہ میں کہرام مچ گیا

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے عذابِ قبر کا ذکر فرمایا تو صحابہ میں کہرام مچ گیا وہ رونے لگے سب پر کیفیت تھی مگر حضرت عمرؓ خاموش بیٹھے تھے حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ فرمائیے قبر میں ہوش و حواس ٹھکانے ہوں گے کہ نہیں یعنی عقل ہوگی

کہ نہیں ،فرمایا ہوگی، کہا پھر فکر کی بات نہیں ہے ،اب آپ اندازہ لگائیے ان کا یقین کیسا ہوگا۔

الایمان بین الخوف والرجاء

حالانکہ ان پر خوف کی یہ کیفیت تھی امام غزالیؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ قیامت میں یہ اعلان ہوجائے کہ انبیاء کو چھوڑ کر سارے انسان جنت میں جائیں گے ایک ہی آدمی جھنم میں جائے گا،تو عمر کو یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ شاید میں ہی ہوں،اور امید بھی ایسی تگڑی تھی کہ فرماتے ہیں کہ اگر انبیاء کو چھوڑ کر یہ اعلان ہو کہ سب جھنم میں جائیں گے ایک ہی آدمی جنت میں جائے گا تو عمرؓ کو یہ امید ہوگی کہ وہ میں ہوں گا، (تبلیغ دین ص ۲۴۱) اسی لئے فرمایا کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے (حوالا بالا) امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خوف اور رجا دو پر ہیں جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہے اڑتا ہے (اصلاحی مجالس ج۶ ص۲۷۴) اور جب اڑتا ہے تو اس صورت کے اندر وہ کامیاب ہے، اور اگر پرندہ نہ اڑے تو درندے بلی کتے اسے نوچ ڈالیں گے ختم کر دیں گے تو خوف اور امید کے دو بازو پر اگر مومن روحانی پرواز نہ کرے تو نفس وشیطان یہ درندے ہیں اسے نوچ ڈالیں گے اور ختم کر ڈالیں گے،اسکی تو پرواز ہونی چاہئے اسے تو ٹیک آف کرنے کی ضرورت ہے،مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایئر جب ٹیک آف کرتا ہے تو زمین کی کشش سے اسے اوپر جانے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے،خدا جانے کتنے گیلن پیٹرول اعلی قسم کا صرف ہوجاتا ہے صرف اس میں کہ وہ رن وے پہ چلتا ہے اور ٹیک آف کے لئے کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ اتنی بڑی باڈی کو اتنا بڑا وزن اتنے بڑے لوڈ کو اور اتنے بڑے ثقل کو اس زمین سے اوپر کی طرف لے جانا کوئی معمولی بات ہے،اس سے معلوم ہوا کہ زمینی تقاضہ سے اوپر جانے کے لئے بہت زور کی ضرورت ہے،

قوّت کی ضرورت ہے، تو یہ ہمارا بدن جو ہے اس کے سارے تقاضے زمینی ہے کھانا زمین سے اگتا ہے، پانی کا نظام زمین سے ہے وہ اوپر سے آتا ہے پھر بھی بہر حال اس کا مادہ مادّی اعتبار سے زمین ہی سے ہے، ورنہ ویسے ادھر سے بھی ہے، تو ساری چیزیں زمین سے متعلق، تو بدن یہ چاہتا ہے کہ یہیں کا ہو رہے اور اندر اس کے جو روح ہے اگر اس میں فورس نہیں ہے طاقت نہیں ہے پاور نہیں ہے اور یقین نہیں ہے، ایمان کی روشنی نہیں ہے، علم کی روشنی نہیں ہے، ذکر کی روشنی نہیں ہے، دعوت کی روشنی نہیں ہے، تعلیم کی روشنی نہیں ہے، تعلق مع اللہ کی روشنی نہیں ہے، حقوق العباد کی ادائیگی کا نور نہیں ہے، یہ چیزیں اگر اس کے اندر نہیں ہے تو وہ اندر کی روح اور اندر کی آتما وہ جو ہے کمزور ہو جائے گی اب وہ جا نہیں سکتی یعنی لوڈ زیادہ ہے اور بدن اس کا ٹھپ، اسی لئے کافر کی جتنی روحیں ہیں اور منافقین کی جتنی روحیں ہیں اور مشرکین کی جتنی روحیں ہیں ان کے بدنی تقاضوں نے ان کی روح کا ناس مارا ہے لہٰذہ وہ یہیں گرے ہوئے پڑے ہیں آگے نہیں جا سکتے بلکہ اور ڈاؤن ہوتے جائے گی ان کی پوزیشن، اور کنڈیشن کہ وہ نیچے جھنم کی طرف، اور مومن وہ بے چارہ کمزور، خستہ حال، کڑکی کا شکار، پریشان، یہ مصیبت وہ مصیبت، اس کی ٹانگ دکھ رہی ہے، وہ بیمار، یہ حیران کچھ نہ کچھ لگا ہوا ہی ہے مومن کے ساتھ، مگر خدا تعالی سے تعلق ہے نمازیں وہ پڑھ رہا ہے، تلاوت وہ کر رہا ہے، ذکر وہ کر رہا ہے، علم وہ پڑھ رہا ہے، دعوت وہ دے رہا ہے، گشت وہ کر رہا ہے، ذہن وہ بنا رہا ہے، فکر وہ کر رہا ہے، تو یہ ساری جو اس کی کوششیں ہیں یہ اس کے باطن کو بنا رہی ہے، اندر ایمان بنتے جا رہا ہے، اندر یقین بنتے جا رہا ہے، اندر جو ہے اس محنت کے نتیجہ میں ایک خاص تعلق خدا تعالی سے پیدا ہوتے جا رہا ہے۔

اندر یقین بن گیا تب تو بیڑا پار ہے

تو بات اس پر تھی کہ اگر انسان کے اندر وہ علم بن گیا جس کو خدا تعالی علم قرار دیتے ہیں تب تو انسان کامیاب ہے، اور اگر اندر علم کی بجائے جہل بنا ہے تو وہاں جوابات نہیں آئیں گے اس کو، کیونکہ اس نے اس دنیا میں استعداد ہی پیدا نہیں کی، اور اگر اندر یقین بن گیا تب تو بیڑا پار ہے۔

ہندوستان کا مزاج مذہبی ہے

وہاں بھی جا کر وہ یہی کہے گا کہ مجھے سورج غروب ہوتے ہوئے معلوم ہو رہا ہے، کہے گا چھوڑو مجھے میں نماز پڑھ لوں، وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ اس کا ذہن بنا ہوا ہے اسی لئے یہ جماعت والے بے چارے ان کو ہوائی جہاز میں دیکھو تو نماز کے چکر میں، ائیر پورٹ پہ دیکھو تو نماز کے چکر میں، اسٹیشنوں پہ دیکھو تو نماز کی فضائیں، اور حق یہ ہے کہ جو خدا تعالی کے حکم کو ماننے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے وہ ہر جگہ اس کو بجا لا سکتا ہے اور ادا کر سکتا ہے، اللہ تعالی کی طرف سے نصرت ہوتی ہے، ہم نے ہندوستان میں دیکھا اس کو بیان کرنے سے پہلے ایک بات یاد آئی شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کا مزاج مذہبی ہے اور مذہب ہی کی بنیاد پر فسادات ہوتے ہیں، مگر آپ بھری ٹرین میں نماز پڑھنا چاہو اور کہو کہ بھائی ذرا نماز پڑھنے کے لئے جگہ دیدو، تو وہ کہے گا ضرور آپ پڑھ لے، تو طاعتوں میں ایک کشش ہے، کتنے لوگ ان اعمال ہی کو دیکھ کر جو ہے متاثر ہوتے ہیں اور ایمان قبول کر لیتے ہیں، اعمال کو دیکھ کر ایمان قبول کر لیتے ہیں۔

لال کیڑی ہندو ہوتی ہے اور کالی کیڑی مسلمان ہوتی ہے

میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ وہ جو بات چل رہی تھی کہ کتے جیسے جانور کا شکار

حلال یہ شرعی علم کی برکت ہے کہ اس کو تعلیم دی گئی تو اس کے شکار کو حلال قرار دیا گیا، ایک چیونٹی جو ہے اسکی طرف قرآنِ کریم کی پوری سورت کو منسوب کر کے اس کا نام ''سورۂ نمل،، رکھا ہے، اور نمل کہتے ہے چیونٹی کو چھوٹی کیڑی جو ہوتی ہے وہ لال بھی ہوتی ہے اور کالی بھی ہوتی ہے، وہاں ہندوستان میں مشہور ہے کہ لال کیڑی ہندو ہوتی ہے اور کالی کیڑی مسلمان ہوتی ہے، لال جو ہے وہ کاٹتی ہے تو کہتے ہے کہ لال تو ہندو ہے، اور کالی مسلمان ہے کیوں کہ وہ ظالم نہیں ہے اور مسلمان کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ ظالم نہیں ہے وہ تو دوسروں کے لئے خیر خواہ ہے۔

اندر جو کچھ بنے گا سو فیصد اس پر دار و مدار ہے

تو کہنے کا منشاء یہ ہے کہ علم و معرفت اور اللہ تعالی سے تعلق بڑی چیز ہے، تو اندر جو کچھ بنے گا سو فیصد اس پر مدار اور دار و مدار ہے، اور اگر اندر جو ہے معاملہ گڑ بڑ ہے، دیکھو ایک موٹی سی مثال دوں خاص طور سے سب جوان ہی جمع ہوئے ہیں ان کو اس میں خاص طور سے زیادہ مزہ آئے گا اور ایسی مثال ہے کہ شاید یاد بھی رہے ان کو ایک آدمی نے شادی کی اور اس میں لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کئے بہت شور کیا اور دعوت کے کارڈ شائع کئے اور بڑی جاندار شادی کی خرچہ بھی بہت کیا اور بینڈ باجہ اور دوسری ایسی فضول چیزوں کو بھی استعمال کیا، اب شادی کے بعد جب تنہائی ہوئی اور حضرت کو اندر بھیجا بیوی اور وائف کے پاس اس لئے کہ نو لائف وِدھاوٗٹ وائف تو اس کو اندر بھیجا اندر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ تو فرصت علی خاں ہے، چھٹی ہے بالکل (نامرد ہے) کچھ سمجھ میں آتا ہے آپ لوگوں کے مسجد میں اور کیا سمجھائیں آپ لوگوں کو ہڑتال تھی بالکل ٹائر بھسٹ تھے بالکل اور وہیل میں ہوا ہی نہیں تھی ان کے، تو اب گاڑی چلتی کیسے، اب میں آپ

سے پوچھتا ہوں کہ باہر کے یہ کروڑوں روپیہ جواس نے خرچ کئے اس کا کیا حاصل، کیونکہ جو بنیاد ہے وہ تو چوپٹ ہے، اسی لئے حضرت جی مولانا یوسف صاحبؒ فرماتے تھے کہ: ایک آدمی چند روپیہ صرف کر کے شادی کرتا ہے اور ایک لاکھوں روپیہ صرف کر کے شادی کرتا ہے، مگر تنہائی میں دونوں کی بنیادیں ایک ہے، تنہائی کا معاملہ اور اندر کی بنیاد ایک ہے، آپ دیکھ لیجئے ایک آدمی دستر خوان پر کھانے بیٹھتا ہے خدا جانے کیا کیا اگڑم بگڑم اس کے سامنے ہے بریانی اور شولا اور دوسرے شاندار کھانے مگر ذائقہ زبان کی نوک سے حلق تک ہے، اور ایک آدمی بھاجی کھاتا ہے، دال کھاتا ہے، سبزی کھاتا ہے، معمولی کھانا کھاتا ہے تو دونوں کے لئے ذائقہ کے اعتبار سے بنیاد ایک ہے کہ زبان سے لیکر حلق تک وہاں مزہ، وہاں کمی، یہاں تو گویا فرق ہے مگر حلق سے نیچے اترنے کے بعد حضرتِ بھاجی اور حضرتِ گوشت دونوں برابر بلکہ گوشت زیادہ پیٹ فاسد کریگا زیادہ چوپٹ ہوگا معاملہ، اسی لئے کھاؤ کھلاؤ قوموں میں بیماریاں زیادہ ہوتی ہے، تو غرض یہ کہ حضرت جی مولانا یوسف صاحبؒ فرماتے تھے کہ: انسان کے باہر کی بنیادوں میں اختلاف ہے مگر اندر کی بنیاد ایک ہے، اب آپ دیکھ لیجئے کہ اندر جو ہے وہ ایک ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ غذا کا اور ذائقہ کا کچھ فرق ہو جائے، یوں قوّت وضعف کا فرق غذا کے اعتبار سے ہوتا ہے وہ الگ چیز ہے، وہاں اس نے لاکھوں روپیہ خرچ کئے اور وہاں اس نے چند روپیہ خرچ کئے مگر بنیاد دونوں کی ایک ہے، تو اتنا زیادہ روپیہ شادی میں خرچ کرنے بعد اگر وہ فرصت علی خاں ہے تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس کو شادی میں کیا خوشی ہوگی، وہ تو ایسا ہوا کہ ایک جگہ ایک نواب کے لڑکے کی شادی ہوئی تو مجمع جمع ہوا رات رخصتی ہونے والی تھی اب وہ پریشان اس نے اپنی جوانی خراب کی تھی، غلط صحبتوں میں رہا تھا اور اپنی قوت کھودی تھی، تو کوئی ڈاکٹر صاحب تھے انہوں نے اس کو

ایک حیلہ بتایا کہ دیکھو ایسا کرو دوپہر میں کھانا کھاتے کھاتے ایک دم زور سے پیٹ پکڑ لینا اور تڑپنا شروع کرنا وہ بے چارے نے پیٹ پکڑا اور تڑپنا شروع کیا لوگوں نے کہا کیا ہوا دیکھو دیکھو، دیکھنا شروع کیا اور کہا کہ لے جاؤ ڈاکٹر کے پاس اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہے، ڈاکٹر نے کہا کہ اس کی پوزیشن بہت خراب ہے دو مہینے تک شادی ملتوی کرو اس کی تو وہ پیٹ کیا دُکھتا تھا وہ کچھ اور درد تھا لیکن دو مہینے تک علاج کرایا گیا، تو معلوم ہوا کہ اندر کی بنیادیں ایک ہے۔ اسی لئے اگر انسان نے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے ساتھ یقین پیدا کرلیا تو سعدی مرحوم فرماتے ہیں کہ:

تو ہنگامِ رفتن کند جانِ پاک
کہ بر تختِ مردن چہ بر روئے خاک

پھر آپ تخت پر مرے تختِ شاہی پر یا خاک پر مرے انجام ایک ہی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا اس سے، پھر بڑے بڑے محلات میں رہیں کہ جھونپڑیوں میں رہیں کچھ فرق نہیں پڑتا، آدمی بہت زیادہ اپ ٹو ڈیٹ بن کر رہے کہ سادہ لباس میں رہے کوئی فرق نہیں پڑتا، اصل یہ ہے کہ اندر کا مسئلہ ٹھیک ہونا چاہئے۔

چلت پھرت کا مقصد

تو یہ جو چلت پھرت اور محنت ہے اور جس کے لئے بے چارے یہ جوان بچے رمضان کے مہینے میں نکلے ہیں یہ اسی لئے کہ اندر علم کا نور آجائے، معرفت کا نور آجائے، ذکر کا نور آجائے، نمازیں جاندار بن جائے، خدا تعالیٰ کا دھیان بن جائے، دین کی فکر ہو جائے، حقوق کا ادا کرنے والا ہو جائے، اللہ تعالیٰ سے اپنا جوڑ اور رابطہ صحیح ہو جائے اللہ تعالیٰ کی رضا اور انبیاءِ کرام علیہم السلام کی زندگی جو تھی اس کے آثار زندگی میں آجائے یہ

سب کچھ منشاء ہے۔

باہر تو باہر ہی ہے

تو بنیادی چیز یہ ہے کہ جو چیز اندر بنی ہے سو فیصد وہ انسان کے ساتھ ہے، اور باہر تو باہر ہی ہے، یہ آج ہے کل نہیں ہے، بڑے بڑے سلاطین دوسرے دن کنگال ہو جاتے ہیں قلّاش ہو جاتے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس نے اپنا اندر بنالیا اس کا مسئلہ آسان ہے۔

جو اپنے باطن کو بنائے گا وہ دوسروں کو سلب کر سکتا ہے

دیکھو ایک واقعہ سناتا ہوں، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ چینیوں نے کہا کہ تعمیرات میں نقش و نگار کے ہم ماہر ہیں اور رومیوں نے کہا کہ ہم زیادہ شان و شوکت والا نقش بناتے ہیں سلطان وقت نے کہا اچھا ہم تم دونوں کا امتحان کرتے ہیں۔ اہلِ چین نے بادشاہ سے کہا کہ ہم کو ایک گھر نقش و نگار بنانے کے لئے دیدیا جاوے اور اس کو پردوں سے مخفی کر دیا جائے تا کہ اہل روم ہماری نقل نہ کر سکیں ان شرائط پر انہوں نے پردے کے اندر نقاشی کا بہترین کام دکھایا۔ اہل روم نے کہا کہ ہم ٹھیک اسی منقش گھر کے سامنے جو اہل چین بنا رہے ہیں دوسرا گھر نقش و نگار والا تیار کرتے ہیں تا کہ آپ اس تقابل سے فیصلہ کر سکیں کہ کون بہتر ہے، اہل روم نے بھی پردہ کے اندر مخفی کام شروع کیا مگر انہوں نے کوئی نقش نہ بنایا بس خوب صیقل اور صفائی کرتے رہے یہاں تک کہ پورا گھر مثل آئینہ چمکنے لگا بوقت امتحان اور مقابلہ جب درمیان سے پردہ ہٹایا گیا تو اہل چین کے تمام نقش و نگار کا عکس رومیوں کے بنائے ہوئے گھر پر اس طرح پڑا کہ وہ زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ بادشاہ آیا اور اس نے ان نقوش کو دیکھا جو اہل چین نے

بنائے تھے ایسے خوبصورت نقوش تھے جو عقل وفہم کو اڑا رہے تھے۔ شاہ نے وہاں جو دیکھا تھا یہاں اس سے بہتر نظر آیا حتی کہ کمال حسن نقاشی کی کشش سے حلقۂ چشم سے نکلی پڑتی تھیں (معارفِ مثنوی ص ۲۱۸، ۲۱۹) تو بادشاہ نے رومیوں کو انعام دیا جنہوں نے دیوار چمکائی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایسا کمال تھا کہ اپنا کمال تو بتایا دوسروں کا کمال بھی انہوں نے کھینچ لیا، سلب کرلیا، اُن کا اِدھر چلا آیا اِن کا اُدھر نہیں گیا ہے، تو معلوم ہوا کہ جو اپنے باطن کو بنائے گا وہ دوسروں کو سلب کرسکتا ہے اور اس کے پاس سے کچھ نہیں جائے گا، اور اگر اندر اس کے کچھ بھی نہیں بنا ہے کھوکھلا ہے اندر بالکل تو اوپر کے ڈیکوریشن سے ہوتا کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔

میں بھی آپ کی طرح جاہل ہوں

جیسے ایک صاحب تھے اپ ٹو ڈیٹ بہت ٹھاٹھ باٹھ میں پہنچے اور چشمہ نہیں تھا ان کے پاس تو کہیں بورڈ لگا تھا وہ بھی کھڑے ہوگئے اس کے پاس اور دیکھنے لگے جیسے اور لوگ دیکھ رہے تھے، تو لوگوں کے دیکھنے کی طرح دیکھنے لگے اور چشمہ ساتھ نہیں تھا، تو انہوں نے ایک بڑے میاں سے پوچھا کہ یہ کیا لکھا ہے ذرا پڑھ کے بتاؤ، انہوں نے کہا بھائی میں بھی آپ کی طرح جاہل ہوں، کچھ سنا آپ نے، بہت ٹھاٹھ میں گئے تھے، بہت زیادہ میک اپ کر کے گئے تھے معلوم ہوتا ہے جیسے حور اتر کر آئی ہو جنت سے اس طرح، اور وہاں جا کر کھڑے ہوئے اور ایک صاحب سے پوچھا یہ کیا لکھا ہے ذرا پڑھ کے بتاؤ مجھے، تو وہ بڑے میاں کہتے ہیں کہ میں بھی آپ کی طرح جاہل ہوں، حالانکہ وہ پڑھا لکھا تھا لیکن آ بنی اسکی۔

یہ ہمیشہ کا آزمایا ہوا نسخہ ہے

میرے کہنے کا منشاء یہ ہے کہ باہر کے نقشوں میں کچھ نہیں ہے اصل یہی ہے، تو

یہ جو چلت پھرت ہے یہ سب اس لئے ہے کہ انسان کے اندر کچھ بن جائے، تواضع آجائے، عبدیت آجائے، علم آجائے، یقین آجائے، اللہ تعالی کی معرفت محبت آجائے، اندر وہ حقائق پیدا ہو جائیں جس سے اللہ میاں انسان کی زندگی کو ہر نقشہ میں سو فیصد کامیاب فرماتے ہیں، اور یاد رکھئے آج تک کسی نے خدا تعالی سے تعلق پیدا کر کے ناکامی حاصل نہیں کی، اور یہ ہمیشہ کا آزمایا ہوا نسخہ ہے، اور دوسری ساری لائنوں میں خطرات ہیں، کامیاب ہو گئے ہو گئے، نہیں ہوئے کچھ نہیں، مگر یہ سو فیصد کامیاب راستہ ہے "ومن اراد الاخرۃ"، جس نے آخرت کا ارادہ کیا، ارادہ ثابت "وسعی لھا سعیھا"، اور اسکے لئے محنت کی قربانی کی، تو سعی و محنت ثابت "وھو مومن"، اور محنت بھی ایمان و یقین والی "فاولئک کان سعیھم مشکورا"، (بنی اسرائیل، ۱۹) ان کی کوششیں سو فیصد کامیاب ہیں بالکل کامیابی ہے ان کے لئے، اس لئے یہ بچے نکلے ہیں بہت خوشی کی بات ہے میں ان کو مبارکبادی دیتا ہوں، اللہ تعالی ان کے جذبہ کو قبول فرما کر پکا سچا دیندار بنادیں اور دین کا سچا خادم اور مخلص داعی بنائیں تا کہ دوسروں کی زندگی بھی ان کی وجہ سے بننا شروع ہو اور دوسرے بھی جو ہیں اس کام کی طرف آئیں۔

مؤلف کی دیگر اہم تالیفات

(۱) منتخب تقاریر، جلداول ۔ مطبوعہ

(۲) مجالسِ خطیب الامت، جلداول ۔ مطبوعہ

(۳) مجالسِ خطیب الامت، جلددوم ۔ مطبوعہ

(۴) لطائفِ سورۂ یوسف ۔ جلددوم (غیر مطبوعہ)

(۵) ملفوظاتِ خطیب الامت ۔ دوجلدیں (غیر مطبوعہ)

(۶) منتخب تقاریر، جلددوم ۔ (غیر مطبوعہ)

(۷) فیضانِ عبدالرؤف، جلددوم ۔ (غیر مطبوعہ)

(۸) حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات ۔ (غیر مطبوعہ)

(۹) قیمتی باتیں ۔ دوجلدیں (غیر مطبوعہ)

(۱۰) بچوں کے لئے مسائل واحکام ۔ (غیر مطبوعہ)

(۱۱) ندائے قرآن ازعبادِ رحمٰن ۔ دوجلدیں

لطائفِ سورۂ یوسف

جلد اول

افادات

خطیب الامت حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی نور اللہ مرقدہٗ
شیخ الحدیث مدرسہ فلاح دارین ترکیسر سورت گجرات

مرتّب

مولانا عبد السلام ابراہیم مارویا، لاجپوری (لندن)

ناشر

مکتبہ سلیمانیہ، اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت

کتاب کا نام	:	لطائفِ سورۂ یوسف، جلد اول
مرتب کا نام	:	مولانا عبد السلام ابراہیم مارویا، لاجپوری (حال، مقیم،لندن)
افادات	:	حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھلیوی نور اللہ مرقدہٗ
ناشر	:	مکتبہ سلیمانیہ، اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت
مطبع	:	سُپر تاج، سورت
ایڈیشن	:	پہلا ایڈیشن
سن طباعت	:	۱۴۳۳ھ مطابق ۲۰۱۲ء
صفحات	:	۲۸۲
تعداد	:	۵۵۰

(۱) مکتبہ سلیمانیہ، اجمیری محلّہ، لاجپور، سورت۔

(۲) مدرسہ اسلامیہ صوفی باغ، سورت۔

A.SALAM MARVIA
23 FLAT B SPRING FIELD GARDENS
LONDON E5 9ER.

PH: 02088061051